یا اللہ جل جلالہٗ

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۴۳)
اے لوگو علم والوں سے پوچھو اگر تم علم نہیں رکھتے

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سینکڑوں مسائلِ شرعیہ کے حل کا بیش بہا خزانہ

العطایا السیفیة فی الفتاوی النقشبندیة

المجلد السابع

تصنیف
فخر المتاخرین العالم العارف باللّٰہ
مفسر کلام اللّٰہ تعالیٰ و خادم حدیث رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
الشیخ السید احمد علی شاہ
الحنفی الترمذی الماتریدی السیفی
النقشبندی الجشتی القادری السهروردی

ناشر
جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ
فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن نمبر ۱۰ کراچی غربی

نام کتاب: العطایا السیفیۃ فی الفتاوی النقشبندیۃ، المجلد السابع

تصنیف و تالیف: پیر طریقت رہبر شریعت آفتاب ہدایت حضرت علامہ سید احمد علی شاہ سیفی نقشبندی دامت برکاتہم القدسیہ

تعلیق و ترتیب: پیر طریقت رہبر شریعت حضرت علامہ صاحبزادہ سید عبد الحق شاہ ترمذی سیفی نقشبندی دامت برکاتہم القدسیہ

طباعت اول: مارچ ۲۰۲۴ء بمطابق رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ

طباعت ثانی:

کمپوزر: صوفی سید فرحان الحسن سیفی

ناشر: جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی، فقیر کالونی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

(۱) باب نمبر ایک: اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ

گزشتہ باب میں ہم نے تصوف کے عملی دستور کو بیان کیا ہے جس کو صوفیائے کرام نے قرآن وسنت سے اخذ کیا ہے۔ اس میں ہم نے صحبت، علم، ذکر اور خلوت وغیرہ کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہ تمام اعمال اپنے ظاہر کے اعتبار سے بدنی اور روح اور جوہر کے اعتبار سے قلبی ہیں اس لئے اب ضروری تھا کہ ہم راستہ کو بیان کریں جس کا تعلق دل کے احوال اور نفس کی صفات سے ہے یعنی وہ راستہ جس کا تعلق روحانی پہلو سے ہے، کیونکہ تصوف کا اصل مقصد دل کی اصلاح اور اس کی بیماریوں کا علاج اور پھر اس کو صفاتِ کمال سے آراستہ کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچے کے راستہ سے مراد وہ مقامات ہیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے جیسے توبہ، محاسبہ، خوف ورجا اور مراقبہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس میں صدق، اخلاص اور صبر جیسی اخلاقی صفات کو بھی بیان کیا جائے گا۔ ان سے آراستہ ہو کر سالک معرفتِ الٰہی کی شاہراہ پر گامزن ہو کر اس مقامِ احسان تک پہنچ جاتا ہے جس کے مراتب کی کوئی انتہاء نہیں۔

یہاں وصال سے عام معنی ومفہوم مراد نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ زمان ومکان کی حدود سے منزہ وبرتر ہے۔

اس لئے ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

وصولک الی اللہ وصولک الی العلم بہ والا فحل ربنا ان یتصل بہ شیٔ او یتصل ھو بشیٔ۔

اللہ تک پہنچنے میں تیرا مقصد یہ ہے کہ تجھے اس کی معرفت تک رسائی حاصل ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بزرگ وبرتر ہے کہ کوئی چیز اس کے ساتھ متصل ہو یا وہ خود کسی چیز کے ساتھ متصل ہو۔[1]

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں وصال کا معنی یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنے دل کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ کرے۔ اور آخرت میں اپنے سر کی آنکھوں سے۔ اور وصال سے مراد ایک ذات کا دوسری ذات سے متصل ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس چیز سے بلند وبرتر ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ کے وصال کی شاہراہ پر گامزن ہونا مؤمنین اور صالحین کی صفت ہے۔ اسی لئے انبیاء ورسل مبعوث ہوئے۔ علماء ومشائخ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ اور ان سب کا مقصد صرف یہی ہے کہ انسان مادہ پرستی اور حیوانیت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر انسانیت اور ملکیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر قربِ الٰہی کی لذت سے آشنا ہو سکے۔

---

[1] (ایقاظ الھمم ج۲ ص ۲۹۵)

[2] (روض الطالبین للغزالی ص ۱۵۰)

تصوف میں بظاہر کثیر سلاسل ہیں لیکن حقیقت میں ان سب کی منزل مراد ایک ہی ہے۔ اگرچہ وقت اور مکان کے تبدیل ہونے اور اپنے اجتہاد کی وجہ سے انہوں نے اس منزل تک پہنچنے کیلئے مختلف راستے اختیار کئے ہیں۔

اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے ابن قیم فرماتے ہیں کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱): اعلیٰ درجہ کے لوگ　　　　(۲): گھٹیا درجہ کے لوگ

اعلیٰ درجہ کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے رب تک پہنچنے کے راستہ کو پہچان لیا۔ پھر اس تک پہنچنے کیلئے اس پر رواں دواں ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت معزز ہیں۔ اور گھٹیا درجہ کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب تک پہنچنے کے راستہ کو نہ پہچانا اور نہ ہی اس کیلئے کوشش کی۔ یہی وہ فرومایہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ" (الحج:۱۸)

"اور جس کو ذلیل کر دے اللہ تعالیٰ تو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے"۔

آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کا درحقیقت ایک ہی راستہ ہے۔ لیکن بعض علماء کا یہ فرمانا کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل واحسان سے طبائع اور استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ طریقے بنا دیئے ہیں۔ اور یہ ہمارے اس قول کے منافی نہیں ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ راستہ ایک ہی ہے اور وہ راستہ ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو رضائے الٰہی کا باعث ہو۔ اور وہ اشیاء جو رضائے الٰہی کی باعث ہیں وہ مختلف اور متعدد ہیں۔ تو گویا منزل تو ایک ہی ہے کہ اس کی رضا حاصل ہو جائے لیکن اس کی رضا کے حصول کے تبدیل ہونے سے بدلتے رہتے ہیں اور یہ تمام طریقے اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور حکمت کی وجہ سے ان کو مختلف انواع میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی طبیعت کے مطابق ان پر عمل پیرا ہو سکے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان تمام کو ایک ہی نوع بنا دیتا تو اس پر بہت کم لوگ چل سکتے کیونکہ لوگوں کے ذہن، عقل اور قوتِ استعداد مختلف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان راستوں کو مختلف انواع میں تقسیم کر دیا تاکہ ہر شخص اپنی طبعیت اور استعداد کے مطابق اس پر چل کر اپنی منزل تک پہنچ سکے۔ اسی سے ہم انبیاء سابقین کی شریعتوں کے اختلاف کو سمجھ سکتے ہیں حالانکہ سب کا دین اور معبود ایک ہی ہے۔[1]

صوفیائے کرام نے تصوف کی منازل مقامات اور راہِ سلوک کو طے کرنے کے طریقوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرما دیا۔ حضرت ابو بکر کتانی اور حضرت ابو الحسن رملی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کی کہ ہمیں وصول الی اللہ کی پہلی منزل کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: راہِ سلوک کی پہلی منزل توبہ ہے،

---

[1] (طریق الھجرتین لابن قیم الجوزیۃ ص ۲۲۳-۲۲۵)

پھر آپ نے اس کی شرائط بیان فرمائیں۔ پھر فرمایا کہ مقامِ توبہ سے سالک مقامِ خوف کی طرف منتقل ہوتا ہے اور پھر مقامِ خوف سے رجاء کی طرف اور رجاء سے صالحین کے مقام کی طرف اور مقامِ صالحین سے مقام مریدین کی طرف اور مقامِ مریدین سے مقامِ مطیعین کی طرف اور یہاں سے مقامِ مشتاقین مقامِ اولیاء کو طے کرتا ہوا مقامِ مقربین تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر صوفیاء نے ہر مقام کو طے کرنے کیلئے دس شرائط ذکر کی ہیں جب سالک سختی سے ان شرائط پر کاربند ہو جاتا ہے اور اس کا دل اس وادی سے مانوس ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے اکرام واحسان میں غور وفکر کرتا ہے اور وہ ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کی روح ملکوت کی سیر کرتے ہوئے بحر معرفت میں غوطہ زن ہو کر حریم قدس تک رسائی کر لیتی ہے۔

سالکین جب اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو انہیں اس قدر قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے کہ انہیں دوری کا تصور تک نہیں رہتا اور وہ ایسے بلند مقامات پر فائز ہوتے ہیں کہ انہیں پستی کا خوف نہیں ہوتا۔ پھر ان کی باطنی نگاہ روشن کر دی جاتی ہے تاکہ وہ زمین پر بیٹھ کر جنت کا نظارہ اور سیر کریں۔ اس مقام پر پہنچ کر اپنے معبود کی محبت میں گم ہو جاتے ہیں اور کسی غیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ وہ اس مقامِ قرب کو چھوڑ کر کہاں جائیں جس میں وہ امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سب ان کے مولا کا احسان اور ان کے نیک اعمال کی جزا ہے پس عاملین کو اسی طریقہ پر گامزن ہونا چاہیئے۔[1]

منازلِ سلوک طے کرنے کیلئے ضروری ہے کہ سالک مجاہدۂ نفس کرے اور ذکر پر دوام کے ساتھ ساتھ مراقبہ، محاسبہ اور عزلت نشینی اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا وصال محض خواہشات اور آرزوؤں سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کیلئے ایمان، تقویٰ، پختہ ارادہ اور انتہائی خلوص کی ضرورت ہے۔ جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ سالک کو اپنی معرفت کاملہ اور حقیقی سعادت سے نوازتا ہے۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ راہِ سلوک کی منازل طے کرنے کیلئے ایمان اور تقویٰ بنیادی عناصر ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“ (طلاق: ۳-۲)

”اور جو ڈرتا رہتا ہے اللہ سے بنا دیتا ہے اللہ اس کیلئے نجات کا راستہ اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔“

[1] (حلیۃالأولیاء، ج۱۰ ص ۲۴۹-۲۴۸)

آپ فرماتے ہیں کہ رزق کی دو قسمیں ہیں:

(۱):روحانی (۲):جسمانی

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

و اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ (بقرہ: ۲۸۲)

"اور ڈرا کرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ"۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و احسان سے تمہیں وہ علوم عطا فرمائے گا جن کو تم دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں کر سکتے۔[1]

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے کلام سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قربِ الٰہی کے حصول کیلئے ایمانِ کامل اور صحیح عقیدہ شرطِ اول ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی حدود، شرعی احکام کی پابندی اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

اور جو شخص گھٹیا خواہشات اور نفسانی رعونات سے اپنے دامن کو نہیں بچاتا اس کا منزل تک پہنچنا بہت مشکل ہے بلکہ ایسا شخص تو دورانِ سفر ہی قافلہ سے بچھڑ کر گمراہ اور بدبخت ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ظاہری اور باطنی انعامات و اکرامات سے پردہ ہٹا دیا جائے تو بندہ کا دل اس کی محبت سے پگھل جائے۔ قلوب کو ان کے مشاہدہ سے محجوب کر دیا گیا ہے تاکہ عالمِ اسباب کی طرف مائل رہیں۔ اور یہ حکیم و دانا اللہ تعالیٰ کی ذات کا فیصلہ ہے کیونکہ جو دل اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی حلاوت چکھ لیتا ہے پھر اس کا کسی غیر کی طرف مائل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جس نے معرفتِ الٰہی کا ذائقہ چکھ کر اور منازلِ سلوک کو جان کر پھر اسے ترک کر دیا اور اپنے نفس کی خواہشات اور لذات میں مشغول ہو گیا تو یقیناً وہ ہلاکتوں کی راہ پر چل نکلا اور اس کے دل کو ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا کر کے اس کو ایسا عذاب دیا جائے گا کہ کائنات میں کسی کو ایسا عذاب نہیں دیا گیا۔

پھر غم و حزن اس کی زندگی کا جز بن جاتا ہے اور اس کی موت حسرت اور اس کی آخرت افسوس اور ندامت سے عبارت ہوتی ہے۔ حجاب کی آگ اس کے دل کو جلا دیتی ہے۔ جب وہ اپنے رب سے منہ موڑتا ہے تو ساری کائنات اس سے روٹھ جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ وہ زمین پر چلتے ہوئے مردہ کی مثل ہوتا ہے۔ اس کی روح جسم میں خوف اور وحشت محسوس کرتی ہے۔ اور دل زندگی سے تنگ آ جاتا ہے۔

[1] (النصرۃ النبویۃ للشیخ مصطفی المدنی ص ۸۴ بتصرف)

فاصبح کالبازی کالمنتف ریشه | یری حسرات کلما طار طائر
وقد کان دهرا فی الریاض منعما | علی کل مایهوی من الصید قادر
الی ان اصابته من الدهر نکبة | اذا هو مقصوص الجناحین حاسر

وہ اس باز کی طرح ہو جاتا ہے جس کے پر اکھڑ گئے ہوں جب بھی کوئی پرندہ اڑتا ہے وہ بڑی حسرت سے اسے دیکھتا ہے، وہ بھی کسی زمانہ میں باغوں میں خوش و خرم تھا اور اپنے پسندیدہ شکار پر قادر تھا، حتیٰ کہ زمانہ نے اسے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا اب اس کے پر ٹوٹے ہوئے ہیں اور سراپا حسرت بن چکا ہے۔[1]

منازلِ سلوک کے دوران انقطاع بہت بڑی آزمائش اور عظیم خسارہ ہے اور اس کا سبب سالک کا اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی، مقامات اور مکاشفات کی خواہش اور اپنے مقصودِ حقیقی سے اعراض ہے کیونکہ مخلص سالک مقامات، مراتب اور کرامات کا طالب نہیں ہوتا۔ یہ تو محض منازل ہیں جن کو طے کرتے ہوئے اپنے مقصودِ حقیقی کو پالیتا ہے اور اپنے اس سفر میں دائیں بائیں ملتفت نہیں ہوتا۔

ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے:

ما ارادت همة سالک ان تقف عندما کشفت لها الا و نادته هو اتف الحقیقة الذی تطلب

امام کسالک کی ہمت جب بھی مکاشفات پر اکتفا کرنا چاہتی ہے تو اسے ہاتف غیبی سے ندا آتی ہے کہ جس کا تو طالب ہے وہ آگے ہے۔[2]

جس طرح عام راستہ میں خطرات، رکاوٹیں اور ڈاکو ہوتے ہیں اسی طرح روحانی اور قلبی راستہ میں بھی نشیب و فراز اور رکاوٹیں ہوتی ہیں جن سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے۔ اس لئے اس راستہ میں راہنما اور مرشد کی ضرورت ہے جو سالک کا ہاتھ پکڑ کر اسے خطرات اور ہلاکتوں سے بچائے۔ کیونکہ یہ راہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ اس لئے شیوخ اور مرشدین سالکین کو اس کی پیچیدگیوں سے متنبہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سفر کو مسلسل جاری رکھنے اور پے در پے کوشش اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی منزل مراد قربِ الٰہی کی سعادتوں سے بہرور ہو سکیں۔

ابن قیم فرماتے ہیں کہ راہِ حق کا مسافر جب راہِ سلوک اور منازل کو دیکھتا ہے اور اس میں پیش آنیوالے نشیب و فراز اور دشوار گزار راستہ کو دیکھتا ہے تو نصف کامیابی اور سعادت کو پالیتا ہے۔ اور بقیہ نصف کیلئے ضروری ہے کہ مکمل تیاری کر کے سفر کا آغاز کر دے اور یکے بعد دیگرے تمام منازل کو طے کرتا جائے۔ اور جب بھی کسی ایک منزل کو طے کر چکے تو دوسری منزل کیلئے

---

1 (طریق الھجرتین ابن القیم ص ۲۲۷-۲۳۰)

2 (ایقاظ الھمم فی شرح الحکم ج ۱ ص ۵۱)

ہمہ تن تیار ہو جائے۔ اور اپنی منزل کو قریب ہی محسوس کرے۔ اس طرح سفر کی مشقت اس پر آسان ہو جائے گی۔ اور جب بھی اس کا نفس سفر کی صعوبتوں سے اکتائے تو قربِ وصال سے اسے دلاسا دے۔ اس طرح اس میں از سرِ نو نشاط فرحت اور منزل مقصود تک پہنچنے کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔ اور اسے کہے اے نفس! تجھے خوشخبری ہو کہ منزل قریب آگئی۔ اب جلد ہی محبوب سے ملاقات ہو گی اور منزل مراد کو پانے سے پہلے ہی راہ میں بھٹک نہ جانا کہ یہ چیزیں تیرے اور تیرے محبوب کے درمیان حائل نہ ہو جائیں۔ اگر تو نے صبر کیا اور اس سفر کو جاری رکھا تو عنقریب ہی اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔ اور پھر تجھے محبوب مختلف قسم کے تحفے تحائف اور انعام واکرام سے نوازیں گے۔ تیرے اور تیری منزل کے درمیان ایک گھڑی صبر کا فاصلہ ہے کیونکہ یہ ساری دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایک گھڑی کی مثل ہے۔ اللہ کو یاد کر، اس صحرا میں کہیں گم نہ ہو جانا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اگر نفس پھر بھی بات نہ مانے تو اسے آگاہ کرو کہ سامنے محبوب انعام واکرام کے ساتھ انتظار میں ہے اور پیچھے دشمن کثیر مصائب وآلام لئے کھڑا ہے۔ اگر تو واپس لوٹا تو دشمنوں سے تیرا پالا پڑے گا۔ اور اگر آگے بڑھا تو محبوب سے ملاقات ہو گی۔ اور اگر راستہ میں ٹھہر گیا تو دشمن تجھے پکڑ لیں گے کیونکہ وہ تیری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان تین صورتوں کے علاوہ کوئی چوتھی صورت نہیں۔ اب جو دل چاہے ان میں سے اختیار کرلے۔ محبوب کی یاد کو دل میں بسالے اور اس کے ارشادات اور نور عرفان کو اپنا ہادی ورہبر بنالے اور اس کی محبت اور سچی لگن کو اپنی غذا اور دوا بنالے اور راستہ کی تنہائی سے نہ گھبرائے۔ اور دورانِ سفر پیچھے رہ جانے والوں کی کثرت سے دھوکہ نہ کھائے کیونکہ اگر وہ اپنی منزل مقصود کو نہ پاسکا تو اس میں اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ اور اگر منزل کو پالیا تو قرب ووصال کی سعادتوں سے وہی بہرہ ور ہو گا۔ اس لئے اسے دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے۔ پھر یہ گھبراہٹ اور تنہائی بھی عارضی ہوتی ہے کیونکہ جو اپنے سفر کو مسلسل جاری رکھتا ہے اسے جلد ہی اپنے محبوب کے خیموں کے نشانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ پھر محبوب سلامتی سے پہنچنے کی مبارکباد دیتے ہوئے اسے گلے لگالیتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اور خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ اسی خوشی میں یہ نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے۔

يَالَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ O بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ O (یٰسٓ: ۲۷-۲۶)

ترجمہ: "کاش میری قوم بھی جان لیتی کہ بخش دیا ہے مجھے میرے رب نے اور شامل کر دیا ہے مجھے باعزت لوگوں میں۔"[1]

---

[1] (طریق الھجرتین لابن القیم ص ۲۳۲-۲۳۳)

راہِ سلوک طے کرنے والوں کے مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے ذوق اور مشاہدہ کے اعتبار سے وحدتِ افعال کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کے اپنے افعال کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ان پر صادق آتا ہے۔

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (انفال: ۱۷)

اور (اے محبوب) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشتِ خاک) جب آپ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔

یہ بھی منزل کو پانے کا ایک مرتبہ ہے۔

ان میں سے بعض اپنے ذوق اور مشاہدہ کے اعتبار سے وحدتِ صفات کی راہ کو اپناتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد اور حدیثِ قدسی کے مصداق ہوتے ہیں۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ (دھر: ۳۰)

اور اے لوگو! تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے بغیر اس کے کہ اللہ خود چاہے۔

حدیث قدسی ہے:

فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به۔

جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔[1]

اور یہ بھی وصال کا ایک مرتبہ ہے۔

اور ان میں بعض وہ ہیں جو فنا فی الذات کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذاتِ باری تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان پر انوار و تجلیات کی بارش ہوتی ہے۔ ان پر یہ ارشادِ نبوی ﷺ صادق آتا ہے: اصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبید الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل۔ یعنی سب سے اچھا کلام جو کسی شاعر نے کہا ہے وہ لبید کا ہے، اس کا قول ہے غور سے سنو، اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔

أخرجه البخاری فی صحیحه فی کتاب المناقب عن أبی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه و لا مراد بالبطلان الفناء ای كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔[2]

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔

---

[1] (أخرجه البخاری فی صحیحه فی کتاب الرقاق عن أبی هریرة رضی اللہ عنه)

[2] (الرحمٰن: ۲۶-۲۷) کما فی هدایة الباری لترتیب أحادیث البخاری ۲: ۹۱)

صوفیائے کرام کیلئے راہِ طریقت میں نبی کریم ﷺ کی ذات منبع رشد وہدایت ہے۔ اور انہوں نے آپ ﷺ کے طریقہ کو اختیار کیا ہے کیونکہ آپ ﷺ بت پرستی اور وہاں کے ماحول کی آلودگی اور کدورت کو ترک کر کے غارِ حراء میں تشریف لے جاتے۔

اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (۴۵) وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا (الأحزاب ۴۶)

"اے نبی کریم ﷺ ہم نے بھیجا ہے آپ ﷺ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور برے وقت سے ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے اور آفتاب روشن کر دینے والا۔"

پس صوفیائے کرام اخلاق وعادات اور تمام احوال میں نبی کریم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: ۳۱)

ترجمہ: "(اے محبوب ﷺ) آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ۔"

صوفیائے کرام اس ارشادِ باری تعالیٰ کے مطابق نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع کرتے ہیں اور غیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اسی طرح درج ذیل ارشادات عالیہ سن کر ان پر عمل کرتے ہیں۔ دنیا اپنی زیبائش وآرائش سے انہیں دھوکہ نہیں دے سکتی اور نہ ہی ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

(۱): وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (انعام: ۱۵۳)

ترجمہ: "اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کر دیں گے تمہیں اللہ کے راستہ سے۔"

(۲): وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات: ۵۶)

اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور وہ جب ہاتف غیبی کی یہ ندا سنتے ہیں:

(۳): أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مومنون: ۱۱۵)

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

تو وہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرتے ہیں جو عنقریب اس کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اپنے سفر کو محنت اور کوشش سے جاری رکھتے ہیں حتیٰ کہ اپنے رب کے وصال کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں۔

اب ہم ان بعض مقامات کی وضاحت کرتے ہیں جن کو سالک وصول الی اللہ کے سفر میں طے کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا مقام توبہ ہے۔ کیونکہ جس کی توبہ نہ ہوا سے اس سفر کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ وصول الی اللہ کے سفر کی پہلی سیڑھی ہے۔

توبہ

توبہ سے مراد یہ ہے کہ سالک شرعی طور پر مذموم امور سے رجوع کر کے محمود امور کو اپنا لے۔ یہ سالکین کے راستہ کی ابتدا مریدین کی سعادت کی کلید اور منازلِ سلوک کے سفر کی شرط اول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کثیر مقامات پر اس کا حکم دیا ہے۔ اور اسے دنیاوآخرت کی فلاح کا سبب قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (نور: ۳۱)

اور رجوع کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو تا کہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ۔

(۲): اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ (ہود: ۵۲)

مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل وجان سے) رجوع کرو اس کی طرف۔

(۳): "یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا" (تحریم: ۸)

اے ایمان والو اللہ کی جناب میں سچے دل سے توبہ کرو۔

رسول اللہ ﷺ گناہوں سے معصوم ہونے کے باوجود کثرت سے توبہ واستغفار کرتے۔ اس کا مقصد تعلیمِ امت ہوتا تھا۔

عن الاغر بن یسار المزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ یا ایھا الناس توبوا الی اللہ واستغفروہ فانی اتوب الیہ فی الیوم مائۃ مرۃ۔

"حضرت اغر بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! اے لوگو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو، میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔"[1]

---

[1] (رواہ مسلم فی صحیحہ فی کتاب الذکر)

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"التوبۃ واجبۃ من کل ذنب"۔

ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔

پھر اگر معصیت ایسی ہو جس کا تعلق بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو۔ اور کسی آدمی کے حق کے متعلق نہ ہو تو اس سے توبہ کیلئے تین شرائط ہیں:

(۱) اس معصیت کو ترک کرے (۲) یہ پختہ عزم کرے کہ دوبارہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا

(۳) اس پر ندامت کا اظہار کرے

اگر تین شرطوں سے ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو اس کی توبہ صحیح نہیں ہو گی۔ اور اگر وہ معصیت کسی آدمی کے حق کے متعلق ہے تو اس کیلئے چار شرطیں ہیں۔ تین یہی مذکورہ شرطیں ہیں اور چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ صاحب حق سے برأت حاصل کرے۔ اگر تو وہ مال وغیرہ ہے جس کو اس نے غصب یا چوری کیا ہے تو اسے واپس کرے۔ اور اگر اس نے کسی پر تہمت وغیرہ لگائی ہے تو اس سے بھی معافی طلب کرے۔ اور اگر غیبت کی ہے تو اس سے بھی معافی کا خواستگار ہو۔ الغرض تمام گناہوں سے توبہ کرنا واجب ہے۔[1]

توبہ کی یہ بھی شرط ہے کہ وہ برے اور فاسق لوگوں کی صحبت کو ترک کرے جو اس کیلئے معصیت کو مزین کرتے ہیں اور عبادت سے نفرت دلاتے ہیں۔ پھر نیک اور مخلص لوگوں کی صحبت کو اختیار کرے تاکہ یہ صحبت معافی میں معاون اور گناہوں کی طرف لوٹنے میں رکاوٹ بن جائے۔ ہمارے لئے وہ صحیح اور مشہور حدیث بڑی سبق آموز ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کا قصہ بیان کیا ہے جس نے سو افراد کو قتل کر دیا تھا تو اس زمانہ کے ایک عالم ربانی نے اسے آگاہ کیا کہ اللہ توبہ قبول کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس برے ماحول کو ترک کر دو جس کی وجہ سے تم نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے ایک اچھے ماحول اور علاقہ کی طرف جانے کا حکم دیا جس میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بستے تھے تاکہ وہ ان لوگوں سے محبت کرے اور ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔[2]

صوفیائے کرام کسی گناہ کے چھوٹا یا حقیر ہونے کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی پیروی کرتے ہوئے اپنے رب کی عظمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

---

[1] (ریاض الصالحین، ص ۱۰)

[2] (رواہ مسلم فی صحیحہ کتاب التوبۃ وعن أبی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

انکم لتعلمون اعمالا ھی ادق فی اعینکم من الشعر انا کنا نعدھا علی عھد رسول اللہ ﷺ من المھلکات۔

"تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے بھی زیادہ باریک ہیں حالانکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ان کو مہلکات میں سے شمار کرتے تھے۔"[1]

صوفیائے کرام صرف معاصی سے توبہ پر اکتفاء نہیں کرتے کیونکہ یہ عوام کی توبہ ہے بلکہ وہ ہر اس چیز سے توبہ کرتے ہیں جو ان کو اپنے رب کی یاد سے غافل کر دے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جب توبہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

توبۃ العوام من الذنوب و توبۃ الخواص من الغفلۃ۔

"عوام الناس گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے۔"[2]

حضرت عبد اللہ تمیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! توبہ کرنے والوں کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو گناہوں اور سیئات سے توبہ کرتے ہیں اور بعض لوگ غفلت اور لغزشات سے اور بعض لوگ تو صرف اس لئے توبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی عبادات اور نیکیوں کو زیادہ نہ سمجھنے لگیں۔

سالک کو جب عرفانِ الٰہی حاصل ہوتا ہے تو اعمال کی کثرت سے اس کی توبہ میں دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس کا دل گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو جاتا ہے اور اس پر انوار و تجلیات کی بارش ہو جاتی ہے تو اس پر دل کی پوشیدہ بیماریاں مخفی نہیں رہتیں۔ اس لئے جب بھی اس کا دل کسی لغزش کی طرف مائل ہوتا ہے تو فوراً اپنے پروردگار سے حیاء کرتے ہوئے توبہ کر لیتا ہے۔ توبہ کے بعد سالک دن رات کثرت سے استغفار میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح اسے حقیقی عبودیت کا شعور حاصل ہوتا ہے پھر وہ اپنے مولیٰ کے حق میں اپنی تقصیر اور کوتاہی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی عبودیت کا اعتراف اور اپنے مولیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے۔

پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنتا ہے:

(۱): فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا (۱۰) يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا (۱۱) وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا (نوح ۱۲)

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الرقاق عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

[2] (رسالہ قشیریہ، باب توبہ، ص ۴۷)

پس میں نے کہا معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ برسائے گا آسمان سے موسلا دھار بارش اور وہ مدد فرمائے گا تمہاری اموال اور فرزندوں سے اور بنادے گا تمہارے لئے باغات اور بنادے گا تمہارے لئے نہریں۔

(۲): إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۱۵) آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ (۱۶) كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (۱۷) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (الذاريات ۱۸)

"البتہ اللہ سے ڈرنے والے (اس روز) باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ (بصد شکر) لے رہے ہوں گے جو ان کا رب انہیں بخشے گا، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نیکوکار تھے یہ لوگ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے اور سحری کے وقت (اپنی خطاؤں کی) بخشش طلب کرتے تھے۔"

جب وہ یہ آیات پڑھتا ہے تو اپنی کوتاہیوں اور احکامِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کے افسوس اور حسرت میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عیوب کی طرف متوجہ ہو کر ان کی اصلاح اور اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔ پھر تزکیۂ نفس میں مصروف ہو جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے نیکیوں کی کثرت کرتا ہے۔

کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"واتبع السيئة الحسنة تمحها" (ترمذی)

برائی کے بعد نیکی کر یہ نیکی اس برائی کو مٹادے گی۔

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی مدعی کے دعوی کا دارومدار اس کے نتیجہ پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا کوئی نتیجہ ظاہر ہو جائے تو اس کا دعویٰ صحیح ہو جاتا ہے ورنہ وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ پس ایسی توبہ جس کے نتیجہ میں تقویٰ حاصل نہ ہو وہ باطل ہے۔ اور ایسا تقویٰ جس سے استقامت حاصل نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔ اسی طرح اگر استقامت سے ورع حاصل نہ ہو تو وہ نامکمل ہوتی ہے۔ اور اگر ورع سے زہد میسر نہ آئے تو وہ بھی قاصر ہے۔ اور وہ زہد جو توکل کا سبب نہ بنے تو وہ محض خشک زہد ہے۔ اور وہ توکل جس سے یکسوئی حاصل نہ ہو اس کی حقیقت نہیں۔

توبہ کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ انسان محرمات سے اجتناب کرے۔ اور کامل تقویٰ یہ ہے کہ وہ یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے احوال سے مطلع ہے۔ اور استقامت کی نشانی یہ ہے کہ وہ بدعات سے بچ کر اپنے اوراد کی پابندی کرے۔ اور ورع کی علامت یہ ہے کہ جب اس پر کوئی چیز مشتبہ ہو جائے اگر تو وہ اسے ترک کر دے تو وہ صاحبِ ورع ہے ورنہ ورع سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔[1]

[1] (قواعدِ تصوف، شیخ احمد زروق رحمہ اللہ تعالیٰ، ص ۷۴)

محاسبہ

محاسبہ سے مراد ذہن میں ایسا شعور پیدا کرنا ہے جو اس کو برائیوں سے روکے اور اس کی اس طرح تربیت کرنا ہے کہ اس میں ملامت کی صفت اجاگر ہو جائے جو اس کو ان تمام معاصی سے روک دے جو محبت ایثار اور اخلاص کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ صوفیائے کاملین کو اس میں کافی درک حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت میں وہ نبی کریم ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ الامانی۔

یعنی "عقلمند اور دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور آخرت کیلئے عمل کیا اور عاجز وہ ہے جس نے خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کی (اور عمل کی بجائے) تمنا اور آرزو پر اکتفا کیا۔"[1]

جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ اسے لہو ولعب میں مشغول ہونے کا موقع نہیں دیتا بلکہ اسے عبادت اور طاعت میں مصروف رکھتا ہے۔ جب وہ کوئی سستی یا کوتاہی کرتا ہے تو خوفِ خدا کی وجہ سے فوراً اس کو ملامت کرتا ہے۔ اس طرح اس کے نفس کو لہو ولعب میں مشغول ہونے کا موقع کیسے مل سکتا ہے؟

شیخ احمد رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محاسبہ خشیتِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اور محاسبہ سے مقامِ مراقبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور مراقبہ سے سالک دائمی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتا ہے۔[2]

محاسبہ میں صوفیائے کرام نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ بھی اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روحانی تربیت کرنے کیلئے انہیں باطنی ملامت کی تربیت دیا کرتے تھے۔

مروی ہے کہ ایک دن حضور پاک ﷺ اپنے کاشانہ اقدس سے باہر تشریف لائے۔ آپ ﷺ کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اسی اثناء میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے نورِ نبوت سے جان لیا کہ ان دونوں کی بھی یہی حالت ہے اور ان کے پاس بھی پیٹ بھرنے کیلئے کوئی چیز نہیں۔ پھر ایک انصاری صحابی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مؤمنانہ فراست سے اس معاملہ کو جان لیا اور عرض کی میں آپ کی

---

[1] (رواہ الترمذی فی کتاب صفۃ القیامۃ عن شداد بن أوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقال: حدیث حسن۔ الکیس: العاقل:۔ دان نفسہ: حاسبھا)

[2] (البرھان المؤید، ص ۵٦)

ضیافت کرنا چاہتا ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں اصحاب کے ساتھ انصاری کے گھر پہنچے اور کھجوریں اور ٹھنڈا پانی نوش فرمایا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نعمت کے بارے میں آپ سے سوال کیا جائے گا۔[1]

ان چند کھجوروں اور ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن اس کے باوجود بھی نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کی توجہ مبذول کرانے کیلئے ارشاد فرمایا کہ اس نعمت کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا تاکہ وہ کسی حالت میں بھی اپنے نفس کے محاسبہ سے غافل نہ ہوں۔

محاسبہ خالق و مخلوق کے بارے میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اسی طرح نفس انسانی میں بھی شعور پیدا کرتا ہے جس کو احکام شرعیہ کا پابند کیا گیا ہے۔ محاسبہ سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق عبث نہیں بلکہ ضرور ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو گا حتیٰ کہ بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہو گا۔ پس جب وہ اپنے دائیں طرف متوجہ ہو گا تو اسے اپنے اعمال صالحہ نظر آئیں گے اور بائیں طرف اپنے برے اعمال دیکھے گا اور اس کے منہ کے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ ہو گی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! آگ سے بچو، اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے سے۔ اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو پھر پاکیزہ کلام سے۔[2]

محاسبہ سے سالک کے دل میں توبۃ النصوح کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خالق سے دور کرنے والی ہر فانی شئ کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ" (ذاریات: ۵۰)

پس دوڑو اللہ کی طرف (اور اس کی پناہ لے لو) بے شک میں تمہیں اس (کے غضب) سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

سالک یہ ارشاد باری تعالیٰ سن کر صوفیائے کرام کے مقدس گروہ میں شامل ہو کر منازلِ سلوک طے کرنے لگتا ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہوتا ہے:

"یاایھا الذین أمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین" (توبہ: ۱۱۹)

اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ۔

و انما القوم مسافرون لحضرۃ الحق و ظاعنون

---

1 (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۴۵ موجزاً)

2 (رواہ مسلم فی کتاب الزکاۃ عن عدی بن حاتم ص، و الترمذی فی کتاب صفۃ القیامۃ)

یہ لوگ راہِ حق کے مسافر ہیں اور ابھی کوچ کرنے والے ہیں۔

یہ مسافر منازل طے کرتے ہوئے حریم قدس میں پہنچ جاتے ہیں، وہاں ان پر قرب ووصال کی وہ نوازشات ہوتی ہیں، جس کا ہر محب طالب ہوتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ٥ (قمر:۵۵)

”بڑی پسندیدہ جگہ میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے پاس (بیٹھے) ہوں گے۔“

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محاسبہ سے غفلت نفس کی بربادی کا باعث ہے کیونکہ جب انسان اپنے نفس پر نرمی کرتا ہے تو وہ اس سے خوش رہتا ہے، اور جب اس پر تنگی کرتا ہے تو اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر نرمی کرنا اس کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان واضح امور کو ترک نہ کرے۔ مخفی اور پوشیدہ امور کی طرف رجوع نہ کرے۔

اور صوفیائے کرام کے اس فرمان کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے:

من لم یکن یومہ خیرا من امسہ فھو مغبون و من لم یکن فی زیادۃ فھو فی نقصان۔

یعنی جس کا آج کا دن کل کے دن سے بہتر نہ ہو وہ فریب خوردہ ہے اور جو ترقی نہ کرے وہ گھاٹے میں ہے۔

اپنے معمولات پر ثابت قدم رہنا ہی ترقی کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص وصول الی اللہ کی منازل ایک سال تک طے کرتا رہے اور پھر ایک لمحہ کیلئے بھی اس سے اعراض کرے تو اسکی سال بھر کی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔[1]

خوف

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز کی توقع کی وجہ سے دل میں جو الم و حزن اور جلن پیدا ہوتی ہے اسے ”خوف“ کہتے ہیں اور یہ خوف کبھی تو گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی معرفت سے جو خوف کا سبب بنتی ہیں۔ خوف کی یہ قسم اکمل واتم ہے۔ کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے تو یقیناً اس میں خوف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

[1] (قواعد التصوف للشیخ أحمد زروق، ص ۷۵)

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)

"اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ صرف اسی سے ڈریں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ (بقرہ: ۴۰)

"اور صرف مجھی سے ڈرا کرو۔"

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی مدح فرمائی ہے اور انہیں خوف کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِم (نحل: ۵۰)

ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے۔

وَخَافُوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْن (آل عمران: ۱۷۵)

مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مؤمن ہو۔

اور اس شخص کو دو جنتیں عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے یعنی دنیا میں علوم و معارف اور آخرت میں ابدی نعمتوں کی جنت۔

ارشاد فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَان۔ (رحمان: ۴۶)

اور جو ڈرتا ہے اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے تو اس کو دو باغ ملیں گے۔

اور اسی طرح اس کیلئے جنت الماویٰ کا وعدہ بھی فرمایا جیسا کہ یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَأْوٰى (نازعات: ۴۰)

"اور جو ڈرتا ہو گا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا ہو گا (ہر بری) خواہش سے یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔"

---

[1] (الأربعين فی أصول الدين ص ۱۹۶)

شیخ احمد زروق فرماتے ہیں کہ خشیتِ الٰہی کا وجود عمل پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اور خشیتِ الٰہی سے مراد دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وو قار کا پیدا ہونا ہے۔ اور خدا کے انتقام سے دل کے سہم جانے کو خوف کہتے ہیں۔ [1]

خوف اس شخص میں پیدا ہوتا ہے جو آئندہ پیش آنے والے خطرات کو بھانپ لیتا ہے۔ پھر احکامِ الٰہیہ کی پابندی کرتا ہے اور کسی حالت میں بھی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرتا بلکہ اس کیلئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس وقت خوف ظاہری جسم سے روح کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں عارف پر آہ وبکا کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا ادراک اہلِ صفا ہی کر سکتے ہیں۔

شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کو یہ مقام حاصل تھا کیونکہ ان پر اکثر آہ وبکا اور حزن کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ آپ جب بھی نارِ جہنم کا ذکر سنتیں تو پہروں آپ پر غشی طاری رہتی۔ آپ کی سجدہ گاہ آنسوؤں کی کثرت کی وجہ سے چھوٹے سے حوض کی شکل اختیار کر گئی تھی اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ نارِ جہنم کی تخلیق صرف آپ کیلئے ہے، در حقیقت آپ پر یہ کیفیت خشیتِ الٰہی کی وجہ سے طاری رہتی۔ اور آپ کو یہ پختہ یقین تھا کہ نارِ جہنم کے علاوہ ہر چیز آسان ہے اور اللہ تعالیٰ سے بعد اور دوری کے علاوہ ہر مصیبت سہل ہے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ محب کو جامِ محبت اسی وقت پلایا جاتا ہے۔ جب اس کا دل خوف کی بھٹی سے گزر کر پختہ ہو جائے۔ اور جس کو یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ آہ وبکا کی قدر وقیمت نہیں جان سکتا۔ جس نے جمال یوسف علیہ السلام کا مشاہدہ نہ کیا ہو، وہ یعقوب علیہ السلام کے غم وحزن کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ خائف وہ نہیں جو رونے کے بعد اپنے آنسوؤں کو صاف کر لے بلکہ حقیقت میں خائف وہ ہے جو ہر اس چیز کو ترک کر دے جس سے عذاب کا خوف ہو۔

حضرت ابو سلیمان درانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

مافارق الخوف قلبا الا خرب۔

خوف جونہی دل سے جدا ہو تو وہ برباد ہو جاتا ہے۔ [2]

تمام خائفین کا ایک ہی مرتبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خوف کے مختلف مراتب پر فائز ہوتے ہیں۔

---

1 (قواعد التصوف ص ۷۴)

2 (رسالہ قشیریہ ص ۲۰)

ابن عجیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے تین مراتب بیان فرماتے ہیں:

(۱) عوام کا خوف: جو عقاب و عذاب اور ثواب سے محرومی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

(۲) خواص کا خوف: یہ عتاب الٰہی اور قرب کی سعادت سے محروم ہونے سے ڈرتے ہیں۔

(۳): خاص لاخواص کا خوف: یہ صرف اس لئے ڈرتے ہیں کہ سوء ادب کی وجہ سے دیدار کی لذتوں سے محروم نہ ہو جائیں۔[1]

رجاء

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان پر اعتماد کرنے سے دل میں جو سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسے رجاء کہتے ہیں۔ لیکن رجاء کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ کیونکہ عمل کے بغیر رجاء خود فریبی ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں رجاء کی ترغیب دی ہے اور مایوسی سے روکا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر:۵۳)

"آپ فرمایئے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

اور اپنی وسعت رحمت کی بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف:۱۵۶)

میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر۔

اور اس کی بارگاہ سے رحمت کی امید رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أُوْلٰئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللهِ" (بقرہ:۲۱۸)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں تو یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی۔

---

1 (معراج التشوف إلی حقائق التصوف ص ۶)

2 (قواعد تصوف ص ۷۴)

احادیث طیبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت کا بیان ہوا ہے:

(۱) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالی عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم وجاء بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ تعالی فیغفر لھم۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہوں کا ارتکاب نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر کے ایک نئی قوم لے آئے جو گناہ کریں اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں اور اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے۔"[1]

(۲) عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی ﷺ قال یجیئنی یوم القیامۃ ناس من المسلمین بذنوب امثال الجبال یغفرھا اللہ لھم ویضعھا علی الیھود والنصاری۔

ترجمہ: "حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن بعض مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا اور ان گناہوں کو یہود ونصاری پر رکھ دے گا۔"[2]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندہ کو اپنے انتہائی قریب کرے گا اور اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا، اسے کہے گا: "تم اپنے فلاں فلاں گناہ کو جانتے ہو؟" بندہ کہے گا: "ہاں، یارب!" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "میں نے دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی اور آج تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔" پھر اس کو نیکیوں کا نامۂ اعمال عطا کر دیا جائے گا۔[3]

رجاء اور تمنا میں بہت فرق ہے کیونکہ راجی رضائے الٰہی کا خواہشمند ہونے کے ساتھ ساتھ عبادات اور طاعات کو ترک نہیں کرتا جبکہ تمنا کرنے والا عبادات اور مجاہدات کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کا منتظر ہوتا ہے۔

اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے تمنا اور آرزو پر اکتفا کیا وہ عاجز ہے۔[4]

کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رجاء کا طالب ہو اسے چاہیئے کہ اخلاص کے ساتھ محنت اور کوشش کرے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصود کو پالے۔

---

[1] (أخرجہ مسلم فی کتاب التوبۃ)

[2] (أخرجہ مسلم فی کتاب التوبۃ)

[3] (أخرجہ مسلم فی کتاب التوبۃ، والبخاری فی صحیحہ فی کتاب الرقاق۔ کنفہ: سترہ ورحمتہ)

[4] (رواہ الترمذی فی کتاب صفۃ القیامۃ وقال: حدیث حسن، وابن ماجہ فی کتاب الزھد۔ کلاھما عن شداد بن أوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (کھف: ۱۱۰)

ترجمہ: "پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔"

جب بندہ عروج شباب میں گناہوں میں مستغرق، نفسانی خواہشات میں گھرا ہوا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ جانب خوف کو رجاء پر غالب رکھے لیکن بڑھاپے میں جانب رجاء ہی غالب ہونے چاہئے کیونکہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں بندہ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے متعلق گمان رکھتا ہے۔[1]

اس طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

لا یموتن احدکم الا و ھو یحسن الظن باللہ۔

ترجمہ: "آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو۔"[2]

سالک جب قربِ الٰہی کے حصول کیلئے راہِ سلوک کی منازل طے کر رہا ہو۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ خوف ورجاء دونوں کو مدِ نظر رکھے نہ خوف، رجاء پر غالب ہو کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے اور نہ ہی رجاء، خوف پر غالب ہو کہ وہ معاصی اور گناہوں میں مستغرق ہو جائے بلکہ اسے چاہئے کہ ان دونوں کے درمیان محو پرواز رہے، حتیٰ کہ قربِ الٰہی کی سعادتوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ اسی کیفیت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا ہے:

تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا و طمعا۔ (السجدہ: ۱۶)

ترجمہ: "دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے"۔

یعنی وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں جہنم کے خوف سے اور جنت کے طمع میں اس سے دوری کے خوف سے اور اس کے قرب کی خواہش میں اس کی بے رخی کے خوف سے اور اس کی رجا کی خواہش میں۔

---

[1] (بخاری کتاب التوحید)

[2] (صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب الأمر بحسن الظن باللہ تعالیٰ)

اہلِ رجاء کے مختلف مراتب ہیں جس طرح کہ ابن عجیبہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: عوام کی رجاء یہ ہے کہ وہ حصولِ ثواب کے ساتھ حسنِ خاتمہ کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اور خواص، رضائے الٰہی اور اس کے قرب کے طالب ہوتے ہیں۔ اور خاص الخواص مشاہدہ حق میں تمکین اور اسرارِ خداوندی میں ترقی کے طلبگار ہوتے ہیں۔[1]

صدق

وصول الی اللہ اور نجات کے راستہ پر گامزن سالک کا تین اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے:

(۱): صدق (۲): اخلاص (۳): صبر

کیونکہ انسان تمام صفاتِ کمال سے اسی صورت آراستہ ہو سکتا ہے جب وہ ان تین صفات سے متصف ہو گا اور اسی طرح تمام اعمال کی قبولیت انہیں پر موقوف ہے۔ اور جب اعمال ان صفات سے خالی ہوں تو وہ درجۂ مقبولیت تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ صدق مدارج کمال میں ترقی اور اعمال صالحہ کا باعث ہے۔ اس لئے ابتداءً اس کے متعلق گفتگو کریں گے، پھر اخلاص، اور پھر اس کے بعد صبر۔

علمائے کرام نے صدق کی مختلف اقسام بیان فرمائی ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ صدق چھ معانی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱): گفتگو اور کلام میں صدق: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کلام اور گفتگو میں سچ کو اختیار کرے۔ ایفائے عہد اور وعدہ خلافی اسی میں داخل ہے۔

(۲): ارادہ اور نیت میں صدق: اس کا تعلق اخلاق سے ہے، یعنی اس کی تمام حرکات و سکنات خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہونی چاہیئے ہیں۔

(۳): عزم میں صدق: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے تمام اعمال صالحہ کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہو۔

(۴): عزم کی تکمیل میں صدق: اس سے مراد ہے کہ اس راہ میں آنے والی مشکلات کو آسانیوں میں بدلنے کا عزم مصمم کرے۔

(۵): عمل میں صدق: ظاہری اور باطنی اعمال میں مخلص ہو۔

(۶): تمام مقامات دین میں صدق: مقاماتِ دین سے مراد خوف، رجاء، تعظیم، زہد، رضا، توکل اور حب الٰہی ہے۔[2]

---

[1] (معراج التشوف ص ۶)

[2] (إحياءعلوم الدين، ج ۴ ص ۳۳۴)

قاضی زکریا انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ صدق سے مراد وہ حکم ہے جو واقع کے مطابق ہو اور اس کے تین مقام ہیں: زبان، قلب اور افعال۔ زبان سے مراد یہ ہے کہ انسان واقع کی صحیح خبر بیان کرے۔ قلب سے مراد یہ ہے کہ وہ خبر کو پختہ ارادہ سے بیان کرے۔ افعال سے مراد یہ ہے کہ وہ خبر بیان کرنے میں سستی نہ کرے۔

صدق کا سبب یہ ہے کہ صادق کو خبر پر مکمل اعتماد ہوتا ہے۔ اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ سچ بولنے والا خدا اور اس کی مخلوق کے نزدیک قابلِ ستائش ہوتا ہے۔[1]

عوام الناس کا صدق صرف زبان تک ہی محدود ہوتا ہے لیکن صوفیائے کرام کا مقام صدق اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کیونکہ ان کا صدق زبان کے علاوہ دل، افعال اور احوال کو بھی شامل ہوتا ہے۔

علامہ ابن ابی شریف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے نزدیک صدق سے مراد یہ ہے کہ ان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو یعنی سالک کے احوال اس کے اعمال کے برخلاف نہ ہوں اور اس کے اعمال اس کے احوال کے برعکس نہ ہوں۔[2]

صوفیائے کرام کے نزدیک صدق وہ صفت ہے جس کی وجہ سے مدارج کمال میں ترقی کا عزم وہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی سے سالک صفاتِ مذمومہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے صدق سالک کے ہاتھ میں اللہ کی تلوار ہے جس سے راہِ سلوک میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹوں کو قطع کر دیتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں یہ تلوار نہ ہوتی تو کمالات کے مراتب میں ترقی نہ کر سکتا بلکہ ہمیشہ مختلف قسم کے خطرات سے دوچار رہتا۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ لقائے الٰہی کی تیاری میں صدق تمام اعمال صالحہ، ایمانی احوال، مقامات سالکین اور منازلِ سلوک کی چابی ہے۔ ان مقامات کی ابتداء خواب غفلت سے بیداری سے ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد توبہ، انابت، محبت، رجاء، خشیت تسلیم ورضا وغیرہ کی منازل ہیں۔ ان سب کی چابی لقائے الٰہی کی تیاری میں سالک کا صادق ہونا ہے۔ اور یہ چابی اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے جس کے سوا نہ تو کوئی معبود ہے اور نہ ہی پروردگار۔

جب سالک اپنے آپ کو صفتِ صدق سے آراستہ کر لیتا ہے تو ایمان کی بلند منازل کو حاصل کرنے میں اس کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے کیونکہ صدق وہ قوت ہے جو اس کو آگے کی طرف دھکیلتی ہے اور تمام منازلِ سلوک میں سالک سے متصف

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۹۷)

[2] (شرح ریاض الصالحین، لابن علان الصدیقی ج ۱ ص ۲۸۲)

رہتی ہے۔ منازل سلوک میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ میں صادق ہو۔ اور سچی توبہ ہی اعمال صالحہ کی بنیاد اور مراتب کمال کا پہلا مرتبہ ہے۔[1]

صدق، نفس امارہ کو مہذب بنانے اور اس کی امراض سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بڑا ممد و معاون ہے۔ یہ دل کو خباثتوں سے پاک کر دیتا ہے حتیٰ کہ اسے وہ کیفیت ذوق حاصل ہو جاتی ہے جس کا ذکر نبی پاک ﷺ نے اس حدیث پاک میں کیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

"ذاق طعم الایمان من رضی ب اللہ تعالی ربا و بالا سلام دینا و بمحمد نبیا۔"

اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا نبی تسلیم کر لیا۔[2]

صدق کے ذریعہ ہی انسان شیطان کا مقابلہ اور اس کے وساوس سے اور اس کے مکر و فریب اور شر سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اور شیطان اس کو گمراہ کرنے سے مایوس ہو جاتا ہے۔

صدق ہی انسان کے دل سے دنیا کی محبت نکالنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ انسان کو باہمی تعاون اور ایثار اور مسلسل مجاہدہ پر برانگیختہ کرتا ہے حتیٰ کہ وہ دنیا کی محبت سے چھٹکارا اور دل پر اس کے غلبہ سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

صدق، حصولِ علم اور جہالت سے چھٹکارے کیلئے بھی ممد و معاون ہے، یہ انسان کو طلب علم میں استقامت، لگاتار جدوجہد، مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے اور شب بیداری پر ابھارتا ہے تاکہ وہ علم کثیر سے بہرہ ور ہو سکے۔ علمائے متقدمین نے اپنے صدق، اخلاص اور صبر کی وجہ سے ہی بلند مقام حاصل کیا۔

عمل کے میدان میں صدق، علم کا ثمرہ اور اس کی غایت ہے کیونکہ یہ انسان کی دائمی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا سبب ہے لیکن اس میں از حد اخلاص کی ضرورت ہے۔ ورنہ سالک میں حبِ شہرت ریا اور اس جیسے دوسرے امراض پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن اخلاص اس کے مقصود میں حائل ہونے والے تمام تر امراض کو زائل کر دیتا ہے، اس طرح انسان اپنا مقصود یعنی رضائے الٰہی اور اس کی معرفت و محبت پا لیتا ہے۔

اس بحث سے صدق کی اہمیت اور اس کے فوائد واضح ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نبوّت اور رسالت کے بعد صدق ہی سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

---

[1] (طریق الھجرتین، ص ۲۲۳)

[2] (أخرجه مسلم فی کتاب الإیمان عن أبی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنه و الإمام أحمد و الترمذی عن العباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنه)

شیخ ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صدق پر تصوف کا دارومدار اور اسی کے ساتھ اس کا نظام اور تکمیل وابستہ ہے، اور نبوت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ یُّطِعِ اللہ والرَّسُوْلَ فَأُوْلٰئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ أَنْعَمَ اللہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ أُوْلٰئِکَ رَفِیْقًا (النساء: ۶۹)

اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور صالحین اور شہداء اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔[1]

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اہلِ صدق کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ ان کے حال سے استفادہ اور ان کے صدق سے نفع حاصل کریں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔" (التوبہ: ۱۱۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ۔"

درج ذیل آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صادقین کی قلت کی طرف اشارہ کیا ہے اور انہیں مسلمانوں کا ممتاز گروہ قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللہَ عَلَیْہِ۔ (احزاب: ۲۳)

ترجمہ: "مؤمنوں میں ایسے مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دیا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔"

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: صالحین تو کثیر ہیں لیکن ان میں صادقین کی تعداد انتہائی کم ہے۔[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت فرمائی جو اپنے ایمان اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وعدہ میں صادق نہیں تھے۔

فرمایا: فَلَوْ صَدَقُو اللہَ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ۔ (محمد: ۲۱)

ترجمہ: "تو اگر وہ سچے رہتے اللہ تعالیٰ سے تو ان کیلئے بہتر ہوتا۔"

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۹۷)

[2] (طبقات الصوفیاء للسلمی، ص ۸۷)

اللہ تعالیٰ نے اہلِ صدق کے بارے میں خبر دی ہے کہ قیامت کے دن ان کا صدق ثمر بار ہو گا۔ اور اسی کے سبب انہیں نفع اور نجات حاصل ہو گی، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ۔ (مائدہ: ۱۱۹)

"یہ ہے وہ دن جس میں فائدہ پہنچائے گا سچوں کو ان کا سچ۔"

نبی کریم ﷺ نے صدق کو نیکی تک پہنچانے والا راستہ قرار دیا ہے اور اس نیکی سے مراد وہ تمام کمالات وفضائل ہیں جو بندہ کو جنت میں داخل ہونے کا اہل بنا دیتے ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے مرتبہ صدیقیت کے حصول کیلئے دائمی صدق کو کلید قرار دیا ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

ان الصدق یهدی الی البر و ان البر یهدی الی الجنة ان الرجل لیصدق حتی یکتب عند الله صدیقا و ان الکذب یهدی الی الفجور و ان الفجور یهدی الی النار و ان الرجل لیکذب حتی یکتب عند الله کذابا۔

"بے شک صدق نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف اور بے شک آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ بے شک جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ نارِ جہنم کی طرف۔ بے شک بندہ جھوٹ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔"[1]

تمام صادقین کا ایک ہی مرتبہ نہیں ہوتا بلکہ صدیق کا مرتبہ صادق سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ شیخ ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صدق کا سب سے کم مرتبہ یہ ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔ اور صادق وہ ہے جو اپنے اقوال میں سچا ہو۔ اور صدیق وہ ہے جو اپنے تمام اقوال وافعال اور احوال میں سچا ہو۔

پھر صدیقیت کے بھی مختلف مراتب ہیں ان میں سے بعض اعلیٰ اور بعض درجہ کے لحاظ سے کم ہیں۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صدیقیت کا سب سے اعلیٰ درجہ حاصل تھا، جس کی شہادت قرآن پاک نے بھی دی ہے۔

آپ ہی کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ۔ (زمر: ۳۳)

ترجمہ: "اور وہ ہستی جو اس سچ کو لے کر آئی اور وہ جس نے اس سچائی کی تصدیق کی۔"

[1] (أخرجه البخاری فی صحیحه فی کتاب الأدب، ومسلم فی کتاب البر عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه)

مقامِ صدیقیت سے اوپر مقامِ نبوت ہے اور مقامِ صدیقیت ہی ولایت کبریٰ اور خلافت عظمیٰ کا مقام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انوار و تجلیات کی بارش ہوتی ہے اور نفس کے کامل اور شفاف ہونے کی وجہ سے مشاہدات و مکاشفات حاصل ہوتے ہیں۔

خلاصہ: جو شخص اپنے باطن کو صدق اور اخلاص کے ساتھ معمور کرلیتا ہے اس کی تمام حرکات و سکنات اس کے قلب کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ پھر اس کے اقوال واعمال اور احوال میں صدق ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جب انسان نیک کام کا ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی توفیق عطا فرمادیتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ راہِ حق پر چلنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اقوال میں صدق اور اعمال میں اخلاص اور احوال میں صفا کو لازم پکڑے اور جس میں یہ تمام صفات پائی جائیں وہ ابرار کی صف میں شامل ہو کر رضائے الٰہی کو پالیتاہے۔[1]

اے سالک! تجھے چاہیئے کہ تو اپنے تمام اقوال میں صدق اختیار کرے کیونکہ کذب، منافقین کی صفت ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

آیۃالمنافق ثلاث: اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا اؤتمن خان۔

"یعنی منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو توڑدے، اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔"

أخرجه البخاری فی صحیحه فی کتاب الإیمان، ومسلم فی کتاب الإیمان عن أبی هریرة رضی الله عنه۔ قال المناوی فی شرح هذا الحدیث:

النفاق ضربان: شرعی: وهو إبطان الكفر وإظهار الإيمان، وعرفی: وهو أن یکون سره خلاف علانیته، وهو المراد هنا۔[2]

اے سالک! وصول الی اللہ کی طلب میں صادق ہوجا کیونکہ بلند مقاصد کو صرف خواہشات سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ شخص وصال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جس کے دل میں صرف اس کی خواہش ہو بلکہ محنت اور کوشش کے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں، اپنے دل کو صدق کے ساتھ معمور کرلے تاکہ اس میں منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے ہمت اور نشاط پیدا ہوسکے۔ اور جب تو یا اللہ کہے تو سچے دل سے کہہ کیونکہ صدق اس کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ اور اپنے مرشد اور ہادی کے ساتھ کئے وعدے پر صدق کے ساتھ قائم رہ کیونکہ یہ تیری ترقی اور منزل مقصود تک جلدی پہنچنے میں مددگار ہے۔ اور اسی

---

[1] (شرح ریاض الصالحین، لابن علان ج ۱ ص ۲۸۴)

[2] (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج ۱ ص ۶۳)

طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی پیروی میں صدق کا مظاہرہ کر تا کہ تجھے مقامِ عبدیت حاصل ہو جائے، جو تمام مراتب میں سالک کی آرزو ہو تا ہے۔

اخلاص

تعریف: شیخ ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اخلاص، طاعت اور عبادت کو قصداً اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دینے کا نام ہے۔ یعنی عبادت کا مقصد صرف قربِ الٰہی کا حصول ہو۔ مخلوقِ خدا کیلئے تصنع، لوگوں کی تعریف حاصل کرنے یا اس کے علاوہ کوئی اور مقصد پیشِ نظر نہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کو یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اخلاص، عمل کو مخلوق کے ملاحظہ سے پاک رکھنے کا نام ہے۔

حضرت ابو علی دقاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اخلاص، مخلوق کے ملاحظہ سے بچنے کا نام ہے۔ مخلص میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ترک العمل من اجل الناس ریاء و العمل من اجل الناس شرک و الاخلاص ان یعافیک اللہ منھما۔

یعنی لوگوں کی وجہ سے کسی عمل کو ترک کرنا ریا کہلاتا ہے اور لوگوں کی خاطر عمل کرنا شرک کہلاتا ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ان دونوں چیزوں سے بچا لے۔

امام جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اخلاص اللہ اور بندے کے درمیان ایک راز ہے جس کو نہ تو کوئی فرشتہ جانتا ہے کہ وہ اس کو لکھ لے۔ اور نہ ہی شیطان کی اس تک رسائی ہوتی ہے کہ اس کو فاسد کر دے۔ اور نہ ہی خواہشِ نفس اس کو پا سکتی ہے کہ اس کو اپنی طرف مائل کر لے۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مخلص کا حق یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنے اخلاص کی طرف توجہ دے اور نہ ہی اس پر مطمئن ہو کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا اخلاص مکمل نہیں ہو گا، بلکہ بعض نے تو اس کو ریا کا نام دیا ہے۔[1]

اخلاص کے بارے میں ان مختلف اقوال کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ اعمال تعبدیہ میں نفس کا کوئی دخل نہ ہو، خواہ یہ اعمال جسم کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یا دل اور مال کے ساتھ۔ مخلص کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اخلاص کی طرف متوجہ نہ ہو۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۹۵-۹۶)

کتاب و سنت میں اخلاص کی اہمیت:

چونکہ اعمال کی قبولیت اخلاص پر موقوف ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تعلیم امت کیلئے نبی علیہ السلام کو عبادت میں اخلاص کا حکم دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): قُلْ إِنِّيْ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ (زمر: ۱۱)

ترجمہ: ”فرمایئے، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اس کیلئے (طاعت کو)۔“

(۲): ”قُلِ اللهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِي“ (زمر: ۱۴)

فرمایئے، اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرتا ہوں خالص کرتے ہوئے اس کیلئے اپنے دین کو۔

(۳): فَاعْبُدِ اللهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ (زمر: ۲)

پس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئے اس کیلئے اطاعت کو، خبردار اللہ کیلئے ہے دینِ خالص۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تمام عبادات قولیہ، فعلیہ اور مالیہ میں اخلاص کا حکم فرمایا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (البینہ: ۵)

حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کیلئے خالص کرتے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے واضح بیان فرمادیا ہے کہ قیامت کے دن لقائے الٰہی کا راستہ صرف وہ عمل صالح ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کیا گیا ہو اور مخلوق کے ملاحظہ سے سالم ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَدًا۔ (کھف: ۱۱۰)

پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔

احادیث طیبہ بھی بندہ کو اپنے تمام اعمال میں اخلاص کا درس دیتی ہیں۔ اور اس کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اس کی عبادت کا مقصد لوگوں کی تعریف و توصیف حاصل کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ اور ان میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ عمل جو خالص اللہ کیلئے نہ ہو وہ

قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اور احادیث طیبہ یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے ظاہری اعمال کی طرف نہیں دیکھتا ہے کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ریا کو شرک اصغر اور پوشیدہ شرک کا نام دیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی خبر دی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار سے بری ہو جائے گا۔ اور اس کو ان لوگوں کے سپرد کر دے گا جن کو انہوں نے اپنے رب کی عبادت میں شریک بنایا تھا۔

اب ہم بعض احادیث بیان کرتے ہیں جو اخلاص کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔

(۱): "عن ابی امامة قال: جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال: ارأیت رجلا غزا یلتمس الاجر والذکر ماله؟ فقال رسول اللہ ﷺ لا شئ له فاعادها ثلاث مرات ویقول رسول اللہ ﷺ لا شئ له ثم قال ان اللہ عز وجل لا یقبل من العمل الا ما کان له خالصا وابتغی به وجهه"۔

ترجمہ: "حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے اس شخص کے بارے میں بتایئے جو اجر اور شہرت کیلئے جنگ میں شریک ہوا، اسے کیا ملے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے کچھ نہیں ملے گا۔ اس آدمی نے تین دفعہ اس بات کا اعادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا! اسے کچھ نہیں ملے گا۔ پھر فرمایا! اللہ عز و جل اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کیلئے ہو اور جس سے اس کی رضا مقصود ہو۔"[1]

(۲): "عن ابی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللہ ان اللہ لا ینظر الی اجسامکم ولا الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ تمہارے جسم اور صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں کی طرف دیکھتا ہے۔[2]

(۳): "عن شداد بن الاوس رضی اللہ تعالی عنه انه سمع النبی ﷺ یقول: من صام یرائی فقد اشرک ومن صلی یرائی فقد اشرک ومن تصدق یرائی فقد اشرک۔"

"حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے ریاکاری کیلئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے ریاکاری کیلئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے ریاکاری کیلئے صدقہ کیا اس نے بھی شرک کیا۔"[3]

---

[1] (رواہ أبو داود والنسائی بإسناد جید)
[2] (مسلم، کتاب البر والصلة)
[3] (بیهقی، الترغیب والترهیب: ج:۲: ص: ۳۱)

(۴): عن محمود بن لبید قال: خرج النبی ﷺ فقال: یا ایھا الناس ایاکم و شرک السرائر۔ قالوا: یا رسول اللہ ﷺ وما شرک السرائر؟ قال: یقوم الرجل فیصلی فیزین صلاتہ جاھدا لما یری من نظر الناس الیہ فذلک شرک السرائر۔

"حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن اپنے کاشانۂ انور سے باہر تشریف لائے اور فرمایا، اے لوگو! سرائر کے شرک سے بچو۔ صحابہ نے عرض کی، سرائر کا شرک کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آدمی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز کو خوبصورت انداز میں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو دکھائے اور یہی سرائر کا شرک ہے۔"[1]

(۵): حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! تمہارے متعلق سب سے زیادہ جس چیز کا مجھے خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔ صحابہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ شرک اصغر کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا! اس سے مراد ریا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا تو ریاکاروں کو حکم دے گا ان لوگوں کی طرف جاؤ جن کیلئے تم دنیا میں ریاکاری کرتے تھے اور دیکھو کیا تمہیں ان کے پاس سے جزا ملتی ہے۔[2]

(۶): حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا: جس نے اپنے عمل میں کسی کو شریک ٹھہرایا وہ اسی سے ثواب طلب کرے، بے شک اللہ تعالیٰ ان شرکاء سے مستغنی ہے۔[3]

اخلاص کی اہمیت میں اقوالِ علماء:

حضرت مکحول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص چالیس دن تک اخلاص پر عمل پیرا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے حکمت و دانائی کے چشمے جاری کر دے گا۔[4]

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی گئی کہ کون سی چیز نفس کیلئے سخت ترین ہے؟ آپ نے فرمایا، اخلاص کیونکہ اس میں نفس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔[5]

---

[1] (رواہ ابن کزیمہ فی صحیحہ)
[2] (رواہ الإمام أحمد بإسناد جید)
[3] (رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر، سورۃ الکھف)
[4] (رسالہ قشیریہ ص ۹۵-۹۶)
[5] (رسالہ قشیریہ ص ۹۵-۹۶)

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

اذا اخلص العبد انقطعت عنه كثرة الوساوس و الرياء۔

یعنی "جب بندہ مخلص ہو جاتا ہے تو اس سے وساوس کی کثرت اور ریاء ختم ہو جاتے ہیں۔"[1]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اعمال خالی ڈھانچوں کی مثل ہیں اور ان کی روح اخلاص ہے۔ ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ تمام اعمال خالی ڈھانچوں اور جسموں کی مانند ہیں۔ اور ان میں اخلاص کا پایا جانا روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ڈھانچے روح کے ساتھ ہی قائم ہوتے ہیں اگر روح نہ ہو تو ان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بدنی اور قلبی اعمال کا قیام اخلاص کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ان میں اخلاص نہ ہو تو یہ صرف خیالی تصویر کی مانند ہوتے ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔[2]

اخلاص کے بارے میں علماء و عارفین کے اقوال شمار سے باہر ہیں۔

اخلاص کے مراتب:

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اخلاص کے تین درجے ہیں۔

(۱): عوام کا اخلاص (۲): خواص کا اخلاص (۳): خاص الخواص کا اخلاص

(۱): عوام کا اخلاص:

یہ ہے کہ یہ اخروی اور دنیوی دونوں نعمتوں کے طالب ہوتے ہیں جیسے صحت، مال، وسعتِ رزق اور حور و قصور۔

(۲): خواص کا اخلاص:

ان کا اخلاص یہ ہے کہ یہ صرف اخروی نعمتوں کے طالب ہوتے ہیں۔

(۳): خاص الخواص کا اخلاص:

یہ کلیۃً دونوں نعمتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان کی عبادت خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم کی بجا آوری اور اس کے دیدار کے شوق میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابن فارض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لیس سؤالی من الجنان نعیما ۔۔۔ غیر انی احبها لاراکا

جنت کی نعمتیں مجھے مطلوب نہیں، مگر میں ان سے صرف اس لئے محبت کرتا ہوں تاکہ تیرے دیدار سے بہرہ ور ہو سکوں۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۹۵-۹۶)

[2] (ایقاظ الھمم فی شرح الحکم لإبن عجیبة ج ۱ ص ۲۵)

کلهم یعبدون من خوف نار ویرون النجاة حظا جزیلا
اوبان یسکنوا الجنان فیضحوا فی ریاض ویشربوا سلسبیلا
لیس لی فی الجنان والنار رای انا لا ابتغی بحبی بدیلا

سب لوگ نارِ جہنم کے خوف سے اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس سے نجات کو بہت عظیم گمان کرتے ہیں، یا اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ جنتوں میں سکونت اختیار کریں اور باغوں میں سیر کریں اور سلسبیل نوشِ جان کریں، لیکن مجھے جنت اور دوزخ کا کوئی خیال نہیں اور نہ ہی میں اپنی محبت کا کوئی بدل چاہتا ہوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ شیخِ کامل کے بغیر نفس کی شہوات اور ریاکاری کے دقائق سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔[1]

صوفیائے کرام کا سب سے اعلیٰ مقصد اپنے اخلاص کے ساتھ بلند درجات میں ترقی کرنا اور ثواب کی خواہش کے بغیر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے عبادت کرنا ہے۔

فما مقصودهم جنات عدن ولا الحور الحسان ولا الخیام
سوی نظر الجلیل وذا مناهم وهٰذا مقصد القوم الکرام

جنات عدن ان کا مقصود نہیں نہ ہی خوبصورت حوریں اور خیام، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم کے طالب ہیں اور یہ ان کی آرزو ہے اور یہی ان کریم لوگوں کا مقصد ہے۔

”قالت رابعة رحمها اللہ تعالی ما عبدتک خوفا من نارک ولا طمعا فی جنتک وانما عبدتک لذاتک“

یعنی حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا فرماتی ہیں اے اللہ! میں تیری عبادت تیری آگ کے خوف سے نہیں کی اور نہ ہی تیری جنت کے لالچ میں کی ہے بلکہ میں نے تیری عبادت محض تیری ذات کیلئے کی ہے۔

اگر ثواب وعقاب اور جنت ودوزخ کا وجود نہ ہوتا تب بھی اللہ کے محبوب بندے اس کی عبادت سے پیچھے نہ ہٹتے اور نہ ہی اس کی اطاعت سے منہ پھیرتے کیونکہ وہ اللہ کی عبادت صرف اللہ کیلئے کرتے ہیں۔ اور کیونکہ ان کے اعمال ایسے دل سے صادر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہے اور وہ اس کے قرب اور رضا کے طالب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں اس کی نعمتوں اور انعامات کا ادراک ہوتا ہے اور انہوں نے اس کے احسانات کا ذائقہ چکھ لیا ہوتا ہے۔

اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ جنت میں داخل ہونے کو پسند نہیں کرتے اور نہ ہی آگ سے دور ہونے میں رغبت رکھتے ہیں جیسا کہ بعض احمقوں نے یہ سمجھ لیا ہے بلکہ وہ آگ کو ناپسند کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی،

---

[1] (ایقاظ الهمم فی شرح الحکم ج ۱ ص ۲۵-۲۶)

غضب اور انتقام کا مظہر ہے۔ اور وہ جنت کو پسند کرتے ہیں اور اس کو طلب کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت، رضا اور قرب کا مظہر ہے۔

جس طرح کہ حضرت آسیہ (زوجہ فرعون) نے فرمایا:

"رب ابن لی عندک بیتا فی الجنة" (تحریم: ۱۱)

اے میرے رب! بنادے میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں۔

انہوں نے جنت کو طلب کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے قرب اور عندیت کو طلب فرمایا۔ اور گھر سے پہلے پڑوس کو طلب فرمایا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

و ما حب الدیار شغفن قلبی　　　و لکن حب من سکن الدیار

دیار کی محبت نے میرے دل کو مائل نہیں کیا بلکہ اس کی محبت نے جو اس دیار میں سکونت پذیر ہے۔

یعنی جنت میں ان کی رغبت اللہ تعالیٰ کی رضا، قرب اور محبت کا باعث تھی۔ اسی طرح جب بندہ کی ہمت بلند اور اس کا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے تو وہ بدنی لذائذ اور ذاتی نفع سے کنارہ کش ہو جاتا ہے خواہ یہ نفع دنیوی ہو یا اخروی۔ پھر بندہ اپنی تمام عبادات میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب کا طالب ہوتا ہے اور خالص عبودیت سے متصف ہو جاتا ہے۔ بندہ کی ہمت کے مطابق ہی اس کا مطلوب و مقصود ہوتا ہے۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ جو شخص اپنی طاعت اور عبادت سے اخروی نعمتوں کا طالب ہو اور جنت کی لذات سے لطف اندوز ہونے اور نارِ جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خواہشمند ہو، وہ گمراہ ہے۔ اور نہ ہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں سے محروم ہے بلکہ وہ تو اطاعت گزار صالح مؤمن ہے مگر اس کا مرتبہ ان لوگوں سے کم ہے جن کی نیتیں صاف اور ہمتیں بلند ہوں۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ثواب و عقاب سے بالاتر ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کیلئے اس کے احکام کی پیروی کرتا ہے۔ اس کی عبادت خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتی ہے بر خلاف اس شخص کے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت حصولِ ثواب اور عقاب کے خوف سے کرتا ہے، لہٰذا اس کی عبادت میں اس کے نفس کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوتا ہے لیکن اس کا شمار ابرار میں ہوتا ہے جبکہ پہلے شخص کو مقربین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔[1]

[1] (تأیید الحقیقة العلیة للإمام السیوطی، ص ٦١)

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معظم چیزوں کی تعظیم ضروری ہے اور ان کو حقیر جاننا کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے اس لئے صوفیائے کرام کے اس ارشاد "ما عبدنا خوفا من ناره ولا طمعا في جنته" (ہم نے اس کی عبادت آتشِ جہنم کے خوف اور اس کی جنت کے لالچ سے نہیں کی) کو اپنے اطلاق پر نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ اس قول کے دو ہی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ یا تو انہیں (جنت و دوزخ) حقیر جانا گیا حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ تعظیم ہیں اس لئے عام مسلمان سے بھی اس کی حقارت کا گمان نہیں کیا جا سکتا یا ان سے مستغنی ہونے کی بنا پر یوں کہا گیا حالانکہ مؤمن کسی حالت میں بھی اپنے مولیٰ کی برکت سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ صوفیائے کرام نے یہ مفہوم مراد نہیں لیا بلکہ انہوں نے عبادت خالص اللہ تعالیٰ کیلئے کی اور اس عبادت کے بدلے میں جنت کا مطالبہ اور آتش جہنم سے نجات کا مطالبہ نہیں کیا۔

اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

"إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ۔" (الدھر: ۹)

ترجمہ: "ہم تمہیں کھلاتے ہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو عمل کی علت بنایا گیا ہے۔[1]

بعض اوقات سالک کے عمل میں بہت سی آفات داخل ہو جاتی ہیں جو اس کے اخلاص کو عیب دار کر دیتی ہیں۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس لئے ان آفات کی وضاحت اور سالکین کو ان کے خطرات سے آگاہ اور ان سے چھٹکارے کا طریقہ بیان کرنا ضروری ہے تاکہ سالک کے تمام اعمال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ہوں۔

حجاب اول:

بعض اوقات سالک اپنے عمل پر نازاں ہوتا ہے اور یہ چیز اس کیلئے حجاب کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عبادت میں گم ہو کر محبوب سے دور ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ سالک کو چاہئے کہ یہ ذہن میں رکھے کہ وہ اور اس کا عمل سب کچھ اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (الصافّات: ۹۶)

ترجمہ: "حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو۔"

---

[1] (قواعد التصوف للشيخ أحمد زروق ص ٤٧)

یعنی تمام اعمال توفیقِ الٰہی سے سر انجام پاتے ہیں۔ بندہ کی طرف صرف کسب کی نسبت ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے نفس کی صفات میں دقتِ نظر سے غور وفکر کرے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے نفس کی وہی حالت ہے جیسا کہ اس کے خالق ومالک نے بیان کی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ۔ (یوسف: ۵۳)

ترجمہ: "بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا۔"

تو وہ جان لے گا کہ اس سے جو بھی نیکی کا کام ہوتا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہی ہوتا ہے۔ اس وقت اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "وَلَو لَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا۔" (نور: ۲۱) (اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت، تو تم میں سے کوئی بھی کبھی ستھرا نہ ہو سکتا تھا) کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ حاصلِ کلام یہی ہے کہ انسان اپنے عمل پر فخر واعجاب سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب اسے اپنے نفس کی رعونات سے مکمل آگاہی ہو۔ لہٰذا انسان کو اس کی معرفت کے حصول کیلئے کوشاں رہنا چاہئے۔

حجاب ثانی:

سالک کیلئے دوسرا حجاب یہ ہے کہ اپنے عمل پر عوض کا مطالبہ کرے۔ خواہ وہ عوض دنیاوی ہو یا اخروی۔ دنیاوی عوض سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف قسم کی خواہشات کا طالب ہو جیسے شہرت ورفعتِ مرتبہ کی خواہش وغیرہ۔ احوال، مقامات اور مکاشفات اور معارف کی طلب بھی اس میں داخل ہے۔ اسی لئے عارفِ کبیر شیخ ارسلان رحمہ اللہ ایسے سالک کو نصیحت فرماتے ہیں جو اپنے مطلوب ومقصود کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے: "اے خواہشات اور عبادات کے اسیر! اے مقامات ومکاشفات کے اسیر! تو دھوکے میں ہے!"[1]

اسے ان اشیاء کا اسیر اس لئے کہا گیا ہے، کیونکہ یہ تمام اشیاء غیر اللہ اور عالم خلق سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہونا، خالق کی معرفت میں رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔

کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا۔ (النجم: ۴۲)

ترجمہ: "آپ کے رب تک اس کی انتہا ہے۔"

---

[1] (خمرة الحان ورنة الألحان ص ۱۷۷)

شیخ عبد الغنی نابلسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تو اپنی طلب میں صادق ہوتا تو کسی خواہش، عبادت، مقام یا مکاشفہ کی طرف متوجہ نہ ہوتا، بلکہ تیرا مقصود حقیقی صرف اور صرف اللہ کی ذات ہوتا۔ تیرا عزم و حوصلہ خالص اللہ کیلئے ہوتا اور ماسوی اللہ سے تو اعراض کرتا۔ پھر فرماتے ہیں کہ ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "التنویر فی اسقاط التدبیر" میں اپنے شیخ و مرشد ابو العباس مرسی سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ولی اس وقت تک وصال کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کے دل سے وصال کی خواہش ختم نہ ہو جائے۔

کسی بزرگ کا فرمان ہے کہ اگر میں ترقی کرتے ہوئے لا مکان تک پہنچ جاؤں، اور پھر ایک لمحہ بھی کسی دوسری شئ میں مشغول ہو جاؤں تو میں عقلمند نہیں کہلا سکتا۔

ابن فارض فرماتے ہیں:

قال لی حسن کل شئ تجلی　　　　بی تمل فقلت قصدی وراک

حسن نے کہا ہر شی کا ظہور مجھ سے ہے، تھوڑی دیر مجھ سے لطف اندوز ہو، میں نے کہا میرا مقصود تجھ سے آگے ہے۔

مخلوق کے حسن کی طرف متوجہ ہونا اور وہاں ٹھہرنا اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔[1]

ماسوی اللہ کی طرف متوجہ ہونے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے کسی بزرگ نے فرمایا:

و مهماتری کل المراتب تجتلی　　　　علیک فحل عنها فعن مثلها حلنا

جو مراتب بھی تجھ پر ظاہر ہوں تو ان سے آگے گزر جا، ہم بھی اس قسم کے مراتب سے گزر کر آئے ہیں۔

ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ سالک کی ہمت جب مکاشفہ پر اکتفا کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو غیب سے ندا آتی ہے کہ اے سالک! تیرا مقصود تو اس سے آگے ہے۔[2]

سالک کا ان مقامات کو طلب کرنا اس کے نفس کی پوشیدہ خواہش ہے کیونکہ وہ یا تو ان مقامات کو پالے گا اور اس پر مطمئن ہو کر اپنے اصل مقصد سے محجوب ہو جائے گا یا ان کو حاصل نہیں کر سکے گا مگر ان کے حصول کو اپنا مقصد اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ بنالے گا۔ پھر ان کے حصول کیلئے محنت کرے گا، اور جب ان تک نہ پہنچ سکے گا تو اس کا عزم کمزور اور وہ خود مایوس ہو جائے گا۔ اس وقت وہ الٹے پاؤں پستی کی طرف لوٹے گا۔ ہاں اگر کسی مرشد کامل کی توجہ میسر آجائے تو اس مشکل سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے ورنہ منزل مقصود سے دور ہی دور ہوتا چلا جائے گا۔

---

1 (خمرۃ الحان ورنۃ الألحان ص ۲۹)

2 (ایقاظ الھمم فی شرح الحکم ج ۱ ص ۵۱)

اخروی عوض طلب کرنے سے مراد جنت میں داخل ہونے اور نار جہنم سے نجات کی خواہش کرنا ہے۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے یقین ہو، جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا نہ کہ اس کے عمل سے۔

رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے مروی ہے:

"لن یدخل احدکم الجنة بعمله قالوا: ولا انت یارسول اللہ ﷺ قال: ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمته"۔

تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل سے جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی، آپ بھی نہیں یارسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فرمایا ہاں میں بھی نہیں مگر جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مجھ پر سایہ فگن ہو جائے۔[1]

سالک کو اپنے عمل پر عوض طلب کرنے سے یہی چیز بچا سکتی ہے کہ وہ یقین کرے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کے بغیر جنت میں داخل ہونے اور نارِ جہنم سے نجات کا مستحق نہیں۔ کیونکہ غلام اپنے آقا کی کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کی ساری عبادت، حق عبودیت کو ادا کرنے کیلئے ہیں۔ اور دنیا اور آخرت میں جو اسے اجر وثواب ملے گا وہ محض اس کا فضل واحسان ہے۔ اسی طرح عبادت کی توفیق بھی اسی کا فضل ہے۔ جب سالک جان لے گا کہ یہ توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ہے تو پھر اس کی نعمتوں کے شکر میں مصروف ہو جائے گا۔ اور اس طرح اپنے عمل پر عوض طلب کرنے سے بچ جائے گا۔

حجاب ثالث:

اپنے اعمال کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سے نجات کے دو طریقے ہیں۔

(ا) پہلا طریقہ: اپنے اعمال میں پائے جانے والے عیوب سے مطلع ہونا۔ کیونکہ بہت ہی قلیل اعمال ایسے ہوتے ہیں جو شیطان اور نفس کے حظ سے خالی ہوں۔ حظ شیطان کے بارے میں تو نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہماری راہنمائی فرمائی ہے۔ جب آپ سے نماز میں ادھر ادھر متوجہ ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا! بندہ کی نماز کا یہ وہ حصہ ہے جو شیطان اس کی نماز سے چھین لیتا ہے۔[2]

ابن قیم نے کہا کہ جب نماز میں ایک لمحہ کے التفات کا یہ حال ہے تو دل کے ماسوی اللہ کی طرف التفات کرنے کا کیا حال ہو گا، یعنی اس میں تو حظ شیطان اس سے بھی بڑھ کر ہے۔[3]

---

[1] (رواہ البخاری کتاب المرضیٰ، مسلم کتاب صفات المنافقین)

[2] (رواہ البخاری فی کتاب أبواب صفة الصلاة عن عائشة رضی اللہ عنھا والترمذی فی کتاب أبواب الصلاة وقال: حسن صحیح)

[3] (مدارج السالکین ج ۲ ص ۵۱)

جہاں تک حظ نفس کا تعلق ہے تو اس کو اہلِ بصیرت اور عرافین ہی جان سکتے ہیں۔

(۲): دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ سالک حقوق عبودیت اور اس کے ظاہری و باطنی آداب اور شرائط کی معرفت حاصل کرے، دن رات عبادت میں مشغول ہونے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسرِ نفسی کا اظہار کرے۔ ایک عاجز اور ضعیف بندہ خالقِ کائنات کی عبودیت کے حقوق کماحقہ کیسے ادا کر سکتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقصیر کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَمَاقَدَرُوااللّٰہ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ (زمر:٦٧)

اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اخلاص، عمل کو علل واسباب اور آلودگیوں سے پاک کرنے کا نام ہے خواہ ان اشیاء کا تعلق مخلوق سے ہو جیسے مخلوق کی مدح وتعریف کو پسند کرنا اور ان کی مذمت سے خوف کھانا۔ یا اس کا تعلق عمل سے ہو۔ جیسے اپنے عمل کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہو جانا اور اس کے بدلے میں عوض طلب کرنا وغیرہ۔

اسی وجہ سے بلند ہمت عارفین اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کر دیتے ہیں اور اپنے دلوں میں جب اللہ تعالیٰ کی یہ ندا ''ففروا الی اللہ'' پاتے ہیں، تو اس پر لبیک کہتے ہوئے اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں، جیسا کہ کسی بزرگ کا فرمان ہے! اے مولا! میں تمام لوگوں کو پیچھے چھوڑ کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔

صبر

علمائے کرام نے صبر کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ترین تین تعریفیں ہیں:

(۱): حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صبر احکامِ الٰہیہ کی مخالفت سے دور ہونے، مصیبت کے رنج والم سہتے ہوئے پر سکون ہونے اور حالت فقر میں غنا کے ظاہر کرنے کا نام ہے۔

(۲): امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ نفس کو پابند کیا جائے اس چیز پر جس کا تقاضا عقل یا شرع کرتی ہے۔ یا صبر، نفس کو ہر اس چیز سے روکنے کا نام ہے جس سے رکنے کا تقاضا عقل یا شرع کرتی ہے۔

(۳): سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ غیر اللہ سے مصائب کی تکلیف کا شکوہ نہ کرنے کا نام صبر ہے۔ اس تعریف سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکوہ صبر کے منافی نہیں بلکہ غیر اللہ سے شکایت صبر کے منافی ہے۔[1]

کسی بزرگ نے دیکھا کہ کوئی شخص اپنے فاقے اور حاجت کی شکایت کسی دوسرے شخص سے کر رہا ہے تو فرمایا: اے شخص تو اس ذات کی شکایت کر رہا ہے جو تجھ پر رحم کرنے والی ہے ایسے شخص سے جو تجھ پر رحم نہیں کرنے والا ہے۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

و اذا عرتک بلیة فاصبر لھا　　صبر الکریم فانہ بک اعلم

و اذا شکوت الی ابن آدم انما　　تشکو الرحیم الی الذی لا یرحم

جب تجھ پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس پر کریم لوگوں کی طرح صبر کر کیونکہ اللہ تجھ سے بہتر جانتا ہے، اور جب تو ابنِ آدم سے شکوہ کرے گا تو تو رحیم کا شکوہ کرے گا اس سے جو رحم کرنا نہیں جانتا۔

صبر کی اقسام:

علمائے کرام نے صبر کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ لیکن ان تمام تعریفوں کا مرجع درج ذیل تین تعریفات ہیں۔

(۱): "الصبر علی الطاعۃ"۔

یعنی طاعت پر صبر کرنا۔

اور اس سے مراد شریعت پر استقامت، مالی، بدنی اور قلبی عبادات پر دائمی پابندی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر دوام اختیار کرنا ہے۔ اور اس ضمن میں پیش آنے والے مصائب و مشکلات پر صبر کرنا ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کا نائب ہونے کی حیثیت سے دین کی تبلیغ اور جہاد کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کیلئے اس قسم کے مصائب و مشکلات کا پیش آنا ضروری ہے۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ" (لقمان:۱۷)

اے بیٹے نماز قائم کرو نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمھیں پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قسم اٹھائی ہے کہ چار صفات کے حاملین ہی نجات پانے والے ہیں۔ (۱): ایمان۔ (۲): عمل صالح۔ (۳): امت کو نصیحت کرنا۔ (۴): صبر کرنا۔

---

[1] (شرح ریاض الصالحین لابن علان ج ۱ ص ۱۹۴)

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالْعَصْرِ (۱) إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (۲) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر ۳)

قسم ہے زمانہ کی، یقیناً انسان خسارہ میں ہے بجز ان خوش نصیبوں کے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے نیز ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے رہے۔

(۲): "الصبر عن المعاصی"۔

گناہوں سے صبر کرنا۔

اس سے مراد نفس کی خواہشات سے مجاہدہ اور اس کی بے راہ روی کا مقابلہ اور اس کی کجی کی اصلاح اور شر اور فساد کے ان اسباب کا قلع قمع کرنا ہے جن کو شیطان مشتعل کرتا ہے۔ جب انسان اپنے نفس کا مجاہدہ کر کے اس کو پاک کر دیتا ہے۔ اور اس کو اس کی گمراہیوں سے روک دیتا ہے۔ تو وہ ہدایت کاملہ تک پہنچ جاتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط" (عنکبوت: ۶۹)

"اور جو مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کیلئے ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے۔"

اور پھر اس کا شمار مفلحین (کامیاب لوگوں) میں ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱۴) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ: ۱۵)

"بے شک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی۔"

ارشاد ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۴۰) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (نازعات: ۴۱)

ترجمہ: "اور جو ڈرتا ہو گا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور اپنے نفس کو روکتا رہا ہو گا ہر بری خواہش سے، یقینا جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔"

(۳): "الصبر علی المصائب"۔

مصیبتوں پر صبر کرنا۔

کیونکہ یہ دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف قسم کے مصائب کے ذریعہ آزماتا ہے۔ اور خصوصًا مؤمنوں کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ مؤمن، منافق اور طیب اور خبیث کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الٓمّ (۱) أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْا أَنْ يَقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ o (عنکبوت: ۲)

"کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔"

برابر ہے کہ یہ مصائب نماز میں ہوں یا بدن میں یا اہل وعیال میں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ۔

"یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔"

ارشاد فرمایا:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ o الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ o أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ: ۱۵٦ تا ۱۵۷)

اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے تمہارے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنائیے ان صبر کرنے والوں کو جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت تو کہتے ہیں بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔)

بے شک مؤمنِ صادق ان مصائب کو صبر وتسلیم بلکہ رضا وخوشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے خالق کی طرف سے نازل کردہ مصائب اس کے گناہوں کا کفارہ اور اس کی سیئات کو مٹانے کا سبب ہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤمن کو جو تھکاوٹ، مرض، غم وحزن اور تکلیف حتیٰ کہ جو کانٹا بھی اسے چبھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔[1]

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب المرض، ومسلم عن أبی سعید وابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اسی طرح اسے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مصائب و مشکلات اللہ کے نزدیک صبر کرنے والے مؤمنوں کے درجات و منازل کو بلند کرتے ہیں، جب کہ وہ ان مصائب کو برضا و تسلیم قبول کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بندہ جب کسی منزل کو اپنے عمل کے ساتھ نہیں پا سکتا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جان، مال اور اہل کی آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر اس کو صبر کی توفیق عطا کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ اس منزل کو حاصل کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے۔ [1]

صبر کی فضیلت اور اہمیت:

صبر نصف ایمان ہے، انسان کی سعادت کا راز، آزمائش سے عافیت کا مصدر و منبع، مصائب و مشکلات سے بچنے کا ذریعہ اور مجاہدہ نفس کیلئے بہترین ہتھیار ہے۔ یہ نفس کو شرعی احکام پر استقامت اختیار کرنے پر ابھارتا ہے اور اس کو گمراہی اور فساد کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچاتا ہے اسی اہمیت اور بلند مرتبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ستر مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، کبھی تو اللہ تعالیٰ صبر کرنے کا حکم دیتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اسْتَعِيْنُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔ (اعراف:۱۲۸)

"اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔"

اور کہیں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰۗئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰۗئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝" (بقرہ:۱۷۷)

صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیز گار ہیں۔

اور کہیں خبر فرماتا ہے کہ وہ صابرین سے محبت کرتا ہے:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (آل عمران:۱۴۶)

اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور کہیں صابرین کیلئے اپنی معیت کو اختیار کرتا ہے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔

"اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

---

[1] (رواہ أبو داؤد فی سننه فی کتاب الجنائز باب الأمراض المکفرة للذنوب رقم ۳۰۷۴ عن محمد بن خالد السلمی رضی اللہ تعالیٰ عنه)

اور ایک مقام پر فرماتا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے اجر دے گا۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حَسَابٍ۔ (زمر: ۱۰)

"صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ہدایت دینے والے مرشدین نے یہ مقام صبر کی ہی بدولت حاصل کیا ہے:
وَ جَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ (سجدہ: ۲۴)

ترجمہ: اور ہم نے بنا دیا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ راہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے جب تک وہ صابر رہے۔

احادیثِ طیبہ میں بھی صبر کی فضیلت کو بڑے حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں یہ واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ زندگی کی مشکلات اور حوادث پر صبر کرنا مؤمن کی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ کی تمام زندگی صبر، جہاد اور قربانی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے مصائب و مشکلات میں صبر کر کے ہمارے لئے بہترین اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔

احادیثِ طیبہ:

۱) عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی ﷺ قال: ما اعطی احد من عطاء خیر او اوسع من الصبر۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! کہ صبر سے بہتر اور وسیع عطیہ کسی کو نہیں دیا گیا۔[1]

(۲): "وعن صھیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ عجبا لامر المؤمن ان امرہ کلہ لہ خیر ولیس ذلک لاحد الا للمؤمن ان اصابتہ سراء شکر فکان خیر الہ و ان اصابتہ ضراء صبر فکان خیر لہ"۔

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! کہ مؤمن کا معاملہ بھی قابلِ تعجب ہے۔ اس کا ہر معاملہ بھلائی پر مبنی ہے اور یہ سعادت صرف مؤمن کو ہی حاصل ہے۔ اگر اسے خوشحالی کی نعمت نصیب ہو تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور یہ اس کیلئے خیر ہے۔ اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کیلئے خیر ہے۔[2]

(۳): "قال رسول اللہ ﷺ المسلم الذی یخالط الناس و یصبر علی اذاھم خیر من الذی لا یخالطھم و لا یصبر علی اذاھم"۔

[1] (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

[2] (رواہ مسلم فی کتاب الزھد و الرقاق)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہتا اور ان کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا۔[1]

(۴): حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نبی کا واقعہ بیان کیا کہ ان کی قوم نے انہیں مار مار کر لہولہان کر دیا وہ اپنے منہ سے خون صاف کرتے اور فرماتے!"اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون" یعنی اے اللہ! میری قوم کو معاف فرمادے یہ مجھے نہیں جانتے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب بھی نبی کریم ﷺ کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔[2]

(۵): حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اذیت پر صبر کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ اس کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور اس کیلئے بیٹا بنا دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی انہیں معاف فرمادیتا ہے اور انہیں رزق دیتا ہے۔[3]

صالحین کا صبر کو اختیار کرنا اور اس کی دعوت دینا:

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ہے اور انہیں صبر نبی کریم ﷺ سے وراثت میں ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی اشاعت میں سر توڑ کوشش کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے ایمان سے نوازا جس میں مایوسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور ایسا عزم و حوصلہ اور ثابت قدمی عطا فرمائی جس میں ضعف اور کمزوری نہ تھی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تابعین نے روحانی فیض حاصل کیا۔ اور پھر اسی طرح یہ فیض مختلف ادوار طے کرتا ہوا ہم تک پہنچا۔

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"لا یزال طائفۃ من امتی ظاھرین حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون"۔

میری امت کا ایک گروہ حق پر غالب رہے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے گا اور وہ غالب ہی ہوں گے۔[4]

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب بیٹا وفات پا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرنے کا ارادہ فرمایا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ایسی محبت سے جو اللہ کے ارادہ کے مخالف ہو۔

---

[1] (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ)
[2] (بخاری فی صحیح، کتاب أحادیث الأنبیاء، و مسلم فی کتاب الجھاد و السیرۃ)
[3] (صحیح بخاری، کتاب التوحید، و صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین و أحکامھم)
[4] (بخاری فی صحیح، کتاب الاعتصام، و مسلم عن مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

صبر کے بارے میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔ آپ ایک دن حدیث پاک کا درس دے رہے تھے کہ آپ کو بچھونے سولہ بار ڈنگ مارا جس کی وجہ سے آپ کا رنگ متغیر ہو گیا لیکن آپ نے حدیث پاک کی تعظیم کی وجہ سے اپنی کلام کو قطع نہ کیا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مریض کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ دورانِ گفتگو اس مریض کی چیخ نکلی تو حضرت ذوالنون نے فرمایا:

"لیس بصادق فی حبہ من لم یصبر علی ضربہ" (جو اس کی ضرب پر صبر نہ کرے وہ محب صادق نہیں)۔ تو اس مریض نے جواب دیا۔ "بل، لیس بصادق فی حبہ من لم یتلذذ بضربہ" (بلکہ جو اس کی ضرب سے لطف اندوز نہ ہو وہ محب صادق نہیں)۔ [1]

ابن شبرمہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی تو فرماتے، یہ تو بادل ہے تھوڑی دیر بعد چھٹ جائے گا۔

صبر کے بارے میں صوفیائے کرام نے بڑی عمدہ اور تعجب خیز کلام فرمائی ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے صبر کے متعلق پوچھا گیا۔

تو آپ نے فرمایا:

صابر الصبر فاستغاث بہ الصبر　　　　فصاح المحب بالصبر صبرا

وہ صبر پر غالب آگیا اور صبر نے اس سے مدد کی درخواست کی تو محب نے صبر سے کہا صبر کرو۔

صوفیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے عظیم محاسن اور خوبیوں سے نوازا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے صبر کے سائے میں اللہ تعالیٰ کی بھرپور خوشنودی حاصل کی، اور ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے:

"اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" (بقرہ: ۱۵۶)

جو کہ جب پہنچے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ان کا صبر اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا ہے اور وہ اسی کی بارگاہ میں رجوع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ انہیں ان کا پروردگار بغیر حساب وکتاب کے اجر وثواب عطا فرمائے۔ اور صابرین کیلئے اجر بھی کیا خوب ہے!

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ" (بقرہ: ۱۵۷)

---

[1] (بخاری فی صحیح، کتاب الاعتصام، و مسلم عن مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے۔
رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات صبر میں صوفیائے کرام کیلئے بہترین نمونہ ہے۔ آپ جب بھی کسی آزمائش سے گزرتے آپ کے صبر اور ثابت قدمی میں مزید اضافہ ہو جاتا کیونکہ یہی انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔
جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" (احقاف:۳۵)
پس اے محبوب آپ صبر کیجئے جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔
اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو دین کی دعوت میں مشکلات برداشت کرنے اور مشرکین کی اذیتوں پر صبر کرنے کا حکم فرمایا۔
ارشاد فرمایا:
وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (نحل:۱۲۷)
"اور آپ صبر فرمایئے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ کی توفیق سے اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان پر اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں پر۔"

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ صبر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صفت اصفیاء کا زیور نیکیوں کی کلید اور قربِ الٰہی کا راستہ ہے۔ سالک کسی مرحلہ میں بھی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر مقام کیلئے صبر ہوتا ہے جو اس کے مناسب ہوتا ہے۔
ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:
"الصبر حبس القلب علی حکم الرب"
صبر پروردگار کے حکم پر دل کو پابند کرنے کا نام ہے۔
عام لوگوں کا صبر احکامِ الٰہیہ کی مخالفت کو ترک کرنا اور طاعت کی مشقوں پر دل کو پابند کرنا ہے۔ اور خاص لوگوں کا صبر، مجاہدہ اور ریاضت پر نفس کو پابند کرنا اور حجابات کو اٹھانے کا مطالبہ کرنا اور دائمی حضور میں مراقبہ قلب کے ساتھ راہ سلوک کے مصائب کو برداشت کرنا ہے۔

خاص الخواص کا صبر، مشاہدہ حق میں روح اور سر کو پابند کرنے کا نام ہے یا حریم ناز میں حاضری اور دائمی دیدار پر روح کو پابند کرنے کا نام ہے۔ (معراج التشوف إلی حقائق التصوف ص ٦)[1]

صدق، اخلاص اور صبر یہ تینوں صفات راہِ سلوک کے بنیادی ارکان ہیں۔ اور جس شخص نے اپنے سلوک کی بنیاد ان صفات پر نہ رکھی وہ اس قافلہ کے ساتھ ہے جو راستہ میں ہی رک جاتا ہے اگرچہ وہ اپنے گمان کے مطابق منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔

اخلاص کی حقیقت توحید مطلوب ہے جس طرح کہ صدق کی حقیقت توحید طلب ہے۔ اور ان چیزوں پر صبر کرنا عین کمال ہے۔

ورع

ورع کی تعریف اور اس کے مراتب:

سید جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ھو اجتناب الشبھات خوفا من الوقوع فی المحرمات۔

"محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے شبہات سے اجتناب کرنا ورع کہلاتا ہے۔"[2]

علامہ محمد بن علان صدیقی فرماتے ہیں کہ ایسی چیز کو ترک کر دینا جس میں کوئی حرج نہ ہو، اس چیز سے بچنے کیلئے جس میں حرج ہو، ورع کہلاتا ہے۔[3]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ورع سے مراد نفس کو ایسی چیز کے ارتکاب سے روکنا ہے جس کا انجام ناپسندیدہ ہو۔[4]

ورع کی وضاحت کیلئے ہم اس کے وہ مراتب بیان کرتے ہیں جن کو حاصل کرنے کیلئے سالک کوشاں رہتا ہے۔

---

[1] (اللمع للسیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۷۷)

[2] (تعریفات السید ص ۱۷۰)

[3] (دلیل الفالحین شرح ریاض الصالحین ج ۵ ص ۲٦)

[4] (معراج التشوف ص ۷)

عوام کا ورع:

شبہات کو ترک کر دینا ہے تاکہ وہ احکامِ الٰہیہ کی مخالفت میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہات سے بچا، اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو شبہات میں واقع ہوا وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے اس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے ارد گرد اپنے جانور چراتا ہے ممکن ہے کہ وہ اس چراگاہ میں چرنے لگیں۔ خبردار! بے شک ہر بادشاہ کیلئے خاص چراگاہ ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کے محارم ہیں۔[1]

خواص کا ورع:

ہر اس چیز کو ترک کر دینا ہے جو دل کو مکدر کرے۔ اور اس کی پریشانی کا باعث ہو۔ یہ لوگ دل میں کھٹکنے والے خواطر اور سینے میں پیدا ہونے والے وساوس سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ ان کے دل اتنے پاکیزہ اور صاف ہوتے ہیں کہ جب بھی وہ کسی امر میں متردد ہوتے ہیں یا کسی حکم کے بارے میں شک میں مبتلا ہوتے ہیں تو یہ انہیں فوراً تنبیہ کر دیتے ہیں۔

اور اسی کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے کہ اس چیز کو ترک کر دو جو تمہیں شک میں ڈال دے اور اس کو اختیار کرو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے۔[2]

مزید ارشاد فرمایا:

البر حسن الخلق و الاثم ما حاک فی نفسک و کرھت ان یطلع علیه الناس۔

یعنی "نیکی حسنِ خلق کا نام ہے اور گناہ وہ چیز ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔"[3]

اسی کے بارے میں حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ما رأیت اسھل من الورع ما حاک فی نفسک فاترکه"۔

یعنی "میں نے ورع سے آسان ترین چیز نہیں دیکھی پس جو چیز تمہارے دل میں کھٹکے اسے ترک کر دو۔"[4]

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحه فی کتاب الإیمان و مسلم فی کتاب المساقاۃ عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنهما)

[2] (رواہ الترمذی فی کتاب صفة القیامة و قال حدیث حسن صحیح)

[3] (رواہ مسلم فی کتاب البر و الصلة عن النواس بن سمعان رضی اللہ عنه۔ حاک: أی جال و تردد)

[4] (رسالہ قشیریہ ص ۵۴)

خاص الخواص کا ورع:

یہ ہے کہ وہ غیر اللہ سے تعلق منقطع کر لیتے ہیں اور غیر سے طمع ولالچ کا دروازہ بند کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ ان عارفین کا ورع ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر شے جو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہ بد بختی کی علامت ہے۔

شیخ شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ورع یہ ہے تو اللہ کے سوا ہر چیز سے کنارہ کش ہو جائے۔[1]

ورع کی فضیلت:

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ورع تمام صفات کمالیہ کیلئے جامع صفت ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکہ شریف میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولادِ اطہار میں سے ایک نوجوان کعبہ شریف سے ٹیک لگائے وعظ کر رہا تھا۔ آپ اسی مجلس میں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ دینِ اسلام کا خلاصہ اور جوہر کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ پھر سوال کیا کہ دین میں آفت کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، طمع۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس جواب سے بڑے متعجب ہوئے اور فرمایا، ایک ذرہ ورع ہزار ہا نماز روزے سے بہتر ہے۔[2]

حضرت ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ کے فہم پر اس کا کثیر علم اور اپنے اوراد پر ہمیشگی دلالت نہیں کرتے بلکہ اس کے فہم اور نورِ قلب پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ غیر سے مستغنی ہو جائے اور اس کا دل اسی کی طرف مائل ہو اور حرص وخواہش کی غلامی سے آزاد ہو اور ورع کے زیور سے آراستہ ہو۔[3]

ورع کی عظمت اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کو عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ قرار دیا ہے۔ آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوہریرہ! صاحبِ ورع بن جا، تو تمام لوگوں سے زیادہ عبادت گزار بن جائے گا۔[4]

یہی وجہ ہے کہ ورع اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس سے حصول فیض کا راستہ ہے جس طرح کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو ورع کی باریکیوں میں غور وفکر نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی عطائے عظیم تک نہیں پہنچ سکتا۔[5]

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۵۴)
[2] (رسالہ قشیریہ ص ۵۴)
[3] (معراج تصوف ص ۷)
[4] (رواہ ابن ماجہ عن أبی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی کتاب الزھد باب الورع والتقوی بإسناد حسن)
[5] (رسالہ قشیریہ ص ۵۴)

ورع کی اہمیت، بلند رتبہ، رفعتِ شان اور اس کے عظیم آثار کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے کثیر احادیث میں اس کی طرف اشارہ فرمایاہے۔ان میں بعض احادیث یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱) ”عن عطية بن عروة السعدی الصحابی رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين، حتیٰ يدع مالا بأس به حذر اًمما به بأس۔“

”حضرت عطیہ بن عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ متقین کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا حتیٰ کہ ناقابل اعتراض چیز کو ترک کر دے قابل اعتراض چیز سے بچنے کیلئے۔“[1]

۲) عن حذيفة بن يمان رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ فضل العلم خير من فضل العبادة و خير دينكم الورع۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علم کی فضیلت، عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے اور تمہارے دین میں بہترین چیز ورع ہے۔[2]

۳) عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ ثلاث من كن فيه استوجب الثواب و استكمل الايمان خلق يعيش به فی الناس و ورع يحجزه عن محارم الله و حلم يرده به جهل الجاهل۔

”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تین چیزیں جس میں پائی جائیں وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور اس نے ایمان کو مکمل کر لیا: ایسا اخلاق جس کے ساتھ لوگوں میں زندگی گزارے، ایسا ورع جو اس کو اللہ تعالیٰ کے محارم سے روک دے، اور ایسا علم جس سے جاہل کی جہالت کو روک دے۔“[3]

۴) عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه وجد تمره فی الطريق فقال لو لا انی اخاف ان تكون من الصدقة لا كلتها۔

”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے راستہ میں پڑی ہوئی ایک کھجور پائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ صدقے کی ہے تو میں اسے کھالیتا۔“[4]

۵) عن أبی هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: أخذ الحسن بن علی رضی اللہ عنهما تمرة من تمر الصدقة، فجعلها فی فيه۔ فقال النبی ﷺ: كخ كخ ارم بها أما علمت انا لا نأكل الصدقة، أو انا لا تحل لنا الصدقة۔

---

[1] (رواه الترمذی فی كتاب صفة القيامة، وقال: حديث حسن غريب)
[2] (رواه طبرانی فی الأوسط والبزار بإسناد حسن)
[3] (رواه البزار كما فی الترغيب والترهيب)
[4] (صحيح بخاری كتاب الزكاة، مسلم كتاب الزكاة)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لی اور اسے اپنے منہ میں ڈال لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسے منہ سے نکال اور پھینک دو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے، یا یہ فرمایا، کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں۔"[1]

صوفیائے کرام کو جب ہم ورع کے اعلیٰ مراتب پر متمکن دیکھتے ہیں تو صحابہ کرام اور تابعین عظام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑا سا کھانا کھالیا جو ان کے غلام نے پیش کیا تھا پھر جب غلام نے بتایا کہ اس کھانے میں شبہ تھا تو آپ نے اپنے ہاتھ کو منہ میں ڈالا اور قے کر کے پیٹ کو صاف کر دیا۔[2]

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم ستر حلال اشیاء کو چھوڑ دیا کرتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہم کسی حرام چیز میں نہ پڑ جائیں۔[3]

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں جب مالِ غنیمت میں کستوری پیش کی گئی تو آپ نے اپنے ناک کو ہاتھ سے بند کر دیا اور فرمایا کہ اس کی خوشبو سے ہی نفع حاصل کیا جاتا ہے اور میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ میں مسلمانوں کے بغیر اس کی خوشبو سے نفع حاصل کروں۔[4]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے کچھ اونٹ خریدے اور ان کو بیت المال کی چراگاہ میں بھیج دیا۔ جب وہ اونٹ موٹے ہو گئے تو ان کو بیچنے کیلئے واپس منگوالیا۔ ان ہی ایام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر بازار سے ہوا۔ جب انہوں نے یہ موٹے تازے اونٹ دیکھے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ اونٹ کس کے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ کے بیٹے عبد اللہ کے۔ تو آپ نے بیٹے سے پوچھا کہ یہ اونٹ کہاں سے آئے؟ تو انہوں نے عرض کی کہ یہ کمزور اونٹ میں نے خریدے تھے اور ان کو چراگاہ میں بھیج دیا اور ان کو میں نے کہا کہ یہ امیر المؤمنین کے بیٹے کے اونٹ ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرو اور کھلاؤ پلاؤ۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سنا تو آپ نے فرمایا: اے عبد اللہ ان کی اصل قیمت تم رکھ لو اور ان کا نفع مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرادو۔[5]

---

[1] (صحیح بخاری کتاب الزکاۃ، مسلم کتاب الزکاۃ)

[2] (رواہ البخاری فی صحیح باب ایام الجاھلیۃ)

[3] (رسالہ قشیریہ ص ۵۳)

[4] (رسالہ قشیریہ، ص ۵۵)

[5] (الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۴۷)

حضرت حذیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی کسی کو کسی صوبے کا گورنر مقرر کرتے تو اس سے ایک عہد نامہ لکھوا لیتے اور اس پر لوگوں کو گواہ بنا لیتے۔ اور اس پر یہ شرط لگاتے کہ وہ خچر پر سوار نہیں ہو گا اور نہ ہی چھانا ہوا آٹا کھائے گا۔ اور نہ ہی باریک لباس پہنے گا اور ضرورت مند کیلئے اپنے دروازے کو بند نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو سزا کا مستحق ہو گا۔[1]

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ روزمرہ کے خرچہ سے کچھ پیسے حلوہ خریدنے کیلئے بچاتی رہیں۔ پھر جب کچھ پیسے جمع ہو گئے تو انہوں نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حلوہ خریدنے کیلئے کہا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ یہ حلوہ کیلئے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے تو انہوں نے عرض کی کہ میں روزانہ کے خرچہ سے کچھ پیسے بچاتی رہی۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ان کو بیت المال میں جمع کرا دو کیونکہ یہ تمہاری ضرورت سے زائد ہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ حال تھا کہ خود بھوکے رہتے تاکہ آپ کی رعایا پیٹ بھر لے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک خادم وضو کیلئے گرم پانی کا ایک کوزہ پیش کیا کرتا تھا۔ ایک دن آپ نے خادم کو فرمایا کہیں یہ پانی تم بیت المال کے مطبخ سے تو گرم نہیں کرتے۔ اس نے عرض کی جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ بہت برا کیا۔ پھر اپنے غلام مزاحم کو حکم دیا کہ وہ اس کوزے کو گرم کرے اور پھر دیکھے کہ اس میں کتنی لکڑیاں صرف ہوتی ہیں۔ پھر گزشتہ ایام کا حساب لگا کر لکڑیوں کو بیت المال کے مطبخ میں جمع کرائے۔[2]

علامہ مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خراسان سے شام محض اس لئے واپس آئے تاکہ ادھار لیا ہوا قلم واپس کریں۔ اس کے بعد آپ صوفیائے کرام کے ورع کے متعلق مختلف واقعات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر تم سعادت اور خوش بختی کے طالب ہو، تو ان لوگوں کی اتباع کرو۔[3]

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو کسی نے کھانے کی دعوت پر مدعو کیا۔ جب کھانا آپ کے سامنے رکھا گیا تو آپ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو وہ کھانے کی طرف نہ بڑھ سکا۔ آپ نے تین دفعہ کوشش کی لیکن تینوں دفعہ آپ کا ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھ سکا۔ وہاں آپ کو جاننے والا ایک شخص موجود تھا۔ اس نے یہ کہا کہ آپ کا ہاتھ حرام کھانے اور ایسے کھانے کی طرف نہیں بڑھتا جس میں شبہ ہو۔[4]

---

[1] (البداية والنهاية لإبن كثير ج ۷ ص ۳۴)
[2] (سيرة عمر بن عبدالعزيز، ص ۳۷)
[3] (فيض القدير شرح الجامع الصغير ج ۵ ص ۵۲)
[4] (اللمع للطوسی ص ۷۱)

صوفیائے کرام ورع میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی اتباع کرتے ہیں۔ اور یہ ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور اس کے دین پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے۔ اور اسی طرح یہ ان کے شدید خوف کا نتیجہ ہے کہ کہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت میں مبتلا نہ ہو جائیں کیونکہ جو شخص ایمان کا ذائقہ چکھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تقویٰ سے نوازتا ہے۔ اور جس شخص کو تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے وہ شبہات سے احتراز کرتا ہے اور ہمیشہ اللہ سے خائف اور اس کے فضل واحسان کا امیدوار رہتا ہے جس طرح کہ حضرت شاہ کرمانی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کی علامت ورع ہے اور ورع کی علامت شبہات سے اجتناب کرنا ہے۔ خوف کی علامت حزن ہے اور رجاء کی علامت حسن طاعت۔[1]

اے قاری! محنت کر تاکہ تو بھی باہمت لوگوں کے ساتھ مل جائے اور ان کی سنگت اختیار کر تاکہ تو بھی ان کی مثل ہو جائے۔ کیونکہ جو کسی کی سنگت اختیار کرتا ہے وہ اسی کی مثل ہو جاتا ہے۔

زہد

تعریف:

حضرت ابن جلاء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد دنیا کو زوال کی نظر سے دیکھنے کا نام ہے تاکہ دنیا تیری نظر میں حقیر ہو جائے اور اس سے اعراض کرنا تیرے لئے آسان ہو جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زہد دنیا سے بلا تکلف کنارہ کشی کرنے کا نام ہے۔[2]

امام جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"الزھد استصغار الدنیا و محو آثارھا من القلب۔"

زہد دنیا کو حقیر جاننے اور دل سے اس کے اثرات کو مٹانے کا نام ہے۔[3]

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنے کا نام ہے۔ نہ کہ صرف ہاتھوں کو خالی کرنے کا نام ہے۔ اور یہ عارفین کا زہد ہے۔ اور اس سے اعلیٰ مرتبہ مقربین کے زہد کا ہے کیونکہ یہ لوگ ماسوی اللہ ہر چیز حتیٰ کہ جنت وغیرہ سے بھی زہد اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ صرف اللہ تعالیٰ کے قرب اور وصال کے متمنی ہوتے ہیں۔[4]

---

[1] (طبقات الصوفیۃ للسلمی ص ۱۹۳)

[2] (رسالہ قشیریہ، ص ۵٦)

[3] (رسالہ قشیریہ ص ۵٦)

[4] (الفتوحات الوھبیۃ بشرح الأربعین حدیث النوویۃ للشیخ إبراھیم الشبرخیتی)

پس زہد دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنے اور اسے اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت سے بھر دینے کا نام ہے۔ دل دنیا کے مشاغل اور اس کی زیب و آرائش سے جتنا خالی ہو گا اتنی ہی دل میں اس کی محبت اور معرفت زیادہ ہو گی اسی وجہ سے عارفین نے زہد کو قرب و وصال کا وسیلہ اور اس کی محبت و رضاء کے حصول کی شرط قرار دیا ہے۔ زہد وسیلہ اور شرط تو ہے لیکن وہ بالذاب غایت مقصودہ نہیں۔

زہد کا شرعی ثبوت:

بعض لوگوں نے اسلام میں زہد کے وجود کی قطعًا نفی کر دی ہے اور انہوں نے زہد کو بدعت اور دین میں اجنبی چیز قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دین میں نصرانی رہبانیت اور عجمی لوگوں کی پوجا پاٹ کے ذریعے سے داخل ہوا ہے۔ اس میں قطعًا شک نہیں کہ ان کا نقطۂ نظر حقیقت اسلام سے جہالت کی بنا پر ہے۔ کیونکہ اگر یہ منکرین احادیثِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے صراحتًا زہد کی دعوت دی ہے اور اسے محبتِ الٰہی کے حصول کیلئے وسیلہ قرار دیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

یا رسول اللہ ﷺ! دلنی علی عمل اذا عملته احبنی اللہ و احبنی الناس قال له ازهد فی الدنیا یحبک اللہ و ازهد فیما فی ایدی الناس یحبوک۔

یعنی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے کہ جب میں اسے کروں تو اللہ تعالیٰ اور لوگ مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”دنیا سے زہد اختیار کر، تو اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرے گا۔ اور جو کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اس سے زہد اختیار کرے گا تو لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔“[1]

اس کے علاوہ جب مؤمن قرآن پاک کی آیات میں غور و فکر کرتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کون کونسی آیات ہیں جو دنیا کی شان کی حقارت کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں اور اس کے جلد زوال پذیر ہونے اور اس کی نعمتوں کے عارضی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ یہ دنیادار غرور اور غافلین کیلئے فتنہ ہے۔

دنیا کی یہ تمام صفات بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ لوگ دلوں سے اس کی محبت کو نکال دیں تاکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دینی احکام کو سرانجام دینے میں حائل نہ ہو۔

[1] (رواه ابن ماجه فی کتاب الزهد)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): "یٰاَیُّھَا النَّاس اِنَّ وَعْدَ اللہ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَ لَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللہِ الْغَرُوْر (فاطر:۵)

"اے لوگو! یقینا اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس دھوکہ میں نہ ڈال دے تمہیں یہ دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کر دے تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریبی۔"

(۲): وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَّ لَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (عنکبوت:۶۴)

"اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر لہو ولعب۔ اور دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت نہیں) کاش! وہ اس حقیقت کو جانتے۔"

(۳): اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ الْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا (کھف:۴۶)

"مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں اور (در حقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے۔"

اور اسی طرح دیگر کثیر آیات اسی معنیٰ ومفہوم کو بیان کرتی ہیں کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے صحابہؓ کرام کو دنیا سے کنارہ کشی اور اس کی زیب وآرائش سے منہ موڑنے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ دنیا کی شان کی حقارت اور اس کی فتنہ انگیزیوں کو واضح کرتے ہیں۔ اور اس سے آپ کا مقصود یہی ہے کہ دنیا انہیں ان کے مقصودِ حقیقی جس کیلئے ان کی تخلیق ہوئی ہے سے غافل نہ کر دے۔ اور ان کو اس عظیم مقدس پیغام سے دور نہ کر دے جس کی نشر واشاعت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر پڑنے والی ہے۔ اس لئے آپ ان پر واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ہمارے لئے امتحان اور آزمائش بنایا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم اس کی رضا کے حصول کیلئے اعمال سر انجام دیتے ہیں یا اس کے بر خلاف۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

ان الدنیا حلوۃ خضرۃ و ان اللہ تعالی مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون فاتقوا الدنیا و اتقوا النساء۔

"بے شک دنیا میٹھی اور سرسبز وشاداب ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں نائب بنایا ہے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔"[1]

[1] (أخرجه مسلم فی کتاب الذکر و الدعاء)

کبھی آپ اپنے صحابہ کرام کو یہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ڈھلتی چھاؤں اور عارضی ٹھکانہ ہے تا کہ وہ اس دنیا کی طرف مائل نہ ہو جائیں اور وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ سے دور کر دے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ اقدس کو میرے کندھے پر رکھا اور ارشاد فرمایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔

"دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم پردیسی ہو یا مسافر"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی وضاحت میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کر اور جب صبح کرے تو شام کا انتظار نہ کر، اپنی صحت کی حالت میں حالتِ مرض کیلئے اور زندگی میں موت کیلئے کچھ عمل کرلے۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چٹائی پر استراحت فرمائی، جب آپ بیدار ہوئے تو آپ کے پہلو مبارک پر چٹائی کے نشان واضح تھے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ! اگر آپ اجازت دیں تو آپ کیلئے نرم بچھونا تیار کرلیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:

و مالی و للدنیا ما انا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرة ثم راح و ترکھا۔

میرا اس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ میں دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے کے نیچے آرام کرتا ہے اور پھر کوچ کر جاتا ہے۔ اور اس کو وہیں چھوڑ جاتا ہے۔[2]

اور کبھی رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حقارت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں

لو کانت الدنیا تعدل عند اللہ جناح بعوضة ما سقی کافرا منھا شربة ماء۔

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی عطا نہ کرتا۔[3]

یہ وہ بہترین راہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ آپ کے خلفاء اور صحابہ کرام گامزن رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے دل دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور انہوں نے اس دنیا میں زہد کو اختیار کیا۔ ان کی زندگی میں فقر و فاقہ اور مصائب و آزمائش کے مراحل بھی آئے لیکن حکمِ الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے صبر و رضا کے پیکر بن گئے۔ پھر دنیا ذلیل ہو کر ان کی بارگاہ میں آ گئی۔ اور اپنے خزانوں اور ان کی چابیوں کو ان کے سامنے ڈال دیا لیکن انہوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا وسیلہ اور آخرت کا

---

[1] (أخرجه البخاری فی کتاب الرقاق)

[2] (أخرجه الترمذی فی کتاب الزهد وقال حدیث صحیح)

[3] (ترمذی فی کتاب الزهد عن سهل بن سعد الساعدی وقال: حدیث حسن صحیح)

ذریعہ بنا دیا۔ دنیا نے ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مشغول نہیں کیا اور ان کو تکبر غرور اور عیاشی یا بخل اور کنجوسی میں مبتلا نہیں کیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا تمام مال پیش کر دیا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:

"ماترکت لاھلک؟قال ترکت اللہ ورسولہ"۔

اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ عرض کی ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ آیا ہوں۔ [1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو اس میدان میں خاص مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے اور زہد میں آپ کا نام بطور ضرب المثل لیا جاتا ہے۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ ذات ہیں جنہوں نے جیشِ عسرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اپنے اموال کی پرواہ کئے بغیر اس کی راہ میں مال خرچ کیا۔ آپ کی اس قربانی ایثار اور دنیاوی مال سے بے رغبتی دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

ماضر عثمان ماعمل بعد الیوم۔

"آج کے بعد کوئی عمل بھی عثمان کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" [2]

سیرت کی کتب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے زہد کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ صرف چند واقعات ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین کپڑے نہ اپنے گھر میں استعمال کئے اور نہ گھر سے باہر۔ اور یہی حال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا۔ اور جب وہ احرام باندھتے تو ان کے پاس ایک تہبند اور ایک چادر ہوتی۔ اور شاید ان کی قیمت تمہاری ایک قمیض کے برابر ہو۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے کپڑوں کو پیوند لگائے اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی عبا کو کانٹوں سے سیا ہوا تھا۔ اور میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے جبہ کو چمڑے کا پیوند لگاتے تھے۔ حالانکہ وہ اس وقت امیر المؤمنین تھے۔ لیکن آج کل یہ دور ہے کہ

---

[1] (أبو داؤد فی کتاب الزکاۃ و الترمذی فی کتاب المناقب، و قال: حدیث حسن صحیح)
[2] (ترمذی، کتاب المناقب)

میں تم میں سے بہت سے اشخاص کو جانتا ہوں کہ وہ سو درہم انعام میں دے دیتے ہیں اور اگر میں ہزار کہوں تو یہ بھی مبالغہ نہ ہو گا۔[1]

حضرت حفصہ بنت خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی اے امیر المؤمنین! کاش آپ اپنے اس کپڑے سے نرم کپڑا پہنتے اور کاش اپنے اس کھانے سے عمدہ کھانا کھاتے اللہ تعالیٰ نے آپ کو رزق میں وسعت دی ہے۔ اور بہت مال عطا فرمایا ہے۔ تو آپ نے فرمایا تم خود ہی فیصلہ کرو کہ رسول اللہ ﷺ کتنی سخت زندگی گزارا کرتے تھے۔ آپ انہیں وہ حالات یاد کراتے رہے، حتیٰ کہ انہیں رلا دیا۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا، قسم بخدا! اگر میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی سخت زندگی گزری تو پھر شاید ان کی خوش حال زندگی کو پاسکوں گا۔[2]

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن خطبہ جمعہ کیلئے دیر سے تشریف لائے، تو پھر اپنی تاخیر کی معذرت کی۔ فرمایا میں اپنے ان کپڑوں کو دھونے میں مشغول ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی۔ آپ وہی کپڑے دھو کر پہن لیا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کے پاس دوسرے کپڑے نہ تھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حیات طیبہ وہ کامل عملی نمونہ ہے جس پر اولیائے کرام عمل پیرا ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ زہد، عفت، پاکیزگی اور استقامت میں اپنی مثال آپ تھے۔

زہد کا صحیح مفہوم:

زہد کی سابقہ تعریفات اور س کے شرعی جواز سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد ایک قلبی مرتبہ ہے۔ کیونکہ اس سے مراد دل سے دنیا کی محبت کو نکالنا ہے۔ اس حیثیت سے کہ زاہد اپنے دل کے ساتھ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور نہ ہی اس مقصد سے دور ہو جس کی خاطر اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ زہد کا یہ معنی نہیں ہے کہ مؤمن دنیا کو خیر باد کہہ کر مال سے اپنے ہاتھ کو خالی کر لے۔ اور کسبِ حلال کو ترک کر کے دوسروں پر بوجھ بن جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے زہد کے مقصودِ حقیقی کو واضح کیا ہے۔ جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں زہد حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے میں نہیں ہے بلکہ زہد یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس پر تیرا اور زیادہ یقین اور اعتماد ہو اس چیز سے جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ اور تو مصیبت کے ثواب میں زیادہ رغبت رکھنے والا ہو۔[4]

---

[1] (سیرت عمر ابن الخطاب، ص ۱۰۲)

[2] (سیرت عمر ابن الخطاب، ص ۱۰۴)

[3] (سیرۃ عمر بن خطاب، ص ۱۰۲)

[4] (أخرجه الترمذی فی کتاب الزهد عن أبی ذر رضی اللہ تعالیٰ عنه)

علامہ مناوی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مال سے مکمل اجتناب کرنا زہد نہیں کہلاتا۔ بلکہ زہد یہ ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا تیرے نزدیک دونوں برابر ہوں۔ اور تیرا دل مال کی طرف مائل نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ زاہدوں کے سردار ہونے کے باوجود گوشت، حلوہ اور شہد تناول فرماتے تھے۔ عورتیں، خوشبو اور اچھے کپڑے سے محبت فرماتے تھے۔ اس لئے اے سالک! اس پاکیزہ رزق کو بغیر اسراف اور تکبر کے استعمال کر۔ اور راہبوں کے زہد سے بچ۔[1]

اسی طرح صوفیائے کرام کی زہد کے بارے میں یہی رائے ہے کہ قلبی مرتبہ ہے۔

حضرت عمرو بن عثمان مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد کی بنیاد اور اساس دل میں ہے اور اس سے مراد دنیا کو حقیر جاننا اور قلب کی نظر کے ساتھ اسے دیکھنا ہے اور یہی زہد کی حقیقت اور اصل ہے۔[2]

غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زہد کے مفہوم کو بڑے جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

آپ نے فرمایا:

"اخرج الدنیا من قلبک دعها فی یدک او فی جیبک فانها لا تضرک"۔

"یعنی دنیا کو اپنے دل سے نکال دو اور اس کو اپنے ہاتھ یا جیب میں رکھ لو تو یہ تمھیں نقصان نہیں دے گی۔"[3]

کسی عارف نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے۔ زہد یہ نہیں کہ تو دنیا کو اپنے ہاتھ سے تو ترک کر دے لیکن وہ تیرے دل میں موجود رہے۔ بلکہ زہد یہ ہے کہ تو دنیا کو اپنے دل سے نکال دے۔ خواہ وہ تیرے ہاتھ میں موجود رہے۔

اسی وجہ سے ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے زہد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"ھو خلو القلب من التعلق بغیر الرب"۔

یعنی زہد رب کے علاوہ ہر تعلق سے دل کو خالی کرنے کا نام ہے۔[4]

امام زہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ زہد کا معنی بیان فرماتے ہیں کہ زہد حقیقی یہ ہے کہ تو رزق حلال پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور طلب حرام سے اپنے نفس کو روکے اس رزق پر قناعت کرتے ہوئے جو رب نے تیرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ جب آپ سے

---

[1] (فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی ج۴ ص ۷۲)
[2] (طبقات الصوفیۃ للسلمی ص ۲۰۳)
[3] (الفتح الرّبانی)
[4] (معراج التشوف ص۷)

مؤمن کے زہد کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا زہد یہ ہے کہ رزق حلال اس کے شکر پر غالب نہ ہو اور نہ ہی حرام اس کے صبر پر۔[1]

علمائے کرام نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ میں جو دنیا کی مذمت کی گئی ہے اس سے مقصود اس کی ذاتی مذمت نہیں ہے بلکہ یہ تو دل کو دنیا کے ساتھ لگا لینے سے بچانے کیلئے تنبیہہ و تحذیر کی گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مؤمن اس کو اپنا مقصودِ اصلی بنالے اور اپنے مقصودِ حقیقی یعنی رضائے الٰہی کو بھول جائے۔ وہ دنیا بہت اچھی ہے جو مؤمن کیلئے قربِ الٰہی کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ وہ دنیا کتنی بری ہے جس کی عبادت کی جائے۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ دنیا کی مذمت اس کی ذات کی وجہ سے نہیں کی جاتی کیونکہ یہ آخرت کی کھیتی ہے۔ جس نے شرعی قوانین کا لحاظ کرتے ہوئے دنیا سے کچھ اخذ کیا، تو یہ اس کی آخرت کیلئے معاون ہو گی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ دنیا کی طرف مائل نہ ہو کیونکہ اسے کسی پر ترس نہیں آتا۔ اور نہ ہی اس کو بالکل چھوڑ دو کیونکہ آخرت کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں۔[2]

زہد تک رسائی کا طریقہ:

چونکہ زہد ایک عظیم الشان قلبی مقام ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر مقام کو خالی کیا جاتا ہے، اس لئے اس تک رسائی حاصل کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کیلئے بڑی محنت اور وسائل کی ضرورت ہے۔ اور ان میں سب سے اہم مرشد کامل کی صحبت ہے جو سالک کو اس کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے اور اس کیلئے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے اور بڑی حکمت و دانائی سے اس کو ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے اور اس کے پاؤں کو پھسلنے سے بچاتا رہتا ہے۔

بعض لوگ اس سلسلہ میں خطا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے زہد کو اپنا مقصود اور غایت بنالیا۔ پیوند شدہ کپڑے پہنے ناقص غذا استعمال کی کسبِ حلال کو ترک کر دیا اور مالداروں پر حسد کرنے لگے حالانکہ ان کے اپنے دل دنیا کی محبت سے لبریز تھے۔ اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ایسا کرنے سے زاہد بن گئے اور اس خطا میں واقع ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بغیر مرشد کامل کی صحبت کے اس راہ پر نکلے تھے۔ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں امام مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد، دل کو دنیاوی محبت سے خالی کر دینے کا نام ہے کہ نہ صرف ہاتھ خالی کرنے کا نام ہے۔ بعض جاہل لوگوں نے کسبِ حلال سے اجتناب کو زہد سمجھ لیا۔ اور لوگوں سے کنارہ کشی کر کے ان کے حقوق کو ضائع کیا اور قطع رحمی کے مرتکب ہوئے۔ اور اغنیاء سے نفرت کی حالانکہ خود ان کے دل غنا کی خواہش سے لبریز تھے اور ان جاہلوں نے یہ نہ جانا کہ زہد کا تعلق دل سے ہے اور اصل زہد دلی خواہشات کو مارنا ہے

---

[1] (النهاية في غريب الحديث)

[2] (فیض القدیر ج ۳ ص ۵۴۵)

لیکن جب انہوں نے ظاہری اعضاء کے ساتھ دنیا سے کنارہ کشی کر لی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کامل زاہد بن گئے ہیں اور اپنے اس خشک زہد کی وجہ سے بہت سے ائمہ کرام کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ [1]

اور اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو دنیا اور اس کی لذات میں مستغرق ہیں۔ ان کے دل اس کی محبت سے معمور ہیں اور اپنا تمام وقت دنیاوی مال جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی گمان کرتے ہیں کہ ان کو قلبی زہد حاصل ہے۔ اور صرف وہی زہد کے حقیقی معنی کو سمجھتے ہیں۔ کاش کہ ان لوگوں کو کسی مرشد کامل کی صحبت میسر آتی تو وہ انہیں زہد کی حقیقت سے آگاہ کرتا۔ اور حقیقت زہد تک رسائی کا راستہ بتاتا۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض شیوخ اپنے مریدین کے دلوں سے دنیاوی محبت نکالنے کیلئے بعض خاص مجاہدات کا حکم دیتے ہیں۔ اور اس سے ان کا مقصد مریدین کی بعض روحانی بیماریوں کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ وہ انہیں کم کھانے اور سادہ کپڑے پہننے کا حکم دیتے ہیں۔ تاکہ دنیا کی محبت ان کے دل سے نکل جائے اور اس کے ساتھ ساتھ جود و سخا کا بھی حکم دیتے ہیں تاکہ بخل اور دنیاوی مال کی محبت ان کے دل سے نکل جائے۔ یہ بعض ضروری روحانی علاج ہیں جو شیخ کامل کی راہنمائی میں فائدہ مند ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں ذاتی طور پر مقصود نہیں ہوتیں بلکہ حقیقی قلبی زہد تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا سادہ غذا استعمال کرنا اور بھوک کی وجہ سے پیٹ مبارک پر پتھر باندھنا صرف ان اعمال کے جواز کو بیان کرنے کیلئے تھا۔ حالانکہ جبریل علیہ السلام نے آپ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ اگر آپ حکم فرمائیں تو یہ پہاڑ سونا بن جائیں۔

شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایسی ہستی ہیں جن کے زیرِ سایہ بڑے بڑے علماء کرام نے تربیت حاصل کی۔ آپ اس مفہوم کو بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تصوف قیل و قال سے حاصل نہیں کیا، بلکہ بھوک، دنیا سے قطع تعلقی، پسندیدہ اور محبوب چیزوں کو ترک کرنے سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو جوڑنے کا نام ہے۔ اور اس کی بنیاد دنیا سے کنارہ کشی پر ہے۔ جس طرح کہ حضرت حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا، میرا دل، دنیا سے دور ہو گیا ہے۔ رات جاگ کر گزارتا ہوں اور دن میں روزہ رکھتا ہوں۔ [2]

---

[1] (فیض القدیر ص ۷۳)

[2] (طبقات الصوفیة للسلمی ص ۱۵۸)

سیدی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے مریدوں کو ابتدائی سلوک میں مجاہدہ کا حکم فرماتے تھے۔ اور ان کو صبر اور سخت زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے۔ اس کے بعد ان کو آہستہ آہستہ قلبی زہد کے مراتب کی طرف لے جاتے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک اخذ و عطا اور فقر و غنا برابر ہو جاتا، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے ان کا دل خالی ہو جاتا۔

صوفیائے کرام نے ان امور کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جو مقامِ زہد تک پہنچنے کیلئے معاون و مددگار ہیں۔

(۱): اس بات کا یقین کر لینا کہ دنیا ڈھلتی چھاؤں اور عارضی خیال کی طرح ہے اور یقیناً ایک دن اس سے دار البقاء کی طرف کوچ کرنا ہے۔ وہاں انسان اپنے اعمال کا نتیجہ پالے گا۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہوں گے تو جنت کی دائمی نعمتوں میں مقیم ہو جائے گا۔ اور اگر برے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا نارِ جہنم ہو گا۔

حضرت عبد اللہ بن شخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ "الھکم التکاثر" پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابن آدمؑ کہتا ہے میرا مال میرا مال۔ اے ابن آدم! تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کیا اور اس کو آگے بھیج دیا۔ (مسلم، کتاب الزھد)

حضرت ابو المواہب شاذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت کے ساتھ مرید کی عبادت دل کو مشغول کرنے اور جسم کو تھکانے کے سوا کچھ نہیں یہ عبادت اگرچہ کثیر ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک قلیل ہوتی ہے۔

(۲): یہ یقین کر لینا کہ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک جہاں (دار آخرت) ہے جو اس سے زیادہ قدر و عظمت والا ہے اسے دار البقا کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ (نساء:۷۷)

ترجمہ: "اے (ترجمانِ حقیقت! انہیں) کہو دنیا کا سامان بڑا قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کیلئے جو تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اپنے مریدین کو دنیا سے اعراض کرنے اخروی زندگی یعنی جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف توجہ دینے اور ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رغبت دینے کی تلقین فرماتے ہیں۔ اس طرح وہ ایثار، قربانی، مجاہدۂ نفس اور خواہشاتِ نفسانیہ پر غلبہ حاصل کرنے میں صحابۂ کرام اور سلف صالحین کی سیرت طیبہ پر عمل پیرا ہوئے تو اس عارضی زندگی کی رنگارنگی ان کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔ دنیا کی رونق اور دلکشی دیکھ کر وہ نعرہ مستانہ لگاتے تھے۔

لا تنظرن الی القصور العامرة　　　واذکر عظامک حین تمسی ناخرة
واذا ذکرت زخارف الدنیا فقل　　　لبیک ان العیش عیش الآخرة

آباد محلات کی طرف نہ دیکھ۔ اپنی ہڈیوں کی طرف دیکھ جب یہ بوسیدہ ہو جائیں گی، اور جب تجھے دنیا کی زیب وزینت یاد آئے تو کہہ، لبیک، یقیناً حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

یہ یقین کر لینا کہ دنیا میں مؤمن کا زہد اس سے وہ چیز نہیں روک سکتا جو اس کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے اور دنیا پر حریص ہونا ان کو وہ عطا نہیں کر سکتا جو اس کے مقدر میں نہیں لکھا گیا۔ پس جو چیز اس کی مقدر میں لکھی جاچکی ہے وہ اس کو مل کر رہے گی۔ اور جو چیز اس کے مقدر میں نہیں ہے وہ اس کو نہیں مل سکتی۔

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ زہد کا مقام ارفع واعلیٰ ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے کتاب وسنت نے اس کی دعوت، اور ائمہ کرام نے اس کی تعریف کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "زہد کو لازم پکڑو، کیونکہ زہد، زاہد کیلئے خوبصورت عورت پر زیور سے بھی زیادہ حسین ہے۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے مقامِ زہد تک رسائی حاصل کر کے اس کے مختلف مدارج کو طے کیا ہے۔ شیخ ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے زہد کے تین مدارج کو بیان فرمایا ہے:

(۱): عوام الناس کا زہد　　　(۲): خواص کا زہد　　　(۳): خاص الخواص کا زہد

(۱): عوام الناس کا زہد یہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد چیز کو ترک کر دیں۔

(۲): خواص کا زہد یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ترک کر دیں جو انہیں قربِ الٰہی سے دور کرنے والی ہو۔

(۳): خاص الخواص کا زہد یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اوقات میں ماسوی اللہ سے اعراض کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ زہد، راہِ سلوک پر گامزن ہونے اور وصالِ الٰہی کا سبب ہے۔ اور دل کو یہ منزل اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک اس کا تعلق محبوب کے سوا کسی اور چیز سے ہوتا ہے۔[2]

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صوفیائے کرام اور صالحین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان للہ عبادا فطنا　　　طلقوا الدنیا وخافوا الفتنا

---

[1] (فیض القدیر ج۴ ص۷۳)

[2] (معراج التشوف ص۷-۸)

نظروا فیھا فلما علموا | انھا لیست لحی سکنا
جعلوھا لجۃ واتخذوا | صالح الاعمال فیھا سفنا

اللہ تعالیٰ کے کچھ ہوشیار بندے ہیں جنہوں نے دنیا کو طلاق دے دی۔ اور اس کے فتنہ سے ڈر گئے، انہوں نے اس میں غور و فکر کیا اور جب انہوں نے جان لیا کہ یہ کسی زندہ کی جائے سکونت نہیں ہے، تو انہوں نے اس کو ایک سمندر گمان کیا۔ اور اپنے نیک اعمال کو اس میں کشتی بنالیا۔

رضاء

تعریف:

علمائے کرام نے رضا کی متعدد تعریفات کی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے مشرب اور مقام کے مطابق تعریف کی ہے۔ ان میں سب سے اہم تعریف سید میر جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ''الرضا سرور القلب بمر القضاء'' یعنی قضاء کی تلخی میں دل کا سرور رضا کہلاتا ہے۔[1]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مسکراتے ہوئے مصائب کا استقبال کرنا رضا ہے۔ یا نزول قضا کے وقت دل کے سرور کو رضا کہتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر میں ترکِ اختیار کو رضا کا نام دیا جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہونے والے امور پر انکار نہ کرنے اور ان پر شرح صدر کا مظاہرہ کرنے کو رضا کہتے ہیں۔[2]

علامہ برکوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے ملنے یا نہ ملنے دونوں حالتوں میں دل کے خوش رہنے کو رضا کہتے ہیں۔[3]

حضرت ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دل کا ان اختیارات کی طرف دیکھنا جو اللہ تعالیٰ نے بندہ کو عطا فرمائے ہیں یعنی کسی امر پر ناراضگی کا اظہار نہ کرنا رضا ہے۔ شیخ محاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ احکامِ الٰہیہ کے اجراء کے وقت سکون قلب کا نام رضا ہے۔[4]

---

[1](تعریفات السید، ص۵۷)
[2](معراج التشوف، ص۸)
[3](شرح الطریقۃ المحمدیۃ ج۲ ص۱۰۵)
[4](رسالہ قشیریہ ص ۸۹)

رضا ایک قلبی مقام ہے جب مؤمن اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو مصائب اور حادثات کا استقبال ایمان راسخ، سکونِ قلب اور اطمینانِ نفس کے ساتھ کرتا ہے۔ بلکہ کبھی تو اس سے بھی ارفع واعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے یعنی وہ قضا کی تلخی میں فرحت و سرور محسوس کرتا ہے۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس سے سچی محبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

رضا کی فضیلت:

رضا، صبر سے اعلیٰ مقام اور ارفع مرتبہ ہے۔ کیونکہ رضا روحانی طور پر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا نام ہے۔ اس سے عارف اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کائنات میں ہر اس چیز سے محبت کرنے لگتا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو حتیٰ کہ مصائب و آلام کو بھی رحمت اور خیر شمار کرتا ہے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان سمجھ کر رضا کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نزع کے عالم میں فرماتے تھے:

"وافرحتاہ! غدا القی الا حبہ محمدا و صحبہ!"۔

یعنی کتنی خوشی کا موقع ہے کل محبوبوں یعنی محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب سے ملاقات ہوگی![1]

رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونے والا تمام لوگوں سے غنی ہوتا ہے کیونکہ اسے لوگوں سے زیادہ سرور اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح غم وحزن اور پریشانی سے بھی بہت دور ہوتا ہے کیونکہ غنا صرف کثرتِ مال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایمان و رضا کے ساتھ دل کے غنی ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اتق المحارم تکن اعبد الناس وارض بما قسم اللہ لک تکن اغنی الناس واحسن الی جارک تکن مؤمنا واحب للناس ماتحب لنفسک تکن مسلما لاتکثر الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلب۔

محرمات سے بچو، تمام لوگوں سے زیادہ عابد ہو جاؤ گے، اللہ کی تقسیم پر راضی رہو، تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احساس کرو، تو حقیقی مؤمن بن جاؤ گے، لوگوں کیلئے وہ چیز پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، تم حقیقی مسلمان بن جاؤ گے، زیادہ ہنسنے سے بچو، کیونکہ یہ دل کو مردہ کر دیتا ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے بڑے خوبصورت انداز میں واضح فرمایا کہ رضا مؤمن کی دنیوی واخروی سعادت کا بہترین سبب ہے، جیسے عدمِ رضا دنیا و آخرت میں بدبختی کا سبب ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابن آدم کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ

---

[1] (السیرۃ النبویۃ لأحمد زینی دحلان ص ۲۴۲)

[2] (ترمذی، کتاب الزھد)

کی قضا پر راضی رہے اور اس کی بد بختی کی علامت یہ ہے کہ وہ اس چیز کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے پسند کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراضگی کا اظہار کرے۔[1]

رضا کی نعمت کی برکت سے ہی عارفین کے دل مطمئن اور پر سکون ہوتے ہیں اور رضا ہی اس مایوسی اور قنوط کی کیفیت کو ختم کرنے کا سبب ہے دنیاوی زندگی کی لذات کے عدمِ حصول میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے جو کہ انسان کیلئے اضطراب و پریشانی کا باعث بنتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلوں میں رضا کی اہمیت کو اجاگر کیا کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا! جس نے صبح شام یہ کہا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا رسول تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر واجب ہے کہ وہ اس کو راضی کر دے۔[2]

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس ورد کو پڑھنے پر بڑے حریص تھے اس طرح وہ اپنے دل میں پوشیدہ تسلیم و رضا کے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

آج کل بہت سے لوگ اپنی زبان سے اس کلمہ کا ورد تو کرتے ہیں لیکن ان کے دل مطمئن نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کے گرانقدر معانی اور اس کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کو سمجھتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ مصائب و مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر غم و حزن کے گہرے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔ لیکن صرف زبان کے ساتھ ورد ان کو فائدہ نہیں دیتا، جب تک اس کی صدا دل کی گہرائیوں سے نہ نکلے، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب تسلیم کر لیتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے مخلوق سے متعلقہ تمام امور پر راضی ہو جائے۔ یعنی اسے ہر حال میں راضی ہونا چاہئے خواہ اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے یا محروم۔ اسے بلند کرے یا پست۔ اسے نفع دے یا نقصان۔ اسے وصال اور قربت سے نوازے یا اپنے در سے دور کر دے۔ اسی طرح اسلام کو اپنا دین تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات لازم ہے کہ وہ اس کے اوامر کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اگرچہ اسے اپنے نفس کی خواہش اور اپنی خاص مصلحت کی مخالفت کرنا پڑے۔ اور جو شخص محمد ﷺ کو اپنا نبی اور رسول تسلیم کر لیتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ آپ کی شخصیت کو اپنے لئے بہترین نمونہ قرار دے۔ آپ کے آثار کی پیروی کرے اور آپ کی سنت سے اپنے آپ کو آراستہ کرے اور اپنی نفسانی خواہش سے مجاہدہ کرے تاکہ وہ اسلامی احکام کے تابع ہو جائے اور اسے چاہئے کہ اس کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی ذات، والد، بیٹے، اپنی جان اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو۔

---

[1] (ترمذی، کتاب القدر)

[2] (ابو داؤد، باب مایقول اذا أصبح، ترمذی کتاب الدعوات)

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین“۔

تم میں سے کوئی بھی کامل مؤمن نہیں سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، بیٹے اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ ارشاد سنا تو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی:

”لانت یا رسول اللہ احب الی من کل شیٔ الا من نفسی“۔

یا رسول اللہ ﷺ آپ میرے نزدیک میرے ذات کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔

تو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

نہیں اے عمر، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے حتیٰ کہ میں تیرے نزدیک تیری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: ہاں اب مجھے یہ کیفیت حاصل ہو گئی ہے۔ قسم بخدا! آپ میرے نزدیک میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے عمر! اب ٹھیک ہے۔[2]

جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور حضرت محمد ﷺ کو اپنا نبی اور رسول تسلیم کر لیا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا اور یقین کی حلاوت پالی اور ابدی سعادت سے سرفراز ہوا۔

آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

ذاق طعم الایمان من رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا۔

اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا نبی ماننے پر راضی ہوا۔[3]

مگر وہ شخص جو ایمان کی لذت اور رضا کی نعمت سے محروم ہو، وہ ہمیشہ اضطراب و پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ خصوصاً جب وہ کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو دنیا اس کیلئے تاریک اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود اس پر تنگ ہو جاتی ہے۔ شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ خودکشی کے علاوہ ان غموں سے چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اسی وجہ سے خودکشی کے حادثات واقع

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان باب حب الرسول من الایمان)

[2] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان و النذور باب کیف کانت یمین النبی ﷺ ج۸ ص ۱۶۰، و رواہ أحمد فی المسند ج۴ ص ۲۳۳)

[3] (رواہ مسلم و الترمذی فی کتاب الایمان)

ہوتے ہیں اور دن بدن ان کی نسبت بڑھتی جارہی ہے، خصوصاً غیر مسلم ممالک اور بے دین معاشرے میں جہاں اسلام کی روشنی نہیں پہنچ سکی، خودکشی کی شرح بہت زیادہ ہے۔

اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى (طٰہٰ: ۱۲۴)

ترجمہ: "اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کیلئے زندگی (کے جامہ) کو تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔"

رضا کے بارے میں کچھ شبہات اور ان کے جوابات

بعض جہلاء نے مقامِ رضا کے بارے میں کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب ان کی جہالت اور اس ارفع مقام تک ان کی عدم رسائی ہے۔ اور انسان ہمیشہ سے ہی اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس کو نہیں جانتا۔ یا ان شبہات کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے کچھ جھوٹے دعویدار دیکھے اور ان کے غلط طریقہ کار کو تصوف سمجھ لیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان جھوٹے دعویداروں اور حقیقی صوفیائے کرام کے درمیان جو ایمان واسلام کے ساتھ ساتھ احسان کے مرتبہ پر فائز تھے، فرق کرتے۔

(۱): بعض لوگوں نے تو سرے سے ہی رضا کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خواہشاتِ نفس کے مخالف رضا کو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس چیز کو صبر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ انسان مصائب وآلام کو محسوس نہ کرے۔

جواب: مقامِ رضا پر فائز فطری طور پر مصائب وآلام کو ضرور محسوس کرتا ہے لیکن اپنے ایمان کامل اور عقلِ سلیم کی وجہ سے قضا پر راضی رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس پر عظیم اجر وثواب کا امیدوار رہتا ہے۔ اس لئے وہ نہ تو کوئی اعتراض کرتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی اکتاہٹ کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت ابو علی دقاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ليس الرضا ان لا تحس بالبلاء انما الرضا لا تعترض على الحكم و القضا۔

رضا یہ نہیں ہے کہ تو مصیبت کو محسوس نہ کرے بلکہ رضا یہ ہے کہ تو حکمِ الٰہی اور اس کی قضا پر اعتراض نہ کرے۔[1]

اس کو آپ اس مثال کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں کہ مریض انجکشن لگوانے کی تکلیف کو تو محسوس کرتا ہے لیکن حصولِ شفا کیلئے وہ اس تکلیف پر راضی رہتا ہے بلکہ اس شخص پر بہت خوش ہوتا ہے جو اسے دوائی دیتا ہے اگرچہ وہ دوائی بہت کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں اس میں مجھ پر چار نوازشات ہوتی ہیں:

(۱): کہ یہ آزمائش میرے دین کے متعلق نہ تھی۔

(۲): میں اس میں رضا سے محروم نہ رہا۔

(۳): یہ آزمائش اتنی بڑی نہ تھی۔

---

[1](رسالہ قشیریہ ص ۸۹)

(۴): میں اس پر اجر وثواب کا امیدوار ہوں۔[1]

دوسری وجہ یہ ہے کہ مقامِ رضا پر فائز فطری طور پر مصائب وآلام کو محسوس تو کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لطف واحسان اور اس کی حکمتوں پر کامل یقین ہونے کی وجہ سے ان پر راضی رہتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فعل کے پسِ پردہ کوئی نہ کوئی حکمت مضمر ہوتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فَعَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا" (نساء: ۱۹)

اس وجہ سے اس کا غم مضمحل اور تعجب زائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ جان لیتا ہے کہ اس کا تعجب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعجب کی مثل ہے جب انہوں نے یتیموں کی کشتی کو عیب دار کرنے، بچے کو قتل کرنے اور دیوار تعمیر کرنے پر حضرت خضر علیہ السلام پر تعجب کا اظہار فرمایا پھر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان حکمتوں سے آگاہ فرمادیا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تعجب زائل ہو گیا کیونکہ ان کا تعجب صرف اس بنا پر تھا کہ یہ حکمتیں ان پر مخفی تھیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمتیں بھی ہم پر مخفی ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مؤمن کا دل جب اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوتا ہے اور وہ اس کی محبت میں دنیاومافیہا سے بے خبر ہوتا ہے تو وہ نہ تو مصیبت کے واقع ہونے کو محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اس پر درد وآلام اور یہ حقیقت ہے کہ محبت کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے کبھی محبت کا ذائقہ چکھا ہو۔

لا یعرف الوجد الا من یکابده   و لا الصبابة الا من یعانیها

غم اسی کو محسوس ہوتا ہے جو اسے برداشت کر سکے اور عشق وہی محسوس کرتا ہے جو اس میں مبتلا ہو۔

اسی وجہ سے اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی۔

قال عامر بن قیس! احببت اللہ حبا ھون علی کل مصیبة و رضانی بکل بلیة فلا ابالی مع حبی ایاہ علیٰ ما اصبحت و علیٰ ما امسیت۔

"عامر بن قیس نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی محبت کی ہے جس نے مجھ پر ہر مصیبت آسان کر دی اور ہر آزمائش پر مجھے راضی کر دیا۔ محبت کی وجہ سے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے کس حالت میں صبح کی اور کس حالت میں شام کی۔"

---

[1] (شرح الطریقة المحمدیة ج ۲ ص ۱۰۵)

(۲): اعتراض: بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ مؤمن رضا کی وجہ سے فاسقین کے اعمال اور برے لوگوں کے احوال کو اچھا گمان کرنے لگتا ہے اور یہ چیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کا سبب ہے۔

جواب: یہ اعتراض ان کی واضح جہالت کا ثبوت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مؤمن اپنے رب کے احکام میں سے ایک اہم حکم اور دینِ اسلام کے اہم ستون یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو گرا دے حالانکہ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اسی وقت راضی ہو گا جب وہ دینی احکام کو بجالائے گا اور اس کی شریعت کی اتباع کرے گا۔ مؤمن کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کافر کے افعال پر راضی ہو جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی نہیں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ۔" (زمر:۷)

اور وہ پسند نہیں کرتا اپنے بندوں سے ناشکری کو۔

حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر راضی ہونے اور برے کام کو ناپسند کرنے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ مؤمن اللہ تعالیٰ کے افعال پر اس حیثیت سے راضی ہوتا ہے کہ ان کا صدور اس ذات سے ہوا ہے جو بڑی علیم و حکیم ہے اور ان کا تعلق اس کی قضا اور مشیت سے ہے، اور وہ برے لوگوں کے افعال سے اس حیثیت سے راضی نہیں ہوتا کہ ان میں ان کی صفت کسب کا دخل ہے اور ان کے یہ افعال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں، لہٰذا مؤمن بھی ان کے بد اعمال ناپسند کرتا ہے۔

(۳): اعتراض: بعض لوگوں نے یہ غلط تصور قائم کیا ہے کہ رضا کی وجہ سے انسان دعا اور عاجزی کو ترک کر دیتا ہے اور اسی طرح خیر کے حصول اور مصیبت کو دور کرنے کے اسباب کو بھی ترک کر دیتا ہے اور بیماری کے وقت دوا سے دور بھاگتا ہے۔

جواب: ان کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کیونکہ در حقیقت یہ چیز بھی رضا میں شامل ہے کہ مؤمن ایسے اعمال کو سر انجام دے جو اس کے محبوب حقیقی کی رضا کا ذریعہ ہوں اور ہر اس کام کو ترک کر دے جو اس کے حکم اور رضا کے مخالف ہو۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرنا بھی اس کی رضا کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو دعا کا حکم دیا ہے کہ گویا اس حکم کی پیروی کرنا بھی رضا میں شامل ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" (مؤمن:۶۰)

مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

مشکوۃ المصابیح صفحہ ۱۹۴ پر ہے: **الدعاء مخ العبادۃ** (دعا مغز عبادت کا ہے)۔

یہ دل میں صفائی، خشوع اور رقت پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کو اخذ کرنے کے قابل بنا دیتی ہے پھر اسباب کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف اور اس کی رضا کے منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو عمل کا حکم دیا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (توبہ:۱۰۵)

”اور فرمایئے عمل کرتے رہو پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مؤمن۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق حلال کی تلاش کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔ (الملک:۱۵)

ترجمہ: ”وہی تو ہے جس نے نرم کر دیا ہے تمہارے لئے زمین کو پس (اطمینان سے) چلو اس کے راستوں پر اور کھاؤ اس کے (دیئے ہوئے) رزق سے۔“

یہ رضا نہیں ہے کہ پیاسا پانی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ پیاس پر راضی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی قضا ہے۔ یہ محض اس کا گمان اور جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور حکم یہ ہے کہ پیاس کو پانی سے دور کیا جائے۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طاعون سے بچنے کیلئے مسلمانوں کے لشکر کو ملک شام میں داخل ہونے سے منع کیا تو حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے بھاگتے ہو تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں جواب دیا۔ اے ابو عبیدہ! کاش کہ یہ جملہ تمہارے علاوہ کوئی اور کہتا، ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے اسی کی قضا و قدر کی طرف فرار اختیار کر رہے ہیں۔[1]

رضا بالقضاء شرعی حدود سے خارج ہونے کو مستلزم نہیں۔ بلکہ رضا بالقضاء کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ پر اعتراض کو ترک کر دے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کرے یعنی اس کے اوامر کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے۔

---

[1] (بخاری، کتاب الطب، باب مایذکر فی الطاعون)

اختتامیہ:

رسول اللہ ﷺ، آپ کے خلفاء اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے علاوہ تابعین کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں جو دلالت کرتے ہیں کہ یہ رضا کے اعلیٰ درجات پر فائز تھے۔ ان تمام واقعات کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

طائف میں رسول اللہ ﷺ پر پتھروں کی بارش کی گئی حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک خون آلود ہو گئے لیکن اس کے باوجود آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی۔ اے پروردگار! اگر تو مجھ پر ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ صحابہؓ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مکہ میں طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتیں۔ لیکن وہ یہ تمام تکلیفیں اس طرح برداشت کرتے کہ ان کے دل راضی ہوتے، چہروں پر مسکراہٹ ہوتی اور زبانیں ذکر میں مصروف رہتیں۔

مروی ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور اسی رات ان کا عزیز ترین بیٹا انتقال کر گیا۔ آپ کے ساتھی افسوس کیلئے حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

اللہ ملک الحمد کان اولادی سبعۃ فاخذت واحدا وابقیت ستۃ وکان لی اطراف اربعۃ فاخذت واحدا وابقیت ثلاثۃ فلان کنت قد اخذت فلقد اعطیت ولان کنت قد ابتلیت فقد عافیت۔

یعنی "اے اللہ! ساری تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ میرے سات بچے تھے تو نے ان میں سے ایک لے لیا اور چھ کو باقی رکھا۔ میرے چار اطراف تھے ان میں سے تو نے ایک لے لی اور تین کو باقی رکھا۔ اگر تو نے آج مجھ سے کچھ لیا ہے تو یہ سب کچھ تو نے ہی تو عطا کیا تھا۔ اگر تو نے مجھے آج آزمائش میں مبتلا کیا ہے تو تو نے مجھے عافیت بھی بخشی تھی۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا! میرے لئے خوشی کا کوئی موقع نہیں سوائے قدر کے واقع ہونے کے وقت۔ آپ سے عرض کی گئی کہ آپ کیا چیز پسند کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قضا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے اسی وقت راضی ہوتا ہے جب بندہ اپنے تمام اقوال وافعال میں اپنے رب سے راضی ہو جائے پھر اس وقت طرفین سے رضا کا تبادلہ ہوتا ہے۔

جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ۔" (بینہ:۸)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی۔"

صوفیائے کرام نے رضا کی ان دونوں قسموں میں باہمی ربط اور تعلق کے راز کو پا لیا تھا۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن رابعہ عرویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا، اے اللہ! تو مجھ سے راضی ہو جا۔ تو

انہوں نے فرمایا! اے ابو سفیان! تجھے اللہ سے حیا نہیں آتی کہ تم اس سے رضا کا سوال کرتے ہو، حالانکہ تم اس سے راضی نہیں ہو۔ تو حضرت سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے، **استغفر اللہ۔** [1]

بندے سے اللہ تعالیٰ کی رضا یہ بڑا ہی بلند اور ارفع واعلیٰ مرتبہ اور بڑا عظیم عطیہ ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ" (توبہ:۷۲)

نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے۔

یقینا جنت کے رب کی رضا جنت سے اعلیٰ ہے بلکہ یہی تو اہلِ جنت کا مطلوب و مقصود ہے! جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو ارشاد فرمائے گا: اے اہلِ جنت! اور وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں۔ وہ ارشاد فرمائے گا: کیا تم مجھ سے راضی ہو؟ اہلِ جنت عرض کریں گے: یارب! ہم تجھ سے کیوں نہ راضی ہوں تو نے ہمیں ان انعامات سے نوازا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں کسی پر نہیں فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں تمہیں اس سے بھی افضل انعام عطا فرمانے والا ہوں۔ عرض کریں گے: اے پروردگار! اس سے افضل کون سا انعام ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں تم پر اپنی رضا کو حلال کرتا ہوں اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ [2]

توکل

تعریف:

سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

التوکل ھو الثقة بما عند اللہ والیأس عما فی ایدی الناس۔

یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر اعتماد کرنے اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوسی کا نام توکل ہے۔ [3]

عارف باللہ ابن عجیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

التوکل ثقة القلب باللہ حتی لا یعتمد علی شئ سواہ۔

"اللہ تعالیٰ پر دل سے اعتماد کرنے اور اس کے سوا کسی چیز پر اعتماد نہ کرنے کا نام توکل ہے" [4]

---

[1] (احیاء العلوم ۳۳۲:۴)

[2] (بخاری، کتاب الرقاق باب صفة الجنة)

[3] (تعریفات السید ص ۴۸)

[4] (معراج التشوف ص ۸)

یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے اور ہر شئ میں اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کا نام توکل ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ ہر شئ کو جاننے والا ہے۔ اور تمہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ تیرے ہاتھ میں پائی جانے والی چیز سے زیادہ بہتر ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ غیر سے دل کے تعلق کو توڑ کر اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرنے کا نام توکل ہے۔[1]

حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: توکل، اللہ تعالیٰ کی تصدیق، اس پر اعتماد، اسی کی ذات کے ساتھ اپنے سکون واطمینان کو وابستہ کرنے اور اپنے دل سے امورِ دنیا، رزق وغیرہ کا خیال نکالنے کو کہتے ہیں۔[2]

توکل اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے اور تمام احوال میں اسی کی طرف رجوع کرنے اور اپنی قوت وطاقت سے دستبردار ہونے کا نام ہے۔

سابقہ تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توکل قلبی مقام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور وسائل واسباب کو بروئے کار لا کر کام کو سرانجام دینے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ توکل کا محل دل ہے اور اسباب ووسائل کا محل بدن ہے۔ ایک کامل مؤمن عمل کو کیسے ترک کر سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کثیر آیات کریمہ میں اور رسول اللہ ﷺ نے احادیث طیبہ میں اس کا حکم فرمایا ہے۔

ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کو کھلا نہ چھوڑ دوں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اعقلها وتوکل"۔

اس کے پاؤں کو باندھ دو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔[3]

اسی لئے علمائے کرام نے اسباب وذرائع کو ترک کرنے اور طلبِ رزقِ حلال میں کوشش نہ کرنے کو سستی اور کاہلی شمار کیا ہے۔ جس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی طرح صوفیائے کرام نے غلط افکار کی تصحیح اور شبہات کو دور کرنے کیلئے واضح طور پر فرمایا ہے کہ تصوف، اسلام کو حقیقی طور پر سمجھنے کا نام ہے۔

---

[1] (دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین ۲:۲)
[2] (الطریق الی اللہ لأبی سعید الخراز ص ۵۶)
[3] (رواہ الترمذی فی کتاب صفۃ القیامہ)

امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا محل دل ہے، اور ظاہری حرکت توکل کے منافی نہیں، خصوصًا جب بندہ اس بات پر یقین کر لیتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے۔ اگر کسی چیز کا حصول مشکل ہو تو یہ بھی اسی کے حکم سے ہے اور اگر کوئی چیز آسانی سے حاصل ہو جائے تو یہ بھی اسی کے فضل واحسان سے ہے۔[1]

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: بعض جہلاء یہ گمان کرتے ہیں کہ کسبِ حلال کو ترک کرنا، بیماری کا علاج نہ کرنا اور اپنے آپ کو ہلاکت کے سپرد کرنا توکل کی شرائط میں سے ہے لیکن یہ محض خطا ہے کیونکہ یہ چیز شرعًا حرام ہے۔ شرع نے توکل کی تعریف کی ہے اور اس کو اپنانے کی دعوت دی ہے تو یہ چیز حرام کے ارتکاب سے کیونکر حاصل ہو گی۔[2]

صوفیائے کرام نے بھی اس انتہائی دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ تمام اعمال میں اسباب ووسائل کو بروئے کار لائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دلی طور پر اس پر کامل اعتماد نہ کرے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین صوفیائے کرام کے نزدیک اپنی ضروریات کے حصول کیلئے کوشش کرنا واجب ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں لیکن کلی طور پر اسباب پر اعتماد اور دل کا ان کی طرف متوجہ ہونا توکل کے منافی ہے کیونکہ اسباب کو بروئے کار لانا اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کی حکمت ہے۔ اور مؤمن کو کامل یقین ہونا چاہئے کہ یہ اسباب نفع ونقصان کا باعث نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔[3]

توکل کی فضیلت اور اس کے آثار:

توکل ایمان کامل کا نتیجہ اور معرفتِ الٰہی کا ثمر ہے اور جس قدر بندے کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل ہو گی اسی قدر اس کا توکل مضبوط ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر حقیقی توکل اسے ہی حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا اسی کی وجہ سے سربلند ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا، اسے اپنے مولیٰ پر کامل اعتماد ہوتا ہے، اسی لئے اس کے علاوہ کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ مرید کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ بندوں کے سامنے دامنِ طلب دراز کرے حالانکہ اس کی ہر ضرورت اس کا مولیٰ پوری کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے توکل کو ایمان کے ساتھ ملایا ہے۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ٧٦)

[2] (لأربعین فی أصول الدین للغزالی رحمہ اللہ تعالیٰ ص ٢٤٦)

[3] (دلیل الفالحین ج ٢ ص ٣)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): "وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" (مائدہ:۲۳)

اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایماندار ہو۔

(۲): "وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (ابراھیم:۱۱)

اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

جو بندہ اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل اور صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی محبت سے نوازتا ہے۔ اور اس کے تمام مصائب و تکالیف کو دور کر کے اس کے دل کو غنا اور یقین سے بھر دیتا ہے۔ اور اس کے ظاہر کو عفت اور جودو کرم سے آراستہ کر دیتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ" (آل عمران:۱۵۹)

بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ" (طلاق:۳)

اور جو (خوش نصیب) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کیلئے وہ کافی ہے۔

توکل دل میں سکون و اطمینان پیدا کرتا ہے خصوصاً مصائب و آلام کے وقت صاحبِ توکل کا دل انتہائی پر سکون اور مطمئن رہتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ نے یہ وظیفہ "حسبنا اللہ و نعم الوکیل" پڑھا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی وظیفہ پڑھا جب لوگوں نے کہا:

إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران:۱۷۳)

"بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے تو (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے جوشِ ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرنے والا اس کی قضا پر راضی ہوتا ہے اور اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اسے اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

[1] (اخرجہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ آل عمران)

حضرت بشر حافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب تم میں سے کوئی کہتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا تو وہ اکثر اوقات اپنے اس قول میں جھوٹا ہوتا ہے کیونکہ وہ اگر اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرتا تو اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر راضی رہتا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے توکل کی تعریف فرمائی ہے اور مؤمن کی زندگی میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بیان فرمایا ہے۔ توکل ہی مؤمن کے دل میں اطمینان و سکون پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا۔"

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرتے تو وہ تمہیں رزق دیتا جس طرح پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹتے ہیں۔[2]

اس حدیث پاک میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توکل اسباب کے منافی نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ پرندے توکل کر کے گھونسلوں میں بیٹھے رہتے ہیں بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ پرندے اپنے رب پر توکل واعتماد کر کے رزق کی تلاش میں نکل جاتے ہیں یعنی وہ تلاش رزق میں سستی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ غم و حزن سے مامون رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے امت اسلامیہ کو ہر حال میں توکل کرنے پر رغبت دلائی ہے خصوصاً جب انسان اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب انسان اپنے گھر سے نکلتے ہوئے "بسم اللہ توکلت علی اللہ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ" پڑھتا ہے تو اسے ندا دی جاتی ہے کہ تو ہدایت یافتہ ہو گیا اور تجھے ہر غم سے نجات مل گئی اور تجھے ہر قسم کے شر سے محفوظ کر لیا گیا اور شیطان اس سے دور بھاگ جاتا ہے اور دوسرے شیطان سے کہتا ہے کہ تو اس شخص پر کیسے غلبہ حاصل کر سکتا ہے جو ہدایت یافتہ ہو اور جسے ہر غم سے نجات اور ہر شر سے اس کی حفاظت کر دی گئی ہو۔[3]

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۷۶)

[2] (رواہ الترمذی فی کتاب الزھد، وأخرجہ الحاکم فی المستدرک ج ۴ ص ۳۱۸)

[3] (أبو داؤد نسائی ترمذی فی کتاب الدعوات)

مراتب توکل:

توکل میں لوگوں کے مختلف مراتب ہیں کیونکہ توکل بھی دوسرے مقامات سلوک کی طرح ہے۔ مؤمن اپنی معرفت کے مطابق اس کے مراتب میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسے عارفین نے توکل کے تین مراتب بیان کئے ہیں۔

۱) اس کا سب سے ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تیرا تعلق اس طرح ہو جس طرح کہ موکل اپنے شفیق اور مہربان وکیل کے ساتھ۔

۲)اس کا درمیانی مرتبہ یہ ہے کہ تیرا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح ہو کہ جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ کہ وہ اپنے تمام امور میں اپنی ماں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

۳)اس کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ تیرا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح ہو کہ جس طرح مریض کا ڈاکٹر کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان تینوں مراتب میں فرق یہ ہے کہ پہلے مرتبہ میں تہمت کا خطرہ ہوتا ہے۔ دوسرے مرتبہ میں تہمت کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن وہ ضرورت کے وقت اپنی ماں کی طرف رجوع کرتا ہے جبکہ تیسرے مرتبہ میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہر لحظہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔[1]

خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ توکل، ایمان و معرفت کے عظیم ثمرات اور اطمینان و سکون کے اہم اسباب میں سے ہے۔ صوفیائے کرام نے ہی اس کے صحیح مفہوم کو سمجھا ہے اور لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ توکل اسباب ووسائل کو ترک کرنے کا نام نہیں، بلکہ توکل اپنی امید کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کرنے، اس کی تدبیر و حکمت پر مکمل اعتماد کرنے اور دل کو اسباب سے لا تعلق کرنے کا نام ہے کیونکہ صرف اسباب اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

صوفیائے کرام توکل کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے ہیں، ان کے دل اللہ تعالیٰ پر مطمئن اور اس پر اطمینان اور مکمل اعتماد کرتے ہیں، اور اسی کی بارگاہ میں متوجہ ہو کر اس سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ انہیں کامل یقین ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ

[1] (معراج التشوف ص ۸)

تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل حقیقی نہیں۔ یہ تو ان کے قلوب کی کیفیت ہے مگر ان کے ابدان اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع و پیروی میں اسباب و وسائل کو بروئے کار لانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

شکر

تعریف:

علماء نے شکر کی کثیر تعریفات کی ہیں، ان میں سے بعض اہم کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

"الشکر ھو عکوف القلب علی محبۃ المنعم و الجوارح علی طاعتہ و جریان اللسان بذکرہ و الثناء علیہ"۔

یعنی شکر یہ ہے کہ دل محسن کی محبت کی طرف متوجہ ہو اعضاء اس کی طاعت و فرمانبرداری میں مصروف ہوں۔ اور زبان اس کے ذکر اور حمد و ثنا میں مشغول ہو۔[1]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ھو فرح القلب بحصول النعمۃ مع صرف الجوارح فی طاعۃ المنعم و الاعتراف بنعمۃ المنعم علی وجہ الخضوع"۔

یعنی محسن کی اطاعت میں اعضاء و جوارح کو مصروف کرنے کے ساتھ ساتھ حصولِ نعمت پر دل کے خوش ہونے اور عاجزی وانکساری کے طور پر محسن کی نعمت کے اعتراف کرنے کو شکر کہتے ہیں۔[2]

سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سمع و بصر وغیرہ تمام نعمتوں کا رب کی منشا کے مطابق صرف کرنے کا نام شکر ہے۔[3]

علامہ ابن علان صدیقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شکر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اعتراف کرنے اور اس کی خدمت کے سر انجام دینے کو کہتے ہیں اور جس میں یہ وصف کثرت سے پائی جائے اسے شکور کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (سبا:۱۳)

اور بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں۔"[4]

---

[1] (مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۶)
[2] (معراج التشوف ص ۷)
[3] (تعریفات السید ص ۷۶)
[4] (دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین ج ۲ ص ۵۷)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ان گنت اور بے شمار ہونا کسی پر مخفی نہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (ابراھیم:۳۴)

اور اگر تم گننا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

ان نعمتوں کو تین اہم اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱): دنیاوی نعمتیں: جیسے صحت وعافیت اور مالِ حلال وغیرہ۔

(۲): دینی نعمتیں: جیسے علم وعمل، تقویٰ اور معرفتِ الٰہی وغیرہ۔

(۳): اخروی نعمتیں: جیسے عملِ قلیل پر عطائے کثیر۔

دینی نعمتوں میں سب سے عظیم ترین نعمت جس پر شکر کرنا ضروری ہے وہ ایمان واسلام اور معرفتِ الٰہی کی نعمت ہے۔ اور اس کا شکر یہ ہے کہ مؤمن کو چاہئے کہ یہ عقیدہ رکھے کہ یہ تمام نعمتیں بغیر کسی واسطہ کے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل واحسان ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" (حجرات:۷)

لیکن اللہ تعالیٰ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور آراستہ کر دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں۔

(۲): وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ۔ (نور: ۲۱)

اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ بچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہرگز۔

مؤمن جب اس عظیم کائنات اور اس میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں غور وفکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں سے مطلع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہے۔ اور یہ چیز اللہ تعالیٰ سے محبت کا سبب بنتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ ہم پر اپنے نیک بندوں کے واسطے سے کرتا ہے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہم پر اپنا فضل واحسان کیا ہے اور اسی طرح ہمارے والدین اور ہمارے شیوخ ومربین کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔ پس مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ وہی منعم حقیقی ہے جس نے ہمارے لئے لوگوں کے ذریعے نیکی کے راستوں کو آسان کیا۔ یہ لوگ صرف واسطہ ہیں اور منعم حقیقی وہی ذات ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے!

"مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" (نحل:۵۳)

اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔

اسی طرح مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے نعمت کا سبب بنایا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

”لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس“۔

یعنی جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کر سکتا۔[1]

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ ساتھ والدین کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے جن کو ہماری پیدائش کا ذریعہ اور بہت سی نعمتوں کا واسطہ بنایا۔ ارشاد فرمایا:

”أَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط إِلَيَّ الْمَصِيْرُ“ (لقمان: ۱۴)

کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی لوٹنا ہے۔

مخلوق کا شکریہ ادا کرنا آسان ہے اور جو مخلوق کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے زیادہ قاصر رہے گا۔

شکر کی اقسام:

سابقہ تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ شکر کی تین قسمیں ہیں:

(۱): زبان کا شکر (۲): ارکان کا شکر (۳): دل کا شکر

(۱) زبان کا شکر: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا چرچا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول ”واما بنعمة ربک فحدث“ کی اتباع کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے اس قول ”التحدث بنعمة اللہ شکر“ (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا چرچا کرنا شکر ہے) کی اتباع کرتے ہوئے۔[2]

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے نعمت کو چھپایا اس نے اس کی ناشکری کی۔ اور جس نے اظہارِ نعمت کیا اور اس کو عام کیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا کر لیا۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت شکر اور حمد و ثنا میں مثالی شخصیت تھی۔

اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکة ذھبا قلت: لا یا رب ولٰکن اشبع یوما واجوع یوما وقال ثلاثا او نحو ھذا فاذا فعلت تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت شکرتک وحمدتک“۔

---

[1] (أخرجه أبو داؤد فی سننه فی باب شکر المعروف عن أبی ھریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه)

[2] (رواہ امام احمد فی مسندہ عن انعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنه ج ۴ ص ۳۷۵)

یعنی: اللہ تعالیٰ نے مجھے پیشکش کی کہ وہ میرے لئے بطحاء مکہ کو سونا بنا دے گا۔ میں نے عرض کی، نہیں، اے میرے پروردگا! لیکن میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا۔ اور ایک دن بھوکا رہوں گا۔ آپ نے تین دفعہ فرمایا۔ اور فرمایا، جب میں بھوکا ہوں گا تو تیری بارگاہ میں عجز وانکساری کروں گا اور تیرا ذکر کروں گا۔ اور جب میں سیر ہوں گا تو تیرا شکر اور حمد وثنا بجالاؤں گا۔[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی رغبت دلائی گئی ہے جس طرح حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندہ نے کہا، اے پروردگار! تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں جیسے تیرے مرتبہ وجلال اور عظیم قدرت کے مناسب ہے۔ ان کلمات نے فرشتوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ انہیں کیسے لکھیں۔ وہ آسمان کی طرف پرواز کر گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی، اے پروردگار تیرے ایک بندہ نے کچھ کلمات کہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم انہیں کیسے لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے کیا کہا ہے؟ حالانکہ وہ بہتر جاننے والا ہے۔

فرشتے عرض کرتے ہیں کہ بندہ نے کہا ہے:

"یارب، لک الحمد کماینبغی لجلال وجھک ولعظیم سلطانک"۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا، ان کلمات کو اسی طرح لکھ دو، جس طرح میرے بندہ نے کہا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ مجھ سے ملے گا تو میں خود اسے ان کلمات کا اجر وثواب عطا فرماؤں گا۔[2]

(۲): ارکان کا شکر: اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد **"اعملوا داود شکرا" (سبا: ۱۳)** میں ارشاد فرمایا ہے کہ شکر ہی عمل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر اس کی وضاحت فرمادی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے آپ نے فرمایا:

"کان النبی ﷺ یقوم من اللیل حتی تنفطر قدماہ فقلت لہ لم تصنع ھٰذا یا رسول اللہ! و قد غفر لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔ قال، افلا اکون عبدا شکورا"۔

[1] (رواہ الترمذی فی کتاب الزھد عن أبی امامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

[2] (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الأدب)

یعنی نبی کریم ﷺ قیام اللیل فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک متورم ہو گئے میں نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ ! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ کی امت کے اگلے اور پچھلوں کے بھی گناہ معاف فرما دیئے گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟[1]

(۳): دل کا شکر: اس سے مراد یہ ہے کہ تجھے یقین ہو کہ تجھ پر اور مخلوق خدا پر تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"مَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ" (نحل: ۵۳)

اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی دی ہوئی ہیں۔

یہ نعمتیں کہیں تجھے محسن و منعم سے دور نہ کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے بچنے کا یہ طریقہ تلقین فرمایا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے صبح کے وقت یہ کلمات کہے، اس نے پورے دن کا شکر ادا کر دیا:

اللھم ما اصبح لی من نعمة او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر۔

اور جس نے یہی کلمات شام کے وقت کہے اس نے اپنی رات کا شکر ادا کر دیا۔[2]

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی، اے اللہ! تو نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا پھر اس میں تو نے اپنی خاص روح پھونکی اور اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور اسے تمام اشیاء کا علم عطا فرمایا اور بہت سی نعمتوں سے نوازا تو اس نے تیرا شکریہ کیسے ادا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اس نے جان لیا کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ تو اس کا یہ جان لینا بھی شکر کرنے کے مترادف ہے۔[3]

مؤمن کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی حمد و ثنا کی توفیق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جس طرح کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: اے پروردگار! میں تیرا شکریہ کیسے ادا کر سکتا ہوں حالانکہ میرا شکر ادا کرنا بھی تو تیری ایک نعمت ہے جس پر شکریہ واجب ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اے داؤد! اب تو نے میرا شکریہ ادا کیا ہے۔[4]

---

[1] (بخاری، کتاب الرقاق، مسلم کتاب صفات المنافقین، ترمذی ابواب الصلاۃ)

[2] (ابو داؤد فی سننہ فی باب مایقول اذا أصبح، و نسائی اللفظ لہ)

[3] (مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۷)

[4] (مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۷)

شکر کرنے والوں کے مراتب:

شکر کرنے والوں کے مراتب درج ذیل ہیں:

(۱):عوام کا شکر: عوام فقط نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

(۲):خواص کا شکر: خواص نعمتوں اور آزمائشوں وابتلاء میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور اپنے تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی تعریف کی ہے جس پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اس کا سامنا اپنی زبان سے حمد وثنا اور دل سے رضا کے ساتھ کرتا ہے اور شیطان کو موقع نہیں دیتا کہ وہ دل میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کو ڈال دے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذا مات ولد العبد قال اللہ لملائکتہ قبضتم ولد عبدی، فیقولون نعم۔ فیقول فماذا قال عبدی؟ فیقولون: حمدک واسترجع، فیقول اللہ تعالی ابنوا العبدی بیتا فی الجنۃ وسموہ بیت الحمد"۔

جب کسی بندے کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے کیا تم نے میرے بندہ کے بچے کی روح کو قبض کر لیا، فرشتے عرض کرتے ہیں، ہاں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ میرے بندے نے کیا کہا۔ وہ عرض کرتے ہیں، اس نے تیری حمد وثنا بیان کی۔[1]

اور کہا:

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تو اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ میرے بندے کیلئے جنت میں ایک گھر تعمیر کر دو۔ اور اس کا نام **بیت الحمد** رکھو۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کیلئے ان لوگوں کو بلایا جائے گا جو تنگی اور خوشحالی دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں۔[2]

(۳):خاص الخواص کا شکر: یہ لوگ منعم اور محسن کی ذات میں اس طرح فنا ہوتے ہیں کہ انہیں نعمت اور آزمائش کا خیال ہی نہیں رہتا۔

اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

"الشکر رویۃ المنعم لا رویۃ النعمۃ"۔

---

[1] (ترمذی، کتاب الجنائز)

[2] (المستدرک ج ۱ ص ۵۰۲)

یعنی شکر، منعم کا خیال کرنا ہے نہ کہ نعمت کا۔[1]

شکر کی فضیلت

شکر تمام مقامات سے اعلیٰ وارفع مقام ہے کیونکہ یہ دل، زبان اور اعضاء وجوارح کو شامل ہوتا ہے اور اسی طرح صبر، رضا، حمد اور ان کے علاوہ بہت سی بدنی اور قلبی عبادات اس میں داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شکر کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی ضد یعنی کفر و ناشکری سے منع کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ" (بقرہ:۱۵۲)

اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔

شکر رسل کرام علیہم السلام کی عظیم صفات میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کو اس صفت سے متصف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۲۰) شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ (النحل ۱۲۱)

ترجمہ: "بلاشبہ ابراہیم (ں) ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے۔ یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے وہ (ہر لمحہ) شکر گزار تھے اللہ کی نعمتوں کیلئے۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو فرمایا:

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (اسراء:۳)

ترجمہ: "بے شک وہ (نوح ں) ایک شکر گزر بندے تھے۔"

محبوبِ خدا ہمارے آقا و مولا رسول اللہ ﷺ عبادت اور قیام اللیل میں انتہائی کوشش کرتے اور مشقت برداشت فرماتے۔ اور بڑے خشوع و خضوع سے اور تمام دنیا سے کٹ کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔ اور جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا، کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ سائل نے یہ گمان کیا تھا کہ آپ کی عبادت طلبِ مغفرت کیلئے تھی لیکن رسول اللہ ﷺ کے جواب نے سائل کی توجہ مقامِ شکر کی طرف دلائی جو مقاماتِ عبدیت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ خود شکر کے مقام رفیع پر فائز تھے۔ اسی طرح صحابہؓ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۸۱)

دیگر مؤمنین کو اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ آپ نے انہیں حکم فرمایا کہ ہر نماز کے بعد دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ذکر و شکر کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

اوصیک یامعاذ لاتدعن فی دبر کل صلوۃ تقول: اللھم اعنی علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک۔

اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد اس دعا کو ترک نہ کرنا۔ اے اللہ! اپنے ذکر، شکر اور حسنِ عبادت پر میری اعانت فرما۔[1]

مقامِ شکر اعلیٰ وارفع مقام ہے اس کا حصول انتہائی مشکل اور کٹھن ہے۔ اس کے حصول کیلئے مجاہدات اور مراقبات کے ساتھ ساتھ صدق، صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاکرین کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ کیونکہ کریم لوگ قلیل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں شاکرین کی قلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا:

"وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْر" (سبا:۱۳)

ترجمہ: "بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں۔"

اور اسی طرح فرمایا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان اور انعام و اکرام کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (نمل:۷۳)

ترجمہ: "اور بے شک آپ کا رب بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنی عظیم نعمتوں اور احسانات کا ذکر فرماتا ہے، اور ہمیں کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ ہم ان عظیم نعمتوں کا ادراک کر سکیں جو ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن کو شمار کرنے اور احاطہ کرنے سے انسان عاجز ہے۔ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں جس طرح کہ اس کا شکر کرنے کا حق ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اللهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ م بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْأَبْصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (نحل:۷۸)

---

[1](ابو داؤد، نسائی، مستدرک: ج: ۱: ص: ۴۹۹)

ترجمہ: ”اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل تا کہ تم شکر ادا کرو۔“

چالیس سال کی عمر میں انسان کا شعور پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب انسان اس عمر کو پہنچتا ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی نعمتوں میں غور و فکر کرتا ہے اور اس کے فضل واحسان کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنا دامن طلب دراز کر کے اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے کہ مولا! مجھے ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”حَتّٰی إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً۔ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ“ (احقاف: ۱۵)

ترجمہ: ”حتیٰ کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی اے میرے رب! مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی ہے اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے۔“

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے والے کو عبادات کی مشقت پر صبر کرنے والے کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا:

”الطاعم الشاکر بمنزلة الصائم الصابر“۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کھا کر شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کے قائم مقام ہے۔[1]

شکر نعمتوں کی بقا اور دوام کا بہترین وسیلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شکر نعمتوں کو اس طرح قابو کر لیتا ہے جس طرح رسی اونٹ کے پاؤں کو۔

حضرت ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

من لم یشکر النعم فقد تعرض لزوالها و من شکرها فقد قید بعقالها۔

یعنی جس نے نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا وہ ان کے زوال سے دوچار ہوا۔ اور جس نے ان کا شکر ادا کیا اس نے ان کو رسی کے ساتھ مقید کر لیا۔[2]

---

[1] (ترمذی، کتاب صفة القیامة)

[2] (ایقاظ الھمم فی شرح الحکم لابن عجیبه ج ۱ ص ۱۰۰)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا اور نعمتوں کے مقابلے میں ناشکری اور نافرمانی کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب وعقاب کو دعوت دینا ہے۔ وہ ذات جس نے نعمتیں عطا کی ہیں وہ ان کو سلب کرنے کی بھی قدرت رکھتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَضَرَبَ اللهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللهِ فَاَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (نحل: ۱۱۲)

ترجمہ: اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ ہے کہ ایک بستی تھی جو امن اور چین سے آباد تھی۔ آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے، پس اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی۔ پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس، ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے وہ انہیں مزید عطا فرمائے گا۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (إبراهيم۷)

اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا۔

در حقیقت شاکر کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا اس کی اپنی ذات کیلئے فائدہ مند ہوتا ہے۔ کیونکہ شکر کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں اور اس کے فضل واحسان، اس کی عظیم محبت، عمدہ تعریف وتوصیف کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ○ (نمل: ۴۰)

ترجمہ: "اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کیلئے اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے اور کریم بھی۔"

صوفیائے کرام مقامِ شکر پر فائز ہو کر جب اس مقام کی عظمت وشان اور فضیلت کو جانتے ہیں تو دوسرے لوگوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں اور جس کو بھی اللہ تعالیٰ کسی دنیاوی یا اخروی نعمت سے نوازتا ہے تو اس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ وہ اس نعمت میں ہی مشغول نہ ہو جائے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ شکر کا طریقہ اختیار کرے تاکہ وہ مزید نعمتوں اور دائمی توفیق کا سبب بنے۔ حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ بھلائی کے راستوں میں سے کوئی راستہ تیرے لئے کھول دے تو اس کو لازم پکڑ لو۔ اس راستہ کی طرف دیکھنے اور اس پر فخر کرنے سے بچو۔ بلکہ اس ذات کے شکر میں مشغول ہو جاؤ جس

نے تجھے یہ توفیق عطا فرمائی ہے۔ کیونکہ تمہارا اس راستہ کی طرف دیکھنا تمہیں اپنے مقام سے گرا دے گا۔ لیکن اس کے شکر میں مشغول ہونا تمہارے لئے مزید انعامات کا سبب ہو گا۔

اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا۔

اسی وجہ سے صوفیائے کرام نے اپنے تمام احوال میں درِ شکر کو لازم پکڑا اور اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مشغول رہے۔ اور اسی کو ہی فاعلِ مطلق، منعم حقیقی اور شکور و کریم تصور کرتے ہوئے عاجزی وانکساری سے اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو گئے۔ اور اس کی جناب میں دعا گو ہوئے کہ وہ ان کے دلوں کو معرفت کے نور سے منور کر دے اور ان کی زبانوں کو اپنی حمد و ثنا میں مشغول کر دے اور ان کے اعمال کو شریعت کے احکام کے تابع کر دے۔ اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے طریقہ کی پیروی کی۔

تنبیہ: شکر کی بحث کے ساتھ ہی کتاب کا تیسرا باب مکمل ہو گیا۔ جس میں وصول الی اللہ کے راہ کی نشاندہی کرنا مقصود تھی۔ لیکن یہاں ایک بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہم نے جو مقامات اس کتاب میں ذکر کئے ہیں وہ تمام کے تمام مقامات نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی مقامات ہیں جن کی تفصیل شیخ محمد ہاشمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ یہ سو مقامات ہیں شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد انصاری ہروی فقیہ حنبلی مفسر قرآن صوفی باصفا متوفی (۴۸۱ھ) نے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس میں آپ نے سو منازل کو ذکر کیا ہے اور آپ نے بڑی عمدہ تقسیم اور وضاحت فرمائی ہے اور راہِ حق کی خواہش رکھنے والوں کیلئے بہت مفید بتایا ہے اور اس کا نام **"منازل السائرین الی الحق عز شانہ"** رکھا ہے۔[1]

---

[1] (شرح شطرنج العارفین ص ۱۲)

(۲) باب نمبر دو: تصوف کے ثمرات

حبِّ الٰہی

حبِّ الٰہی پر مقامات سلوک کی انتہاء ہوتی ہے اور یہی منازل سلوک کی بلند ترین چوٹی ہے، محبت کے بعد اگر کوئی مقام ہے تو وہ اس کا ثمرہ اور تابع شمار ہو گا۔ جیسے شوق، انس اور رضا وغیرہ۔ اور اسی طرح محبت سے قبل مقامات کا شمار اس کے مقدمات میں ہو گا۔ جیسے توبہ، صبر اور زہد وغیرہ۔ [1]

محبت کو کسی تعریف میں محدود نہیں کیا جا سکتا جو اس کی وضاحت کر سکے، بلکہ اس کی تعریفات اس میں مزید خفا اور پوشیدگی کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ تعریفات تو علوم کی، کی جاتی ہیں۔ اور جبکہ محبت علم نہیں بلکہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو محبین کے قلوب پر طاری ہوتی ہے اس کیفیت سے گزر کر ہی اس کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ محبت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے یہ تو سب اس کے آثار، ثمرات اور اسباب ہیں۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کی تعریف میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے اس کی حقیقی تعریف کی ہو، بلکہ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر لوگوں نے اس کی تعریف، اس کے نتائج، آثار اور لوازم سے کی ہے۔ محبت وہ صفت ہے جس کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ بھی متصف ہے۔ محبت کے بارے بہترین قول ابو العباس صنہاجی سے مروی ہے۔ آپ سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ غیرت محبت کی صفات میں سے ہے اور غیرت، ستر کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے محبت کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ [2]

ابن دباغ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کی حقیقی تعریف وہی کر سکتا ہے جس نے اس کا مزہ چکھا ہو۔ اور جس نے اس کا مزہ چکھ لیا، اس کو اپنی خبر نہیں رہتی۔ اس لئے کیسے ممکن ہے کہ اس کی تعریف بیان کی جا سکے۔ یہ اسی طرح ہے کہ نشے میں مدہوش انسان سے نشے کی حقیقت کے بارے میں پوچھا جائے۔ تو عقل پر نشے کے غالب آنے کی وجہ سے اس حالت میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ ان دونوں نشوں میں فرق یہ ہے کہ شراب کا نشہ عارضی ہوتا ہے اور اس کا زائل ہونا ممکن ہوتا ہے۔ اور نشا کافور ہونے پر انسان اس کی حقیقت کو بیان کر سکتا ہے مگر اس کے مقابلے میں محبت کا نشہ دائمی ہوتا ہے۔ جس نے بھی اس نشہ کو چکھ لیا، اس کا دوبارہ ہوش میں آنا ممکن نہیں۔ اس لئے وہ اس کی حقیقت کے بارے میں کیسے خبر دے سکتا ہے۔

[1] (الاحیاء ج ۱۳ ص ۲۵۷۰)

[2] (فتوحات مکیۃ الباب الثامن و السبعون)

جیسا کہ شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے:

یصحو من الخمر شاربوھا　　　　و العشق سکر علی الدوام

شراب پینے والے تو ہوش میں آ جاتے ہیں اور عشق دائمی نشے کا نام ہے۔[1]

اسی وجہ سے جب حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش اور شوق و دیوانگی میں دل کا دھڑکنا محبت کہلاتا ہے۔ پھر آپ نے محبت کے کچھ آثار بیان فرمائے۔

ابو بکر کتانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایام حج کے دوران مکہ مکرمہ میں محبت کا مسئلہ چل نکلا، بڑے بزرگوں نے اس کے بارے میں گفتگو فرمائی۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان بزرگوں نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اب تمہاری باری ہے، بتاؤ کیا بولتے ہو؟ آپ نے اپنے سر کو جھکایا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔ آپ نے فرمایا، محب وہ بندہ ہے جو اپنی ذات سے غافل ہو۔ ہمیشہ اپنے رب کے ذکر مین مشغول رہو۔ اس کے حقوق ادا کرے۔ اپنے دل کی نگاہ سے اس کا مشاہدہ کرے۔ اس کی ہیبت کے انوار نے اس کے دل کو جلا دیا ہو۔ اس نے اللہ کی محبت کا جام طہور پیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے غیب کے پردے اس پر منکشف کر دیئے ہوں۔ اگر وہ گفتگو کرے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بولے، اگر حرکت کرے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اگر ساکن ہو تو اللہ کے ساتھ یعنی اسے باللہ، للہ اور مع اللہ کی کیفیت حاصل ہو۔ بزرگ، آپ کی گفتگو سن کر رونے لگے۔ وہ فرمانے لگے کہ اس سے بڑھ کر محبت کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اے تاج العارفین! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔"[2]

محبت کی دلیل اور اس کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندہ سے محبت، اور بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی بہت سی دلیلیں ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ۔ (مائدہ: ۵۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔

"والذین اٰمنوا اشد حبا للہ" (بقرہ: ۱۶۵)

اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے۔

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" (آل عمران: ۳۱)

---

[1] (مشارق انوار القلوب و مفتاح اسرار الغیوب، لعبد الرحمٰن بن محمد الانصاری ص ۲۱)

[2] (مدارج السالکین ج۳ ص ۱۱)

(اے محبوب!) آپ فرمایئے انہیں کہ اگر تم واقعی محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ۔

"ویحببکم اللہ" یہ محبت کی دلیل، اس کا فائدہ اور اس کی فضیلت ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما و ان یحب المرء لا یحبہ الا للہ و ان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار۔"

یہ تین چیزیں جس میں ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی:

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔

(۲) کسی سے محبت کرے تو اللہ کیلئے کرے۔

(۳) کفر میں لوٹنے کو اس طرح ناپسند کرے جس طرح وہ نارِ جہنم میں پھینکے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔ ادائیگی فرائض سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی چیز محبوب نہیں ہے جس کے ذریعے بندہ میرا قرب حاصل کرے، میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو یقیناً میں اسے پناہ دیتا ہوں۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا، جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ تو جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر آپ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتا

---

[1] (بخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان)

[2] (بخاری کتاب الرقاق باب التواضع)

ہے، تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس اہلِ آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین میں اس کی مقبولیت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسی طرح اسے زمین میں بھی مقبولیت سے نواز دیا جاتا ہے۔[1]

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

"عن ابی الدرداء رضی اللہ تعالی عنہ عن النبی ﷺ انہ قال: کان من دعاء داود علیہ السلام: اللہم انی اسئلک حبک وحب من یحبک والعمل الذی یبلغنی حبک اللہم اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومن الماء البارد"۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! حضرت داؤد یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اے اللہ! میں تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس عمل کا سوال کرتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے۔ اے اللہ! تو اپنی محبت کو میرے نزدیک میری جان، میرے اہل و عیال اور ٹھنڈے پانی کی محبت سے بھی محبوب بنا دے۔[2]

قرآن و سنت ایسے بیان سے بھرے پڑے ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اور ان کے اعمال و اقوال اور اخلاق سے محبت کرتا ہے۔

جس طرح کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔" (آل عمران: ۱۴۶)

اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۲): "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" (مائدہ: ۹۳)

اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے۔

(۳): "إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ" (بقرہ: ۲۲۲)

بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۴): "وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ" (بقرہ: ۲۰۵)

اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(۵): "وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (حدید: ۲۳)

اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی مغرور شیخی باز کو۔

(۶): "وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الضَّآلِّیْنَ" (آل عمران: ۵۷)

---

[1] (بخاری فی صحیحہ فی کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ)

[2] (ترمذی، کتاب الدعوات)

اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا گمراہوں سے۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اپنی محبت کو کثیر احادیث میں ایمان کی شرط قرار دیا ہے، جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"لا یؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من اھلہ و مالہ و الناس اجمعین"۔

تم میں سے کوئی ایک بھی (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ میں اس کے نزدیک اس کے اہل و عیال، مال اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں۔[1]

اس حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو محبت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک بڑا ارفع و اعلیٰ اور انتہائی تاثیر کن مقام ہے۔ پہلے آپ نے ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فضل و احسان کی طرف کرائی اور پھر وضاحت فرمائی کہ ان کی اللہ سے محبت اس کے محبوب مکرم ﷺ سے محبت کا تقاضا کرتی ہے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت پہچاننے کا ذریعہ ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! اللہ سے محبت کرو، کیونکہ وہ تمہیں نعمتیں عطا کرتا ہے۔ اور اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے محبین کو اپنے محبوب کی معیت کی خوشخبری دی ہے، حضرت سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

"ان رجلا سأل النبی ﷺ متی الساعۃ یا رسول اللہ ﷺ؟ قال ما اعددت لھا؟ قال ما اعددت لھا من کثرۃ صلاۃ ولا صوم ولا صدقۃ، ولکنی احب اللہ و رسولہ، قال انت مع من احببت۔ قال انس رضی اللہ تعالی عنہ: فقلنا و نحن کذلک؟ قال! نعم۔ ففرحنا بھا فرحا شدیدا۔"

ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سوال کیا۔ یارسول اللہ ﷺ قیامت کب ہو گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا، تو نے اس کیلئے کیا تیاری کی ہے۔ اس نے عرض کی میں نے اس کیلئے کثیر نماز، روزے اور صدقہ کو جمع نہیں کیا، لیکن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: تو اسی کے ساتھ ہو گا جس سے تو محبت کرتا ہے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! کیا ہمیں بھی یہ کیفیت حاصل ہو گی؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا! ہاں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں! یہ سن کر ہم انتہائی خوش ہوئے۔[3]

---

[1] (رواہ البخاری و مسلم فی کتاب الایمان عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

[2] (ترمذی، کتاب المناقب)

[3] (صحیح بخاری کتاب المناقب، صحیح مسلم کتاب البر عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

محبت کے بارے میں کثیر احادیث وارد ہیں جو تمام اس کی فضیلت و عظمت کی طرف مشیر ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب اللہ تعالیٰ اور اس کی محبت کے مقام رفیع پر فائز ہوئے تو وہ ایمان واخلاق اور ایثار و قربانی میں کمال تک پہنچ گئے۔ محبت کی حلاوت نے مصائب وآلام کی تلخی کو ان کیلئے مانوس بنا دیا۔ اور جذبہ محبت نے انہیں اپنے محبوب کی راہ میں جان، مال، وقت اور ہر قیمتی چیز قربان کرنے پر مجبور کر دیا۔ تا کہ وہ اپنے محبوب کی محبت اور رضا سے بہرہ ور ہو سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اعمال واحکام کا نام ہے اور محبت اس کی روح ہے۔ اور بغیر محبت کے اعمال بے جان ڈھانچوں کی طرح ہیں۔

اسباب محبت:

علمائے کرام نے ان کثیر اسباب کا ذکر کیا ہے جو محبت کا باعث بنتے ہیں، ان میں سے دس اہم اسباب کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱): تلاوت قرآن اور اس کے معانی و مطالب میں غور و فکر کرنا۔

(۲): فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا کیونکہ نوافل کی ادائیگی مقامِ محبت کے حصول کے بعد مرتبہ محبوبیت تک پہنچادیتی ہے۔

(۳): ہر حال میں زبان، قلب اور عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مواظبت اور دوام اختیار کرنا۔ کیونکہ ذاکر کو اس کے ذکر کے مطابق ہی محبت کا حصہ ملتا ہے۔

(۴): خواہشاتِ نفسانی کے غلبہ کے وقت اپنی پسند پر محبوب کی پسند کو ترجیح دینا۔ اور اس کی پسند کی طرف مائل ہونا اگرچہ اس میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

(۵): دل کا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے مطالعہ، مشاہدہ اور اس کی معرفت حاصل کرنے میں مصروف رہنا۔ کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے اسماء، صفات اور افعال کے ذریعے ہوتی ہے وہ لا محالہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

(۶): اس کے فضل واحسان اور ظاہری و باطنی نعمتوں کا مشاہدہ کرنا۔ کیونکہ یہ تمام کی تمام نعمتیں محبتِ الٰہی کی داعی ہیں۔

(۷): اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دل کا انکساری اور تواضع اختیار کرنا۔

(۸): تجلیٔ الٰہی کے وقت اس کے مناجات کیلئے خلوت وعزلت نشینی اختیار کرنا، خصوصًا سحری کا وقت اس کیلئے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ اس وقت میں تلاوت قرآن کرے اور حضورِ قلب کے ساتھ با ادب طریقہ سے اس کی بارگاہ میں حاضر رہے۔ اور پھر توبہ واستغفار کے ساتھ اس مجلس کو برخاست کرے۔

(۹): نیک اور صالح اور سچے محبوں کی ہم نشینی اختیار کرنا اور ان کے عمدہ کلام سے استفادہ کرنا اور ان کی مجلس میں حاضر ہونے کے آداب میں سے ہے کہ ان کے سامنے گفتگو نہ کرے مگر جب کلام میں کوئی مصلحت ہو اور اس میں اپنے لئے اور دوسرے مریدین کیلئے فائدہ ہو۔

(۱۰): اور اس چیز سے اجتناب کرنا جو دل اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہو جائے۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کے ذریعہ محبین منزلِ محبت کو طے کرتے ہیں۔

محبت کی علامات:

بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ زبانی دعوی کرنا تو آسان ہے لیکن انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے نفس سے دھوکہ نہ کھائے بلکہ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ محبت کی علامات اور دل، زبان اور اعضاء وجوارح میں ظاہر ہونے والے اس کے ثمرات کو اچھی طرح جان لے۔ جب وہ اپنے نفس کو دھوکے سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے نفس کو میزان محبت میں رکھ کر پرکھ لے اور اس کی علامات کے ساتھ اس کا جائزہ لے۔ محبت کی علامات کثیر ہیں۔

(۱) جنت میں کشف ومشاہدہ کے ذریعہ محبوب کی ملاقات کی خواہش رکھنا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ دل کسی محبوب کو چاہتا بھی ہو اور اس کی ملاقات اور مشاہدہ کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ اور جب اسے یہ معلوم ہو کہ محبوب کے ساتھ وصال اس دنیا سے کوچ اور موت کے ذریعہ اس سے جدائی کے بغیر ممکن نہیں۔ تو اس پر لازم ہے کہ موت کو محبوب رکھے اور اس سے فرار اختیار نہ کرے کیونکہ موت ملاقات کی کلید ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من أحب لقاء الله أحب الله لقائه"۔

جو اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔[1]

اسی وجہ سے صحابۂ کرام ث اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت کو محبوب رکھتے تھے۔ اور جب انہیں کسی معرکۂ حق وباطل میں شرکت کی دعوت دی جاتی وہ کہتے، خوش آمدید! یہ اللہ سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔

---

[1] (بخاری کتاب الرقاق، مسلم کتاب الذکر، باب من أحب لقاء الله)

(۲) اللہ تعالیٰ کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دے اور یہ صرف ظاہری طور پر نہ ہو۔ بلکہ باطنی طور پر بھی اس کو یہ کیفیت حاصل ہو۔ پس اسے چاہئے کہ وہ طاعت کو لازم پکڑے، سستی اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی سے اجتناب کرے۔ کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔

اسی لئے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

تعصی الالہ و انت تظہر حبہ　　　ھٰذا لعمری فی القیاس بدیع

لو کان حبک صادقا لاطعتہ　　　ان المحب لمن یحب مطیع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ تو اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ میری عمر کی قسم! یہ بڑا عجیب قیاس ہے، اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا، کیونکہ محب اپنے محبوب کیلئے مطیع ہوتا ہے۔

اسی مفہوم کو کسی شاعر نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

و اترک ما اھوی لما قد ھویتہ　　　فارضی بما ترضی و ان سخطت نفسی

میں اپنی پسند کو تیری پسند کیلئے ترک کر دیتا ہوں۔ تیری رضا پر راضی ہو جاتا ہوں، اگرچہ میرا نفس ناراض ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی طاعت و محبت، اقوال و افعال اور اخلاق میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو مستلزم ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" (آل عمران: ۳۱)

(اے محبوب ﷺ!) آپ فرمایئے انہیں کہ اگر تم واقعی محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ تعالیٰ اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو۔

(۳) کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، نہ تو اس کی زبان ذکر سے سست پڑے اور نہ ہی اس کا دل ذکر سے خالی ہو کیونکہ جو کسی چیز سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا اکثر ذکر کرتا ہے۔

خیالک فی قلبی و ذکرک فی فمی　　　و مثواک فی قلبی فاین تغیب

تیرا خیال میرے دل میں ہے اور تیرا ذکر میری زبان پر۔ اور تیرا ٹھکانا میرے دل میں ہے۔ تو میری نگاہوں سے کیسے اوجھل ہو سکتا ہے۔

(۴) خلوت، مناجاتِ الٰہی اور تلاوت قرآن پاک سے مانوس ہو پس اس کیلئے ضروری ہے کہ تہجد پر مواظبت اختیار کرے اور رات کے پر سکون لمحات کو غنیمت جانے۔ محبت کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ خلوت میں لذت محسوس کرنا اور اس کے ساتھ مناجات میں آسودگی خیال کرنا۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس نہ کرے لیکن ہر وہ گھڑی جو اللہ کے ذکر وطاعت سے خالی گزر جائے۔ اس پر اسے افسوس کرنا چاہئے۔ اور اس غفلت پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔

(٦) اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے لطف اندوز ہو۔ اور اس کو بوجھل نہ سمجھے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں پر شفقت اور نرمی سے پیش آئے اور اس کے تمام دشمنوں سے سختی سے پیش آئے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" (فتح: ۲۹)

کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقت ور ہیں آپس میں بڑی رحم دل ہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی عظمت وہیبت کے سامنے اپنی محبت میں اس سے ڈرنے والا ہو۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خوف، محبت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عظمت کا ادراک ہیبت کا سبب بنتا ہے۔ جس طرح جمال کا ادراک محبت کا سبب بنتا ہے۔ محبین کو اپنے مراتب کے مطابق مختلف قسم کے خوف لاحق ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کو اعراض کا خوف ہوتا ہے کسی کو حجاب کا اور کسی کو اس کی بارگاہ سے دوری کا۔ اسی لئے بعض محبین کا قول ہے: محبوب کو میں نے جان لیا اور میں اس سے خائف ہوں تجھ سے وہی محبت کرے گا جو تجھے جاننے والا ہو گا۔

(۹) محبت کو چھپانا اور دعویٰ محبت سے اجتناب کرنا اس کے عظمت وجلال اور ہیبت کی وجہ سے محبت اور وجد کے اظہار کرنے سے بچنا۔ کوئی محب جب اس راز کو چھپانے سے عاجز آگیا تو اس نے کہا۔ وہ اپنے راز کو چھپاتا ہے لیکن آنسو اس کے راز کو آشکارا کر دیتے ہیں اور سانسیں اس کے وجد کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا:

و من قلبه مع غيره كيف حاله؟ و من سره في جفنه كيف يكتم؟

جس کا دل کسی غیر کے ساتھ لگا ہو تو اس کا کیا حال ہو گا؟ اور جس کا راز اس کی پلکوں میں ہو وہ اس کو کیسے چھپا سکتا ہے؟

(۱۰) اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس اور رضا حاصل ہو۔ اور اس انس کی علامت یہ ہے کہ اس کا دل مخلوق کے ساتھ نہیں لگتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اسے لوگوں کے ساتھ ملنا پڑ جائے تو وہاں بھی اسے جلوت میں خلوت کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ان لوگوں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں علم حقیقت حال تک پہنچا دیتا ہے۔ انہیں یقین کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے وہ امور ان کیلئے آسان ہو جاتے ہیں جو دنیادار لوگوں کیلئے مشکل

ہوتے ہیں۔ وہ اس شئ سے مانوس ہوتے ہیں جس سے جاہل خوف محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے ظاہری ابدان کے ساتھ اہلِ دنیا کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں اور ان کی ارواح عرشِ اعلیٰ کے ساتھ معلق ہوتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے خلفاء اور اس کے دین کے داعی ہیں۔

مراتب محبت:

علمائے کرام نے محبت کے دس مراتب بیان کئے ہیں:

(۱) علاقہ: محبوب کے ساتھ دل کے وابستہ ہو جانے کو علاقہ کہتے ہیں۔

(۲) ارادہ: محبوب کی طرف دل کے میلان اور اس کی خواہش کو ارادہ کہتے ہیں۔

(۳) صبابہ: محبوب کی طرف دل کا رجحان اتنا ہو کہ وہ دل کو قابو نہ کر سکے۔ جس طرح کہ پانی جس وقت بلندی سے پستی کی طرف گرتا ہے تو اس پر کنٹرول نہیں ہو سکتا۔

(۴) الغرام: اس سے مراد وہ محبت ہے جو دل کے ساتھ لازم ہو جائے کہ اس سے جدا نہ ہو جس طرح قرض خواہ مقروض کو لازم ہوتا ہے۔

(۵) وداد: محبت جب خالص اور صاف ہو جائے تو اسے وداد کہتے ہیں۔

(۶) شغف: محبت کا دل کے غلاف تک پہنچ جانا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ شغف یہ ہے کہ محب، محبوب کی جفا کو جفا نہ سمجھے بلکہ اسے عدل اور وفا سمجھے۔

(۷) عشق: محبت جب حد سے تجاوز کر جائے کہ اس سے ہلاکت کا خوف ہو تو اسے عشق کہتے ہیں۔

(۸) تنیم: اس سے مراد یہ ہے کہ محبت، محب کو اپنا تابع اور مطیع بنا لے۔

(۹) تعبد: اس کا درجہ تنیم سے اوپر ہے۔ کیونکہ غلام کو اپنی ذات پر کسی قسم کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

(۱۰) الخلہ: یہ وہ مقام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ کو عطا فرمایا گیا۔ اور خلت سے مراد وہ محبت ہے جو محب کے قلب و روح پر چھا جاتی ہے حتیٰ کہ محبوب کے علاوہ یہاں کوئی چیز نہیں بچتی۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اس زندگی کا راز دو حرفوں "حاء اور با" پر قائم ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

واحسن حالۃ انسان صدق   واکمل وصفہ حاء و با

انسان کی بہترین حالت صدق ہے اور اس کا مکمل ترین وصف حاء اور باء یعنی حب ہے۔

محبت کی وجہ سے احکام شریعت پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے:

لولاک سرالوجود ماطاب عیشی ولاوجودی
ولاترنمت فی صلاتی ولارکوعی ولاسجودی

اے سروجود! اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہی میری زندگی خوشگوار ہوتی اور نہ ہی میرا وجود، اور نہ ہی میری نماز میں ترنم ہوتا اور نہ ہی میرے رکوع و سجود میں۔

محبت جب دل میں اپنا ٹھکانا بنالیتی ہے تو اس سے اس فانی دنیا کو نکال دیتی ہے۔ پھر محب انتہائی آرام دہ اور آسودہ زندگی گزرتا ہے۔ اور کسی قسم کے غم سے دوچار نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کسی آدمی کے پاس سے گزرے جو قبر کے پاس بیٹھ کر رو رہا تھا۔ انہوں نے رونے کا سبب پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ میرا محبوب فوت ہو گیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا! تو نے ایسے محبوب کے ساتھ دل لگا کر بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر تو اس ذات سے محبت کرتا جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ تو تو فراق کے عذاب سے دوچار نہ ہوتا۔

ہم اپنے ارد گرد کے ماحول میں بہت سی مثالیں دیکھتے ہیں کہ جب کوئی عاشق اپنے محب کی ملاقات سے مایوس ہو جاتا ہے۔ تو وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی طرح دنیاوی مال و متاع پر مرمٹنے والے کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ خودکشی آگ میں جلنا یا پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگا دینا روزمرہ زندگی کے معمول بن چکے ہیں۔ دنیاوی محبت میں ناکام ہونے والوں کا عام طور پر یہی انجام ہوتا ہے۔

جب دنیا پر مرمٹنے والوں کا یہ حال ہے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے عاشقین کا کیا حال ہو گا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور اس کو اپنا پروردگار تسلیم کیا اور محمد ﷺ کو اپنا رسول اور اسلام کو اپنا دین مانا ان میں بعض تو ایسے تھے جنہوں نے موت سے محبت کی اور اس کو خوش آمدید کہا تاکہ موت کے بعد اپنے احباب کی ملاقات سے سرفراز ہوں۔ جس طرح کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سکرات موت کے وقت ارشاد فرمایا کہ کل محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ سے ملاقات ہو گی۔ اور بعض نے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حصول کیلئے میدانِ جنگ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کرنے اور دنیا کی کسی حقیر چیز کیلئے جان قربان کرنے میں بڑا فرق ہے۔

محبت کے دوران حاصل ہونے والا بہترین ثمرہ باہمی الفت ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یُحِبُّهُمۡ وَیُحِبُّوۡنَهٗ۔ (مائدہ:۵۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

اسی طرح باہمی رضا اور ذکر بھی اسی کا ثمرہ ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ" (بینہ:۸)

اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔

ذکر کے بارے میں فرمایا:

فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ۔ (بقرہ:۱۵۲)

"سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر کچھ ایسے لوگوں سے ہوا جن کے بدن عبادت کی وجہ سے کمزور اور رنگ متغیر ہو چکے تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے عرض کی۔ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ فرمایا اس کی عبادت کس لئے کرتے ہو؟ عرض کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگ سے ڈرایا تو ہم اس سے ڈر گئے۔ ارشاد فرمایا! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے امان دے دیا ہے جس سے تم ڈرتے ہو۔ آپ کچھ آگے بڑھے تو وہاں ایسے لوگ ملے جو پہلے لوگوں سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ آپ نے فرمایا: تم کس وجہ سے اس کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت اور اپنے اولیائے کرام کیلئے تیار کردہ نعمتوں کا شوق دلایا۔ ہم اپنی عبادت کے بدلے میں اس کی خواہش کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں عطا کر دیا ہے۔ پھر آگے بڑھے تو کچھ اور عبادت گزاروں سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے محب ہیں۔ ہم اس کی عبادت نہ تو نارِ جہنم کے خوف سے کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی جنت کے شوق میں بلکہ ہماری عبادت اس کی محبت اور عظمت و جلال کی وجہ سے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: تم ہی اللہ کے حقیقی ولی ہو۔ مجھے حکم ہوا کہ میں تمہارے ساتھ ٹھہروں اور آپ ان لوگوں کے درمیان مقیم ہو گئے۔

یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ لوگوں کی ہمتیں مختلف ہیں۔ اور ان میں سے بعض دنیا کے طالب، اور بعض آخرت کے اور بعض ذاتِ باری تعالیٰ کے طالب ہیں۔ کسی بزرگ نے کسی قاری کو یہ آیت کریمہ "منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرۃ" (آل عمران:۱۵۲) تلاوت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا اللہ کے چاہنے والے کہاں ہیں؟ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کچھ لوگ اللہ کی عبادت رغبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اور یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ اور کچھ لوگ اس

کے خوف کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں تو یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ اور کچھ لوگ اس کی عبادت اس کا شکر ادا کرنے کیلئے کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کا وصف یوں بیان کیا ہے:

فما مقصودهم جنات عدن　　　ولا الحور الحسان ولا الخيام
سوى نظر الجليل وذا مناهم　　　وهذا مقصد القوم الكرام

ان کا مقصود نہ تو جنت عدن ہے۔ اور نہ ہی حسین حور و قصور، سوائے اللہ تعالیٰ کی نظر کرم کے یہ ان کی آرزو ہے اور صوفیائے کرام کا بھی یہی مقصد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ایسے بھی بندے ہیں کہ جب رات ان پر سایہ فگن ہوتی ہے تو خوفِ خدا کی وجہ سے ان کی آہیں نکل جاتی ہیں اور جب صبح ہوتی ہے تو ان کے رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اذا ما الليل اقبل كابدوه　　　ويسفر عنهم وهم ركوع
اطار الشوق نومهم فقاموا　　　واهل الامن فى الدنيا خشوع

جب رات چھاتی ہے تو وہ اس کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں اور جب فجر طلوع ہوتی ہے تو وہ رکوع میں ہوتے ہیں، شوق نے ان کی نیندوں کو اڑا دیا تو وہ عبادت کیلئے کھڑے ہو گئے اور اہلِ امن دنیا میں مست ہیں۔

اولیاء اللہ کے اجسام عبادت پر صبر کرتے ہیں اور ان کے پاؤں تہجد کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مستجاب الدعا ہوتے ہیں۔ اور اپنی رات رکوع و سجود میں گزار دیتے ہیں۔

ندا دینے والا انہیں ندا دیتا ہے:

يا رجل الليل جدوا　　　رب صوت لا يردوا
لا يقوم الليل الا　　　من له عزم وجد

اے رات کو عبادت کرنے والو! کوشش کرو۔ بہت سی دعائیں ایسی ہیں جن کو رد نہیں کیا جا سکتا، رات کا قیام وہی کر سکتا ہے جو محتاط اور محنتی ہو۔

جب وہ تھوڑا سا آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو شوق انہیں بے چین کر دیتا ہے۔ تو وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پر وجد و جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو وہ بے خود ہو جاتے ہیں۔ ذاتِ کبریاء کا طالب انہیں پکارتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مناجات کرنے پر ابھارتا ہے۔

حثوا امطایا کم وجدوا
ان کان لی فی القلوب وجد

قدآن ان تظھر الخبایا
وتنشر الصحف فاستعدوا

اپنی سواریوں کو تیار کرو اور کوشش جاری رکھو۔ اگر تمہارے دلوں میں وجد ہے، اب راز کو ظاہر کرنے کا وقت آ گیا۔ نامۂ اعمال پھیلا دیئے جائیں گے۔ اس کیلئے تیاری کر لو۔

ان کے بستر ان کے مشتاق ہوتے ہیں۔ ان کے سرہانے ان پر افسوس کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں نیند کیلئے بے قرار ہوتی ہیں اور ان کے پہلو آرام کے خواہشمند لیکن رات کا وقت ان کیلئے حصولِ مراتب کیلئے بہترین وقت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ رات کی تاریکیوں میں نیند سے منہ موڑنے کو طویل قیام کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں اور اپنے پروردگار کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اور اس کے قرب سے مانوس ہوتے ہیں۔ اگر وہ ذات ایک لمحہ کیلئے بھی ان سے اوجھل ہو جائے تو وہ مضطرب اور بے چین ہو جائیں۔ وہ اپنی نماز تہجد کو سحری تک طویل کر دیتے ہیں اور شب بیداری کے ثمرات کے منتظر رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ محبین کیلئے جلوہ افروز ہوتا ہے اور ان سے دریافت فرماتا ہے کہ میں کون ہوں؟ وہ عرض کرتے ہیں۔ تو ہمارا مالک و مولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ تم میرے محبوب اور میری محبت و عنایت کے اہل ہو۔ یہ ہے میرا چہرہ اس کا مشاہدہ کر لو۔ اور یہ ہے میرا کلام اسے سن لو۔ اور یہ جام طہور اس کو پی لو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ○ (دھر: ۲۱)

اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب۔

جب وہ یہ جام نوش جان کر لیتے ہیں تو ان پر طرب و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جب ان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اپنے رب کے ذکر کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی ذات سے بے خود اور بے خبر ہو جاتے ہیں۔ جب بادِ صبا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو کنعان پہنچائی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہوا۔ اس کی خبر نہ تو اہلِ کنعان کو ہوئی اور نہ ہی ان کو جہاں سے چلی تھی۔ اور نہ ہی یہودا کو اور نہ ہی قاصد کو۔

محبت وہ فطرتی امر ہے جو پاکیزہ نفس میں پروان چڑھتی ہے۔ اس سے انسان کو اپنے نفس کی حقیقت کا علم اور اپنے نفس کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور جوں جوں محبت زیادہ ہوتی ہے ایمان کامل ہوتا جاتا ہے اور محبت کے مطابق انسان کو سعادت اور آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ حب الٰہی، ذوقِ انسانی کے احاطہ سے ماوراء ہے۔ کیونکہ یہ محبت نفسِ انسانی کو راضیہ اور مطمئنہ کے درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔

صوفیائے کرام کی محبت حرص اور لالچ اور خواہشات سے پاک اور خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتی ہے۔ ان کی محبت میں کسی علت یا سبب کا دخل نہیں ہوتا۔ اور اپنے مولیٰ کی رضا کے علاوہ ان کے عشق کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں! سب لوگ نارِ جہنم کے ڈر سے عبادت کرتے ہیں اور اس سے نجات کو اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں یا اس لئے عبادت کرتے ہیں تاکہ جنت میں اقامت پذیر ہوں۔ اور شرابِ طہور کے جام اور سلسبیل کو نوش جان کریں، یا جنت کے محلوں میں آرام کریں لیکن میں اپنی محبت کا کوئی بدل نہیں چاہتی۔

یعنی آپ کے نزدیک زندگی اللہ تعالیٰ سے محبت اس کے احکام کو بجالانے کا نام ہے کیونکہ محب اپنے محبوب کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام کو راہِ محبت سے شناسائی تھی اس لئے وہ اس راہ پر چل نکلے۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے! میرا بندہ نوافل کے ساتھ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور عطا فرماتا ہوں۔ اور اگر وہ میری پناہ طلب کرتا ہے تو میں اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہوں۔ (بخاری)

محبت، معرفتِ الٰہی اور وصول الی اللہ کی بنیاد ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

"ان تحب ما احب اللہ و تبغض ما ابغض اللہ و تفعل الخیر کلہ و ترفض کل ما یشغل عن اللہ و الا یخاف فی اللہ لومۃ لائم مع العطف للمؤمنین و الغلظۃ علی الکافرین و اتباع رسول اللہ ﷺ فی الدین۔"

محبت یہ ہے کہ تو اس چیز کو دوست رکھے جس کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے، اور اس چیز کو ناپسند کرے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے، اور تو ہر نیک کام کرے اور ہر اس چیز کو دور پھینک دے جو تجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کرے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں تجھے کسی ملامت کرنے والے کا خوف نہ ہو۔ مؤمنوں کے ساتھ تو نرم خو ہو اور کافروں کے ساتھ سخت ہو۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی دین میں پیروی کرے۔

آپ نے مزید فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کی نشانی یہ ہے کہ وہ اس کے حبیب ﷺ کے اخلاق، افعال، اوامر اور آپ کی سنتوں کی اتباع کرتا ہے۔

شیخ کبیر سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اپنے نفس کو تواضع کی تعلیم دیتا ہے۔ اور علائق دنیا سے قطع تعلق کرلیتا ہے۔ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے اور ماسوی اللہ اپنے نفس کیلیئے کوئی خواہش نہیں چھوڑتا اور اس کی عبادت میں مصروف رہتا ہے۔

شیخ محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی حقیقت اس کے ذکر سے دائمی انس ہے۔

شیخ ابن دباغ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا مطلوب و مقصود ملاء اعلیٰ میں دائمی زندگی رب کریم کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ و مطالعہ جمالِ الٰہی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اور یہ سعادت ان نفوس قدسیہ کو حاصل ہوتی ہے جو ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات کا مرکز ہوں۔ محبتِ حقیقی اور انوارِ الٰہی کے شوق کی طرف لے جانے والے تمام علمی اور عملی راستے ان کیلیئے آسان کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ نفوس قدسیہ جب اس سعادت ابدیہ سے سرفراز ہوتے ہیں تو انہیں وہ لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے جو نہ کسی آنکھ نے آج تک دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوا۔ اس لئے ہر صاحبِ عقل کو اس عظیم مقصد کے حصول اور سلسبیل کے سرچشمہ میں وارد ہونے میں کوشش کرنی چاہیئے جس تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے کیونکہ عاشق ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے وہ آسمانی بجلی کا نظارہ اس لئے کرتا ہے کہ اس کی بارگاہ سے ہو کر آئی ہے۔ اور اس کے بے مثل جمال کی خبر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجلی کی چمک ان عاشقوں کے جگر کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

اسی قسم کے ذوق سے صوفیائے کرام کو محبتِ الٰہی کے سائے تلے اطمینان و رضا کی دولت میسر ہوئی۔ اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ روحانی زندگی کے مقابلہ میں دنیاوی ساز و سامان اور اس کی خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا ان کیلیئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں خوش و خرم اور اس کے قرب سے سرفراز ہوتے ہیں اور اس کے فضل و احسان اور جود و سخا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ۔ (بینہ:۸)

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔

نیز ارشاد فرمایا:

یُحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗ۔ (مائدہ:۵۷)

اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے۔

یعنی پہلے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جاتا ہے پھر ان کو اپنی محبت کیلئے چن لیتا ہے اور یہی لوگ اس کی مخلوق میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور اس کے خاص دوست ہیں۔

فراست

تعریف: سید جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی تعریف بیان فرماتے ہیں: "فراست لغت میں کسی چیز میں غور و فکر کرنے کا نام ہے۔ اور اہلِ حقیقت کی اصطلاح میں غائب کا مشاہدہ کرنا اور علم یقینی تک رسائی حاصل کرنا ہے"۔

عارف باللہ ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ خیال جو صاحبِ فراست کے دل میں اچانک رونما ہوتا ہے یا اس سے مراد وہ وارد ہے جو اس کے دل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جب دل صاف ہو تو یہ غالبًا صحیح ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللہ۔" (ترمذی)

مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس کی قوت وطاقت قربِ الٰہی اور معرفت کے مطابق ہوتی ہے۔ جوں جوں قرب و معرفت میں اضافہ ہو گا تو فراست میں صداقت آتی جائے گی۔ کیونکہ روح کو جب بارگاہِ الٰہی کا قرب حاصل ہوتا ہے تو اس میں حق کے علاوہ کسی اور چیز کا ظہور نہیں ہوتا۔

کشف وہ نور ہے جو سالکین کو منازلِ سلوک کے دوران حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہری حجاب کو اٹھا دیتا ہے اور مادی اسباب کو زائل کر دیتا ہے۔ یہ انہیں مجاہدہ، خلوت اور ذکر کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی بصارت، بصیرت میں تبدیل ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے ہر چیز کو عیاں دیکھتے ہیں اور وہ زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ عالمِ امر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ کیفیت اس شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی جو خواہشاتِ نفسانی، شیطانی وساوس، شکوک وشبہات، عقائدِ باطلہ میں مبتلا ہو۔ کیونکہ یہ ان روشن اور قلوبِ سلیمہ کیلئے خاص ہے جو دنیا کی تاریکیوں سے پاک ہو چکے ہیں اور شکوک وشبہات اور مادی کثافتوں سے منزہ ہیں۔

جو شخص اپنی نظر کو محارم سے بچاتا ہے اور اپنے نفس کو شہوتوں سے روکتا ہے اور اپنے باطن کو اللہ تعالیٰ کے مراقبہ سے معمور کرتا ہے اور اکلِ حلال کا عادی ہوتا ہے۔ اس کی فراست اور کشف کبھی خطا نہیں کرتا۔ جو شخص اپنی نظر کو محارم سے نہیں بچاتا، اس کا تاریک نفس اس کے دل کے آئینہ کو گدلا کر کے اس کے نور کو مٹا دیتا ہے۔

کشف کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ جب اپنے ظاہری حواس سے باطنی حواس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی روح اس کے حیوانی نفس پر غالب آجاتی ہے۔ روح انتہائی لطیف اور ہر چیز کو آشکارا کر دیتی ہے۔ اس طرح بندے کو کشف کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسے الہام ہونے لگتا ہے۔

عظیم مؤرخ ابن خلدون اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پھر عموماً مجاہدہ خلوت اور ذکر کے بعد ظاہر حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور سالک عالمِ امر سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ صرف ظاہری حواس سے ان چیزوں کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ اور روح کا تعلق بھی عالم امر سے ہے۔ اور اس کشف کا سبب یہ ہے کہ روح جب ظاہری حس سے باطنی حس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ظاہری حس کے احوال کمزور اور روح کے احوال قوی ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا حکم غالب اور وہ ارتقاء پذیر ہو جاتی ہے۔ اس عمل میں ذکر معاون کا کام دیتا ہے کیونکہ وہ روح کی ترقی کی غذا ہے۔ روح اسی طرح پروان چڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ علم کے بعد مشاہدہ کا مقام آتا ہے۔ ظاہری حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں اور نفس انسانی اتنا صاف اور شفاف ہو جاتا ہے کہ آسانی سے ہر چیز کا ادراک کر لیتا ہے۔ اس وقت سالک کو علم لدنی اور فیوضاتِ الٰہیہ کا حصول ہوتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ کشف اکثر اوقات صاحبِ مجاہدہ کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کائنات کے حقائق جان لیتا ہے جو دوسرے لوگ نہیں جان سکتے۔ صحابہ کرام صاحبِ مجاہدہ تھے۔ اور ان کو سب کیفیات حاصل تھیں لیکن وہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے اس قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ اہلِ طریقت صحابہ کرام کے طریقہ کار پر عمل پیرا رہے رسالہ قشیریہ میں صاحبِ کشف صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ کشف وراثتِ محمدیہ ہے جو صحابہ کرام کو اپنے صدق، اخلاص اور طہارتِ قلب کی وجہ سے عطا ہوئی۔

کشف اور رسول اللہ ﷺ:

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد میں آنے والے صوفیائے کرام کے مکاشفات ذکر کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ کے کچھ مکاشفات ذکر کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آپ کا کشف معجزہ ہے اور صحابہ کرام اور صوفیائے عظام کا کشف کرامت ہے۔ اور ولی کی ہر کرامت اس کے نبی کے معجزے کے قائم مقام ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اقامت کے بعد آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور آپ نے ارشاد فرمایا:

"اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظھری" (بخاری، مسلم)

اپنی صفیں سیدھی کرو۔ اور باہم مل کر کھڑے ہو جاؤ۔ بے شک میں تمہیں اپنی پشت پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔

چونکہ کشف عالم حس سے بالاتر ہوتا ہے اور اس میں زمان و مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کیلئے قریب و بعید کا مشاہدہ برابر تھا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کو ایک غزوہ میں بھیجا اور جھنڈا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمایا۔ یہ تینوں حضرات اس غزوہ میں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں بیٹھ کر اس واقعہ کی خبر دے دی۔ آپ نے بیان فرمایا کہ جھنڈا پہلے زید نے پکڑا پھر ان کو شہید کر دیا گیا۔ پھر جھنڈا حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ پھر جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لیا تو آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جھنڈا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لیا تو آپ کو فتح حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد غزوہ موتہ کے موقع پر فرمایا۔

کشف اور قرآن:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ نُرِیٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ (انعام: ۷۵)

اور اسی طرح ہم نے دکھادی ابراہیم علیہ السلام کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں تین واقعات ذکر فرمائے ہیں:

(۱): حضرت خضر علیہ السلام کو کشف ہوا کہ وہ کشتی جس پر وہ دریا پار کرنے کیلئے سوار ہوئے تھے۔ اس کو ظالم حکمران اپنے قبضہ میں لے لے گا تو آپ نے اس میں سوراخ کر کے اسے عیب دار کر دیا تاکہ اسے ظالم کے شر سے بچایا جا سکے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا (کهف: ۷۹)

وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں۔ سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی سے۔

(۲): آپ کو بچے کے بارے میں کشف ہوا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو یہ والدین کو کفر میں مبتلا کرے گا اور انہیں قتل کر دے گا۔ پس آپ نے اس کے مؤمن والدین پر رحم کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کو قتل کر دیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكٰوةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝ (الکھف: ۸۰، ۸۱)

ترجمہ: "اور وہ جو لڑکا تھا تو (اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اس کے والدین مؤمن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کر دے گا انہیں سرکشی اور کفر پر۔ پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔"

(۳): آپ کو کشف ہوا کہ اس دیوار کے نیچے خزانہ ہے یہ ان دو یتیم بچوں کا تھا جن کا والد نیک آدمی تھا۔ آپ نے خزانہ کی حفاظت کیلئے بچوں پر رحم کرتے ہوئے اور ان کے والد سے محبت کی وجہ سے اس دیوار کو بغیر کسی اجرت و معاوضہ کے تعمیر کر دیا۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" (کھف: ۸۲)

باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی۔

کشف اور صحابہ کرام:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کی صدیقیت کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِیْ جَآئَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ" (الزمر: ۳۳)

اور وہ ہستی جو سچ کو لے کر آئی اور جس نے سچ کی تصدیق کی۔

ہم یہاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کشف کا ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں جو حقیقتِ حال سے پردہ اٹھانے کیلئے کافی ہے ورنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و محاسن کو بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے مجھے بلایا اور ارشاد فرمایا کہ میرے بعد میرے اہل و عیال میں تیرے سوا کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جس کو غنی دیکھنا زیادہ محبوب ہو۔ اور تیرا تنگ دست ہونا مجھ پر شاق ہے۔ میں نے تمہیں "عالیہ" کی زمین سے بیس وسق کھجوریں عطا کی تھیں۔

یہ ورثاء کا مال ہے اور یہ تیرے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میں نے عرض کی کہ میری تو ایک ہی بہن اسماء ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خارجہ کی بیٹی یعنی ان کی بیوی حاملہ ہے اور میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ یہ لڑکی ہے۔ پس اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ آپ فرماتی ہیں کہ آپ کے وصال کے بعد ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ علامہ سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ اس واقعہ میں آپ کی دو کرامات ہیں:

(۱): آپ کا خبر دینا کہ آپ کا وصال اسی مرض میں ہو گا۔ کیونکہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ وراثت کا مال ہے۔

(۲): یہ خبر دینا کہ آپ کے ہاں بچی پیدا ہو گی اور اس کو ظاہر کرنے میں راز یہ تھا کہ آپ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ آپ نے اس ہبہ کو ان سے واپس لے لیا تھا جس پر انہوں نے ابھی قبضہ نہیں کیا تھا۔ تو پھر آپ کو اس بات سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا کہ انہیں وراثت سے کتنا حصہ ملے گا۔ اس لئے آپ نے انہیں بتایا کہ یہ وراثت کا مال ہے جس میں ان کے ساتھ دو بھائی اور دو بہنیں شریک ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ عظیم شخصیت ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو الہام ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی قوموں میں بعض لوگ ایسے تھے جن پر الہام کیا جاتا ہے۔ اگر میری امت میں کوئی ہے تو وہ عمر ہے۔ (بخاری، مسلم)

آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اور جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان امتوں میں صاحب الہام موجود تھے تو اس امت میں ان کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔

علامہ تاج سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لشکر کا سردار بنا کر بھیجا اور انہیں بلاد فارس پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ باب نہاوند کا محاصرہ کرتے ہوئے ان کے لشکر پر سخت وقت آ گیا۔ دشمن کی تعداد بڑھ گئی۔ اور قریب تھا کہ مسلمان شکست کھا جاتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت مدینہ طیبہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ نے دورانِ خطبہ بلند آواز سے پکارا "یا سارية الجبل۔ من استرعى الذئب

الغنم قد ظلم" (اے ساریہ! پہاڑ کو لازم پکڑو جو بکریوں کو بھیڑیوں سے چرواتا ہے تحقیق وہ ظلم کرتا ہے) اللہ تعالیٰ نے ساریہ اور اس کے لشکر کو نہاوند میں آپ کی آواز سنوادی۔ پس وہ آواز سن کر پہاڑ کی طرف لپکے اور کہنے لگے کہ یہ امیر المؤمنین کی آواز ہے۔ اس طرح وہ خطرے سے نجات پاکر دشمن پر غلبہ پاگئے۔

علامہ سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد اظہارِ کرامت نہ تھا بلکہ آپ کو کشف حاصل ہوا تھا اور آپ اپنی آنکھوں سے لشکر کا مشاہدہ فرمارہے تھے۔ گویا کہ آپ درحقیقت ان کے درمیان موجود تھے۔ آپ کی مکمل توجہ ان کی طرف مبذول تھی۔ اور جب مسلمانوں پر مشکل وقت آیا تو آپ نے ان کے امیر کو حکم دیا کہ پہاڑ کی طرف توجہ کرو۔

اس قصہ سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱): سینکڑوں میل کی دوری سے مشاہدہ کرنا اور یہی صحیح کشف ہے۔ یہ آج سے چودہ سو سال قبل کا واقعہ ہے جب ٹیلیویژن کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

(۲): اتنی دوری کے باوجود حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک آپ کی آواز کا پہنچنا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبیلہ مذحج کے کچھ لوگوں سے ملاقات کی جن میں اشتر نخعی بھی تھا۔ آپ نے جب اسے غور سے دیکھا تو فرمایا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ایک دن مسلمانوں کو مصیبت میں مبتلا کرے گا۔ تو وہی ہوا جو آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

ابن عساکر طارق بن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی آدمی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بات کرتا تو جب وہ آدمی دورانِ گفتگو جھوٹ بولتا تو آپ اسے روک دیتے وہ پھر آپ سے محوِ کلام ہو جاتا اور دورانِ گفتگو جب جھوٹ بولتا تو آپ اسے روک دیتے۔ تو وہ عرض کرتا میں نے جو آپ کے ساتھ گفتگو کی وہ حق ہے سوائے ان باتوں کے جن سے آپ نے روکا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب کوئی جھوٹ بولتا تو آپ فوراً پہچان لیتے۔

امام بیہقی نے "دلائل" میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر دی گئی کہ اہلِ عراق نے اپنے گورنر کو پتھر مارے ہیں۔ آپ غصہ کی حالت میں گھر سے نکلے اور نماز میں مشغول ہوگئے۔ اور نماز میں بھول گئے۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا، اے اللہ! انہوں نے میری نماز میں خلل ڈالا ہے تو بھی ان کو خلط ملط کر دے۔ اور ان پر ثقفی نوجوان مسلط کر دے

جو ان پر دور جاہلیت کی طرح حکومت کرے۔ نہ تو وہ ان کے نیکوکاروں سے عذر قبول کرے اور نہ ہی ان کے سیاہ کاروں سے در گزر کرے۔ آپ کا اشارہ حجاج بن یوسف ثقفی کی طرف تھا۔ ابن لہیعہ فرماتے ہیں اس وقت حجاج بن یوسف پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

علامہ سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے طبقات میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک ایسا شخص آیا جس کا راستہ میں ایک عورت سے آمنا سامنا ہو گیا اور اس کی نظر اس عورت پر پڑ گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ ہمارے پاس آتے ہیں در آنحالیکہ ان کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے تو اس شخص نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی وحی نازل ہوتی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا نہیں۔ یہ تو مؤمن کی فراست ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کی تادیب اور اس کو اس فعل سے روکنے کیلئے اس بات کا اظہار کیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ شخصیت ہیں جن کی پرورش رسول اللہ ﷺ کی گود مبارک میں ہوئی۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے درمیان مواخات فرمائی تو آپ نے ارشاد فرمایا اے علی! تو میرا بھائی ہے اور غزوہ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا اے علی! کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میرے نزدیک تمہارا وہی مقام ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کا حضرت موسیٰ ں کے نزدیک تھا۔

حضرت اصبغ فرماتے ہیں:

"اتینا مع علی فمرنا بموضع قبر حسین فقال علی ھٰھنا مناخ رکابھم وھھنا موضع رحالھم وھھنا مھراق دمائھم فتیۃ من آل محمد یقتلون بھذہ العرصۃ تبکی علیھم السماء والارض"۔

ہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آئے اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کے مقام سے گزرے تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ یہ ان کی سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور یہ ان کے خیموں کی جگہ ہے۔ اور یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں ان کا خون بہایا جائے گا۔ اس میدان میں آلِ محمد ﷺ کے کچھ نوجوان شہید کئے جائیں گے جن پر زمین و آسمان نوحہ کناں ہوں گے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ کوفہ سے ارشاد فرمایا: تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے اہلِ بیت تشریف لائیں گے اور تم سے مدد طلب کریں گے۔ لیکن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اہلِ کوفہ نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو سلوک کیا یہ اس کی طرف اشارہ تھا۔ اور اگر ہم صحابہؓ کرام کے مکاشفات اور ان کی بصیرت کے واقعات کو یہاں درج کرنا چاہیں تو ہم اس کتاب کے موضوع سے بہت دور نکل جائیں۔

صوفیائے کرام اور کشف:

حضرت امام شافعی اور حضرت امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما بیت اللہ شریف میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی مسجد کے دروازے سے داخل ہوا۔ ان میں سے ایک نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ وہ بڑھئی ہے۔ دوسرے نے فرمایا نہیں بلکہ یہ لوہار ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس آدمی سے پوچھا تو اس نے جواب دیا میں بڑھئی ہوں لیکن آج کل میں نے لوہار کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے۔[1]

حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد حرام میں داخل ہوا تو میں نے ایک فقیر کو دیکھا جس پر دو چیتھڑے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس قسم کے فقیر لوگوں پر بوجھ ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے ندا دی اور کہا:

"وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَافِيْ أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ" (البقرہ: ۲۳۵)

ترجمہ: "اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو۔"

میں نے اپنے دل میں ہی توبہ کی تو اس نے مجھے ندا دی اور کہا:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ۔" (شوری: ۲۵)

ترجمہ: "اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی۔"

پھر وہ شخص غائب ہو گیا اور دوبارہ نظر نہ آیا۔[2]

حضرت خیر النساج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے جھٹک دیا۔ پھر دوسری اور تیسری مرتبہ جب خیال آیا اور گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ دروازے میں کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ تم اس وقت کیوں نہیں نکلے جب تمہیں پہلی بار خیال آیا تھا۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں بغداد کی جامع مسجد میں فقراء کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت نوجوان داخل ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرے خیال میں یہ لڑکا یہودی ہے۔ ان سب نے اس بات کو ناپسند کیا۔ پھر میں مسجد سے نکلا۔ اور وہ لڑکا بھی وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی لڑکا واپس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اس بزرگ نے کیا کہا تھا؟ وہ شرمندگی کی وجہ سے اسے نہ بتا سکے۔ جب اس نے اصرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ شیخ

---

[1] (تفسیر قرطبی، ج ۱۰ ص ۴۴)

[2] (الاحیاء للغزالی رحمہ اللہ تعالیٰ ج ۳ ص ۲۱)

نے تمہارے بارے میں کہا تھا کہ تم یہودی ہو۔ شیخ خواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ لڑکا میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں کو چوما اور مسلمان ہو گیا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ صدیق کی فراست کبھی غلط نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ میں مسلمانوں کا امتحان لیتا ہوں۔ اگر کوئی صدیق ہوا تو اسی گروہ میں ہو گا۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی تلاوت کرتے ہیں۔ میں جب بھیس بدل کر ان کے پاس آیا تو شیخ نے جب اپنی فراست سے مجھے پہچان لیا۔ تو میں نے جان لیا کہ وہ صدیق ہے۔ تو یہی نوجوان بعد میں بلند پایہ صوفی بن گیا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث پاک میں اس کی خبر دی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان للہ عبادا یعرفون الناس بالتوسم"۔

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو لوگوں کو اپنی فراست سے پہچان لیتے ہیں۔[1]

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جامع مسجد بغداد میں وعظ فرما رہے تھے کہ ایک نصرانی نوجوان بھیس بدل کر پوچھنے لگا۔ اس حدیث "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ" (ترمذی) (مؤمن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) کا کیا معنی ہے؟ آپ نے تھوڑی دیر کیلئے سر جھکایا پھر ارشاد فرمایا، اے نوجوان! مسلمان ہو جا تمہارے مسلمان ہونے کا وقت آگیا ہے۔ پس وہ لڑکا مسلمان ہو گیا۔

یہ حدیث پاک اس کشف کی اصل ہے جو کثیر صوفیائے کرام کو حاصل ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کشف کے ذریعے ان باتوں کو جان لیتے ہیں جو ان سے پوشیدہ ہوتی ہیں گویا کہ وہ ان کے ساتھ حاضر تھے۔ اور یہ چیز اس شخص کیلئے فتنہ کا باعث ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ متصف نہیں ہوتا۔

سوال: کیا کشف کے ذریعہ اصحاب قبور کی حالت کو بھی جانا جاسکتا ہے؟

جواب: علامہ عبد الرؤف مناوی حدیث **لو لا ان لا تدافنوا الدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر** (اگر تم بات کو چھپا سکتے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں عذابِ قبر سنا دے)[2] کی شرح میں فرماتے ہیں کہ دوسری ہولناکیوں کے علاوہ صرف قبر کے عذاب ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا کیونکہ یہ پہلی منزل ہے۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کشف طاقت کے مطابق عطا کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کشف حاصل ہو جائے تو وہ ہلاک ہو جائے۔

---

[1] (بزار، طبرانی)

[2] (فیض القدیر و ج ۱۵، ص ۱۱۰، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، ج۵، ص ۳۴۱)

بعض صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ قبر کے حالات سے آگاہی کئی اشخاص کو ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ خطرناک چیز ہے۔ جس کو یہ کیفیت حاصل ہو جائے وہ ایک دن میں کئی بار مرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ یہ چیز اس سے محجوب کر دے۔ اور بندے کو یہ چیز اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کی روحانیت اس کی جسمانیت پر غالب آجاتی ہے حتیٰ کہ اس کی زندگی ملائکہ کی طرح ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں جن لوگوں کو خطاب فرمایا ہے ان کی روحانیت، جسمانیت پر غالب تھی۔ اور آپ ہر قوم کے ساتھ اس کے حال کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔

مشائخ کرام کی فراست اور لوگوں کے دلوں کے راز سے آگاہ ہونے کے واقعات شمار سے باہر ہیں لیکن منکر کو صحابہ کرام، تابعین اور بعد میں آنے والے صوفیائے کرام سے منقول صحیح واقعات اور شواہد فائدہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ وہ صرف مادی زندگی پر ہی ایمان رکھتا ہے اور مادہ کے علاوہ کسی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ کا دل جب صاف ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور اس کی نظر جب کسی کدورت یا کسی صاف چیز پر پڑتی ہے تو اسے جان لیتا ہے پھر ان کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کدورت کو تو جان لیتے ہیں لیکن اس کے اصل سبب کو نہیں جان سکتے۔ اور ان میں سے بعض کا مقام اس سے بلند ہوتا ہے، وہ اصل سبب کو بھی جان لیتے ہیں جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ مقام حاصل تھا۔ کیونکہ آدمی نے جب عورت کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی وجہ سے اس میں کدورت پیدا ہو گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کدورت کا بھی ادراک کر لیا اور اس کے اصل سبب کا بھی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر معصیت میں کدورت ہوتی ہے جو دل میں سیاہ نقطے کا سبب بنتی ہے اور پھر یہ نقطے رین (زنگ) کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

جس طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (المطففین ۱۴)

ترجمہ: ”نہیں نہیں۔ در حقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔“

حتیٰ کہ دل میں رین (زنگ) مستحکم ہو جاتا ہے اور دل تاریک ہو جاتا ہے تو نور کے دروازے بند کر کے اس پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور پھر توبہ کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ جس طرح کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ (التوبہ:۸۷)

ترجمہ: ”اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔“

گناہ صغیرہ چھوٹی سی کدورت کا باعث بنتا ہے جو استغفار اور توبہ وغیرہ سے محو ہو سکتی ہے اور اس کا ادراک کوئی صاحب بصیرت ہی کر سکتا ہے جس طرح کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چھوٹی سی کدورت کا ادراک کر لیا۔ کیونکہ عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنے کے متعلق ادراک کر لیا۔ اور اس کے اصل سبب کی طرف بھی رسائی حاصل کر لی۔ اور یہ ایک بلند مقام ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے مقامات بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ جب ایک گناہ صغیرہ کے بعد دوسرا گناہ سرزد ہوتا ہے تو یہ کدورت بڑھ جاتی ہے۔ اور جب گناہوں کی کثرت ہو جائے اور اس کی وجہ سے دل تاریک ہو جائے تو ہر صاحب بصیرت اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے جب کوئی کسی کو گناہوں میں ملوث دیکھتا ہے۔ اور اس کے تاریک دل کو اپنی فراست سے نہیں بھانپ سکتا۔ تو اسے جان لینا چاہیئے کہ اس کی ذات میں ہی کوئی نقص ہے۔ اگر وہ صاحب بصیرت ہوتا تو اس تاریکی کا ادراک کر لیتا۔ کیونکہ انسان اپنی بصیرت کے مطابق ہی ادراک کر سکتا ہے۔

فراست وہ امر ہے جس کا واقع ہونا جائز ہے اور وہ عطا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کو عطا کرتا ہے۔ جو اپنے دین کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ اور اپنے اعضاء و جوارح کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنے قلوب کو صیقل کر کے اپنے نفوس کو مہذب بناتے ہیں۔

علامہ مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک ارشاد نبوی ﷺ **"ان لکل قوم فراسة وانما یعرفها الاشراف"**(بے شک ہر قوم میں فراست پائی جاتی ہے۔ اور اس کو قوم کے اشراف ہی جان سکتے ہیں) کی شرح میں فرماتے ہیں کہ فراست کی اساس اور بنیاد محارم سے صرف نظر کرنا ہے۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے ظاہر کو سنت کی اتباع اور اپنے باطن کو دائمی مراقبہ سے معمور کرتا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے۔ اور مخالفات سے صرف نظر کرتا ہے اور اکل حلال کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کی فراست میں خطا واقع نہیں ہوتی۔ اور جس کو یہ کیفیت حاصل ہو جائے وہ اپنے دل کے ساتھ حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔

گناہوں کی میل سے طہارت اور پاکیزگی کے اعتبار سے دلوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ دل اس شیشے کی مانند ہے کہ جتنا زیادہ صاف ہو گا اتنی زیادہ اس کی قیمت ہو گی۔ کھڑکی کے شیشے اور خوردبین کے اس شیشہ میں کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو انتہائی دقیق جراثیم کو ظاہر کر دیتا ہے۔ جس طرح کسی کھڑکی کے شیشے پر خوردبین کے شیشے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح تاریک اور مکدر دلوں کو صاف اور پاکیزہ دلوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ملائکہ کو شیطان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

المختصر جو کوشش کرتا ہے پا لیتا ہے اور جو راستے پر چل پڑتا ہے وہ منزل مقصود تک پہنچ ہی جاتا ہے اور جو کسی کام کو ابتدا ہی سے مضبوطی سے سرانجام دیتا ہے وہ کسی نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ ہر چیز کی ابتدا اس کی انتہا پر دلالت کرتی ہے۔

الہام

سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: **الالہام مایلقی فی الروع بطریق الفیض۔** (الہام وہ چیز ہے کہ جو بطور فیض دل میں القاء کی جاتی ہے)۔

بعض نے کہا کہ الہام دل میں واقع ہونے والے علم کا نام ہے۔ اور یہ علم کسی آیت قرآنی سے استدلال اور کسی دلیل میں غور و فکر کے بغیر عمل کا تقاضا کرنا ہے۔

الہام کی دو قسمیں ہیں:

(۱): وہ الہام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

(۲): وہ الہام جو فرشتوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس سے امر نہی اور ترغیب و ترہیب کا علم حاصل ہوتا ہے۔

(۱): اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام:

پہلی قسم کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں فرمایا ہے کہ جب آپ نے موسم سرما میں کھجور کے درخت کے نیچے پناہ لی تو اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطہ کے آپ کو الہام کیا اور ارشاد فرمایا:

وَهُزِّىٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا o فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا۔ (مریم:۲۵)

ترجمہ: "اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں (میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔"

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سے یہ خطاب آپ کے دل میں القاء اور الہام سے کیا جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"وَأَوْحَيْنَآ إِلٰىٓ أُمِّ مُوْسٰى" یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت فرعون کے سپاہیوں کے ڈر سے جب آپ کی والدہ انتہائی پریشان اور کرب کی حالت میں تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطہ کے آپ کو الہام فرمایا اور ارشاد فرمایا:

وَأَوْحَيْنَآ إِلٰىٓ أُمِّ مُوْسٰىٓ أَنْ أَرْضِعِيْهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ إِنَّا رَآدُّوْهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ (القصص:۷)

ترجمہ: "اور ہم نے الہام کیا موسیٰ کی والدہ کی طرف کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہ۔ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے۔"

علامہ آلوسی اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں وحی کرنے سے الہام مراد ہے۔

جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام سنا تو اپنے لختِ جگر کو تلاطم خیز موجوں کے حوالے کر دیا۔ ظاہری طور پر ان تلاطم خیز موجوں میں بچے کی ہلاکت یقینی تھی لیکن آپ کی والدہ اپنے اس فعل پر مطمئن تھیں کیونکہ جلوت و خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاواسطہ وحی والہام ان کا معمول تھا۔ آپ ایک سچی مؤمنہ اور ولیہ تھیں اگرچہ نبی نہیں تھیں۔ اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ جب یہ حال ان امتوں کا ہے تو امت محمدیہ کی کیا شان ہوگی۔ جس کی تمام امتوں پر افضلیت کی گواہی خود ربِ کریم نے دی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: ”ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں کیلئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے۔“

(۲): ملائکہ کی طرف سے الہام:

فرشتہ انسان سے بلاواسطہ ہم کلام ہوتا ہے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فرشتہ کے ذریعہ دل میں جو خیال ڈالا جاتا ہے وہ بھلائی اور خیر کا وعدہ اور حق کی تصدیق کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پس جس کو یہ حاصل ہوا سے یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنی چاہئے۔ (ترمذی)

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ۔ (آل عمران: ۴۲)

ترجمہ: ”اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہاں کی عورتوں سے۔“

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی نہیں تھیں کیونکہ نبوت و رسالت مردوں کیلئے خاص ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيْ إِلَيْهِمْ مِّنْ أَهْلِ الْقُرٰى۔ (یوسف: ۱۰۹)

ترجمہ: اور ہم نے (رسول بنا کر) نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر وہ مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں میں سے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ نبی نہیں تھیں تو جبرائیل علیہ السلام کا آپ کی طرف ارسال آپ کی کرامت تھی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان سے بالمشافہ گفتگو کی اور یہ صرف ان کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے اللہ کے نیک بندے ہیں جن کے ساتھ ملائکہ ہم کلام ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کسی دوسرے گاؤں میں اپنے بھائی کی زیارت کیلئے گیا اللہ تعالیٰ نے راستے میں ایک فرشتہ کو مقرر کر دیا۔ جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرنے لگا۔ تو اس نے کہا کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا اس گاؤں میں اپنے بھائی کی زیارت کیلئے جارہا ہوں۔ فرشتہ نے کہا کیا اس نے تم پر کوئی احسان کیا ہے جس کی وجہ سے تم جارہے ہو۔ جواب دیا نہیں۔ میں صرف اس سے اللہ تعالیٰ کیلئے محبت کرتا ہوں۔ فرشتہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرتا ہے جس طرح کہ تو اللہ تعالیٰ کیلئے اس بھائی سے محبت کرتا ہے۔

علامہ ابن علان صدیقی اس حدیث پاک کی شرح میں فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ فرشتہ نے اس کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ اَلاَّ تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِى كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَآئُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۱)

ترجمہ: بے شک وہ سعادت مند جنھوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر اس قول پر پختگی سے قائم رہے۔ اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو۔ تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس آیت کریمہ کی تفسیر فرماتے ہیں کہ فرشتے موت قبر اور بعث کے وقت نازل ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں جب انہیں کوئی دینی یا دنیاوی مشکل پیش آتی ہے۔ اس مدد کے ذریعے یہ ان کے حوصلہ کو بڑھاتے ہیں۔ بذریعہ الہام ان سے خوف اور حزن کو دور کرتے ہیں۔ اور یہی بات زیادہ اظہر ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ میں نزول ملائکہ کا حکم مطلق اور عام ہے۔ اور ان تمام مقامات کے علاوہ دوسرے مقامات کو بھی شامل ہے۔ کثیر لوگوں کا خیال ہے کہ فرشتے اکثر اوقات نیک اور صالح لوگوں پر بھی نازل ہوتے ہیں۔ اور یہ ان سے فیوض وبرکات حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس آیت کریمہ "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِى كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ" (فصلت: ۳۱) (تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ یہی وہ جنت ہے جس کا وعدہ تمہارے ساتھ دنیا میں رسل کرام علیہم السلام کی زبانوں کے ذریعے کیا گیا

ہے۔ اور یہ بشارت ان تین مقامات میں سے ایک ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ "نَحنُ أَوْلِیَآئُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ" کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں یعنی ہم تمہارے امور میں تمہارے مددگار ہوں گے اور تمہیں حق بات کا الہام کریں گے اور اچھی چیز کی طرف تمہاری راہنمائی کریں گے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ملائکہ ان مقامات کے علاوہ بھی بعض متقین کو بالمشافہ فرماتے ہیں: "نَحنُ أَوْلِیَآئُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ" اور ملائکہ کا مؤمنین کیلئے اولیاء ہونے کا معنی یہ ہے کہ ملائکہ کو انسانی ارواح میں الہام یقینی مکاشفہ اور حقیقی مقامات کے ذریعے اثر کرنے کی قوت حاصل ہے۔ جس طرح کہ شیطان کو ان ارواح میں وساوس ڈالنے اور بری چیزوں کو آراستہ کرنے کی تاثیر حاصل ہے۔ المختصر ملائکہ کا پاکیزہ ارواح کا اولیاء ہونا کئی اعتبار سے ثابت ہے جن کو اربابِ مکاشفہ ومشاہدہ بخوبی جانتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ ولایت جس طرح دنیا میں حاصل ہے اسی طرح آخرت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ یہ تعلق عارضی نہیں جو جلدی زائل ہو جائے۔ بلکہ یہ تو موت کے بعد اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نفس کا جوہر ملائکہ کی جنس میں سے ہے۔ اور یہ سورج کے مقابلے میں ایک شعلے اور سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے کی مثل ہے۔ لیکن جسمانی علائق اس کے اور ملائکہ کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر شیاطین بنی آدم کے دل کے ارد گرد چکر نہ لگاتے ہوتے تو وہ ملکوت سماوات کا مشاہدہ کر رہے ہوتے۔ جب یہ جسمانی علائق اور بدنی تدبیرات زائل ہو جاتی ہیں تو اس وقت پردہ اٹھتا ہے اور اثر مؤثر کے ساتھ قطرہ سمندر کے ساتھ اور شعلہ سورج کے ساتھ متصل ہو جاتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مراد ہے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملائکہ کی تسبیح سنا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ نے اپنے زخم کو داغ لیا تو یہ تسبیح منقطع ہو گئی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ کیفیت لوٹا دی۔

ابن اثیر "اسد الغابہ" میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زخم کو داغنے سے منع کیا ہے۔ حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے زخم کو داغ لیا تو ہم نے فلاح اور نجاح نہیں پائی۔ ملائکہ آپ کی بیماری میں آپ کو سلام کرنے کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ اور جب آپ نے اپنے زخم کو داغ لیا۔ تو وہ سلام بند ہو گیا اور پھر بعد میں ان کی طرف لوٹا۔

الہام سے حاصل ہونے والے علم کو صوفیائے کرام علمِ لدنی کہتے ہیں۔ اور یہ علم محض اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے بغیر کسی واسطہ کے حاصل ہوتا ہے۔ بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم نے فیضِ الٰہی اور الہام الٰہی کے ذریعہ علم حاصل کیا ہے۔ لفظی تعلیم اور قولی تدریس سے حاصل نہیں کیا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے الہام کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ غائبی چراغ کا نور ہے جو صاف پاکیزہ اور خالی دل کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ تمام اقوال کشف کے امکان اور الہام کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں لیکن اس کیلئے

ضروری ہے کہ دل دنیاوی علائق اور اس کے غم و حزن اور گناہوں کے زنگ اور اس کی ظلمات سے پاکیزہ اور صاف شفاف ہو۔ شیطان آلودہ دلوں پر تسلط قائم کرتا ہے جس طرح مکھی گندے برتنوں پر بیٹھتی ہے۔ اور جب دل پر شیطان کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو وہ اس کو محبوب حقیقی کے مطالعہ سے دور کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر بنی آدم کے دلوں پر شیطان نہ ہو تو یہ آسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کریں۔ (مسند امام احمد)

ذکر الٰہی اور مراقبہ شیطانی وسوسے کو دور کرنے کا ذریعہ ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شیطان ابن آدم پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہے پس اگر وہ ذکرِ الٰہی کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر ذکر کو بھول جائے تو وہ اس کے دل کو اپنے منہ میں لے لیتا ہے۔ (بیهقی، ابو یعلی)

کیونکہ دل جب وسوسہ اور ذکرِ الٰہی سے غفلت کا عادی ہو جاتا ہے تو یہ بیمار پڑ جاتا ہے مگر جب ذکر کا عادی ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کا مرکز و محور بن جائے تو یہ صحت مند ہو جاتا ہے۔ اور اس کا شمار زندوں میں ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے رب کا ذکر کرنے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ (بخاری)

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ دل کی دو قسمیں ہیں:

(۱): وہ دل جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ابھی اس کی پیدائش کا وقت ہوا ہے۔ یہ وہ دل ہے جو ضلالت و گمراہی اور خواہشاتِ نفسانیہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔

(۲): اور دوسرا دل وہ ہے جو پیدا ہو کر توحید کی فضا میں نکل آیا ہے اور آسمان معرفت میں محو پرواز ہے۔ اس نے نفس کی خواہشات اور تاریکیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی معیت ہی میں مطمئن ہے اور یقین کے انوار نے اسے منور کر کے صاف شفاف آئینہ بنا دیا ہے۔ اب نہ تو اس پر شیطان کا دخل ہے اور نہ ہی اس کا غلبہ۔ یہ کوئی بعید از قیاس چیز نہیں ہے۔ کیونکہ روحانی طاقت سے انسان علمِ غیب تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور اس کی برکت سے زندہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ پہلے مردہ تھا تاریک ہونے کے بعد روشن اور منور ہو جاتا ہے۔ شیطانی صفات کے بعد ملکوتی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ۔ (الانعام: ۱۲۲)

کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کیلئے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان۔

بلا شک وشبہ یہ روحانی اسرار و معارف محض کلام سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور جس کی قسمت میں یہ اسرار و معارف نہ ہوں۔ اسے چاہیئے کہ ان اصحاب اسرار و معارف کی بات تسلیم کر لے جن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں۔ ان علوم کا سب سے ادنیٰ حصہ ان کو تسلیم کرنا ہے۔ اور منکر کی ادنیٰ ترین سزا یہ ہے کہ اس کو یہ چیزیں عطا نہیں کی جاتیں۔ کیونکہ یہ تو صدیقین اور مقربین کا حصہ ہے۔

کراماتِ اولیاء

کرامات کا ثبوت اور ان کی حکمت:

کرامت اور استدراج میں فرق، اور کرامات کے متعلق صوفیائے کرام کا نقطۂ نظر: آج کل کرامات کے متعلق اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ شریعت میں کرامات کی کیا حیثیت ہے؟ کیا قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل بھی موجود ہے اور صوفیائے کرام کو کرامات عطا کرنے میں کون سی حکمت ہے؟ کیونکہ آج کل بے دینی اور مادیت کا دور دورہ ہے اور گمراہ کن پراپیگنڈے کی کثرت ہے۔ ان چیزوں نے ہمارے نوجوان طبقہ کو بڑا متاثر کیا ہے۔ اور کئی تعلیم یافتہ افراد کو گمراہ کیا ہے حتیٰ کہ بعض نے تو کرامات کا سرے سے ہی انکار کر دیا۔ اور بعض شکوک و شبہات اور تردد میں مبتلا ہیں۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت پر ضعفِ ایمان اور اس کے اولیائے کرام کی عدمِ تصدیق کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اظہارِ حق اور شریعتِ الٰہی کی نصرت کیلیۓ اس موضوع پر تفصیلاً بحث کریں گے۔

(ا): کرامات کا ثبوت:

کراماتِ اولیاء کتاب و سنت، صحابہ کرام اور تابعین کے آثار سے ثابت ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کے جمہور علماء نے ان کو تسلیم کیا ہے۔ خواہ ان کا تعلق فقہاء سے ہو یا محدثین سے۔ اصولیین سے ہو یا مشائخ سے۔ ان کی تصنیفات اس پر گواہ ہیں۔ اسی طرح مختلف اسلامی ادوار میں عینی مشاہدہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اسے تواتر معنوی کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ ان کی تفصیلات اخبارِ آحاد کے ضمن میں آتی ہیں۔ اور ان کا انکار صرف اہلِ بدعت نے ہی کیا ہے کہ جن کا ذاتِ باری تعالیٰ اس کی صفات اور افعال پر ایمان کمزور ہے۔

کتاب اللہ سے اس کی دلیل:

(ا): اصحابِ کہف کا ۳۰۹ سال تک غار میں حالتِ نیند میں آفات و مصائب سے محفوظ اور زندہ رہنا۔ اللہ تعالیٰ سورج کی گرمی سے ان کی حفاظت فرماتا تھا۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ“ (کھف: ۱۷)

ترجمہ: ”اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو ہٹ کر گزرتا ہے ان کے غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہے۔“

پھر ارشاد فرمایا:

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ اليَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ" (الکھف:۱۸)

ترجمہ: اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلَبِثُوْا فِی کَھْفِھِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا۔ (الکھف:۲۵)

ترجمہ: اور وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال۔

(۲): حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب کھجور کے خشک تنے کو ہلایا تو سرسبز ہو گیا اس سے تازہ کھجوریں گریں حالانکہ وہ کھجوروں کا موسم نہیں تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَھُزِّیْ إِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَۃِ تُسٰقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا (مریم:۲۵)

اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں۔

(۳): حضرت زکریا علیہ السلام جب بھی حضرت مریم علیہا السلام کے پاس ان کے کمرے میں آتے تو ان کے پاس قسم قسم کے پھل پاتے حالانکہ آپ کے علاوہ کوئی اور اس کمرے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ جب آپ نے حضرت مریم علیہا السلام سے پوچھا کہ یہ پھل کہاں سے آئے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْھَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَھَا رِزْقًا قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا۔ قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللہِ" (آل عمران:۳۷)

(جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا علیہ السلام اس کی عبادت گاہ میں تو موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے یا مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ رزق؟ مریم بولی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔)

(۴): حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیا کا قصہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ" (نمل:۴۰)

ترجمہ:"عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ تمہاری آنکھ جھپکے۔"

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آصف بن برخیاہیں جو آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو ملک یمن سے فلسطین لے آئے۔

سنت سے اس کی دلیل:

(۱): بخاری اور مسلم شریف میں جریج عابد کا قصہ موجود ہے جس کے ساتھ بچے نے پنگھوڑے میں گفتگو کی۔

(۲): پنگھوڑے میں گفتگو کرنے والے بچے کا قصہ۔

(۳): ان تین افراد کا قصہ جو بارش سے ڈر کر غار میں داخل ہو گئے تو غار کا منہ بند ہو گیا۔ اور پھر ان کی دعا سے غار کا منہ کشادہ ہو گیا۔

(۴): اپنے مالک کے ساتھ گفتگو کرنے والی گائے کا قصہ۔

آثارِ صحابہ سے اس کی دلیل:

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی بہت سی کرامات منقول ہیں:

(۱): حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کچھ مہمان آگئے۔ آپ نے انہیں کھانا پیش کیا۔ وہ جوں جوں کھانا کھاتے جاتے کھانا بڑھتا جاتا حتیٰ کہ وہ سیر ہو گئے۔ (بخاری)

(۲): حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبرِ رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر سینکڑوں میل دور لشکر کا مشاہدہ فرمایا۔ جیسا کہ یہ حدیث تفصیلاً گزر چکی ہے۔

(۳): حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چہرہ دیکھ کر جان لیا کہ اس شخص نے راستہ میں کسی غیر محرم عورت پر نظر ڈالی۔ یہ واقعہ بھی تفصیلاً گزر چکا ہے۔

(۴): حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مدینہ طیبہ کے قبرستان میں داخل ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ اے اہلِ قبور السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تم ہمیں اپنے بارے میں خبر دو گے یا ہم تمہیں خبر دیں۔ راوی فرماتے ہیں کہ ہم نے آواز سنی۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اے امیر المؤمنین! آپ ہمیں خبر دیں کہ ہمارے بعد کیا ہوا؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تمہاری ازواج نے نئی شادیاں کر لیں۔ تمہارے مال تقسیم ہو چکے۔ اور تمہاری اولاد یتیموں کے زمرہ میں شامل ہو گئی۔ وہ مکان جو تم نے بنائے تھے ان میں تمہارے دشمن مقیم ہیں۔

یہ تمہاری قبریں ہیں۔ اب تم ہمیں اپنے متعلق بتاؤ۔ ایک صاحب قبر نے جواب دیا۔ ہمارے کفن پھٹ چکے ہیں اور بال بکھر چکے ہیں اور جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ ہماری آنکھیں رخساروں پر بہہ گئی ہیں۔ ناک میں پیپ بھر گئی ہے۔ جو کچھ ہم نے آگے بھیجا تھا اس کو پالیا۔ اور جو کچھ پیچھے چھوڑ آئے اس میں نقصان اٹھایا۔ ہم قبروں میں بطور امانت پڑے ہوئے ہیں۔

(۵): حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کسی حاجت کیلئے رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے۔ حتیٰ کہ رات کا ایک حصہ گزر گیا۔ یہ رات بڑی طویل تھی۔ جب وہ باہر نکلے تو ان میں سے ایک کا عصا روشن ہو گیا۔ وہ اس روشنی میں چلتے رہے حتیٰ کہ ایک مقام پر ان کا راستہ جدا جدا ہو گیا۔ تو دوسرے کا عصا بھی روشن ہو گیا۔ اس طرح وہ دونوں اپنے عصا کی روشنی میں گھر پہنچ گئے۔[1]

(۶): حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قید ہونے کے طویل قصہ میں بنت حارث فرماتی ہیں کہ میں نے خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اچھا قیدی نہیں دیکھا۔ میں نے اسے انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا حالانکہ ان دنوں میں کسی قسم کا پھل نہ تھا اور آپ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ رزق تھا۔

(۷): حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کی۔ آپ نے تفتیش کیلئے ایک آدمی بھیجا۔ وہ کوفہ کی مسجدوں میں چکر لگا کر حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق پوچھا، تو ہر کوئی آپ کی تعریف کرتا حتیٰ کہ جب وہ اس سلسلہ میں ایک مسجد میں پہنچا تو ابو سعدہ نامی آدمی نے کہا کہ اگر تو سعد کے بارے میں ہم سے پوچھتا ہے تو میں تم کو بتاتا ہوں کہ حضرت سعد نہ تو مال غنیمت کو برابر تقسیم کرتے ہیں اور نہ جہاد کیلئے نکلتے ہیں اور نہ ہی فیصلہ کرنے میں عدل کرتے ہیں۔

جب حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا:

"اللھم ان کان کاذبا فاطل عمرہ و اطل فقرہ و عرضہ للفتن"۔

ترجمہ: اے اللہ! اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کی عمر کو طویل کر دے۔ اور اس کے فقر کو لمبا کر دے۔ اور اس کو فتنوں سے دوچار کر دے۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ انتہائی بوڑھا ہو چکا تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی پلکیں آنکھوں پر گر گئی تھیں۔ اور فقر میں مبتلا تھا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ تو وہ کہتا کہ میں انتہائی بوڑھا اور فتنہ میں مبتلا ہو چکا ہوں، مجھے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بددعا لگی۔ (متفق علیہ)

[1] (بیھقی، ابو نعیم، بخاری)

(۸): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علاء بن حضرمی کی تین خصوصیات دیکھی ہیں جن کی وجہ سے میں ان سے محبت کرتا رہوں گا۔

(i)۔ میں نے انہیں دیکھا کہ ایک غزوہ میں انہوں نے سمندر کو گھوڑے پر عبور کیا۔

(ii)۔ وہ مدینہ طیبہ سے بحرین کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جب وہ دھناء کے مقام پر پہنچے تو ان کا پانی ختم ہو گیا۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دامن طلب دراز کیا تو ریت کے نیچے سے پانی نکل آیا۔ ان سب نے پانی پیا اور کوچ کر گئے۔ ان میں ایک آدمی وہاں اپنا سامان بھول گیا۔ جب وہ واپس لینے کیلئے آیا تو وہاں پانی کا قطرہ بھی موجود نہ تھا۔

(iii)۔ میں ان کے ساتھ بحرین سے بصرہ کی طرف نکلا۔ راستہ میں ان کا وصال ہو گیا۔ وہاں پانی موجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا ہم نے بارش کے پانی سے آپ کو غسل دیا اور اپنی تلواروں سے قبر کھود کر انہیں دفن کر دیا۔

(۹): حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حیرہ کا محاصرہ کیا تو آپ کے ساتھیوں نے کہا ان عجمیوں سے محتاط رہنا یہ کہیں آپ کو زہر نہ پلا دیں۔ آپ نے فرمایا زہر لاؤ۔ آپ نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور بسم اللہ پڑھ کر پی گئے۔ یہ زہر قاتل آپ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکا۔[1]

(۱۰): حضرت حمزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ایک تاریک رات میں بکھر گئے، تو ان کا ہاتھ روشن ہو گیا، انہوں نے اس روشنی میں اپنی سواریوں کو جمع کیا اور ان میں سے کوئی بھی ہلاکت سے دوچار نہ ہوا۔

(۱۱): حضرت عثمان بن قاسم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ام ایمن نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا قصد کیا۔ آپ بغیر زادِ راہ کے پیدل چل رہی تھیں۔ اور سخت گرمی میں روزہ سے تھیں۔ آپ کو سخت پیاس لگی۔ حتیٰ کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے ان کی موت کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ آپ مقام روحاء یا اس کے قریب تھیں۔ جب سورج غروب ہوا تو آپ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے سر کے اوپر کسی چیز کی سرسراہٹ محسوس کی۔ تو میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ سفید رسی سے بندھا ہوا ایک ڈول آسمان سے اتر رہا ہے۔ فرماتی ہیں کہ وہ میرے قریب ہو گیا۔ میں نے اسے پکڑا اور میں نے اس میں سے پانی پیا۔ حتیٰ کہ میں سیر ہو گئی۔ آپ فرماتی ہیں کہ اس دن کے بعد سخت گرمی میں گھومتی پھرتی تھی تا کہ مجھے پیاس لگے لیکن اس کے بعد مجھے پیاس نہ لگی۔

---

[1] (بیہقی، ابو نعیم)

(۱۲): حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ کسی صحابی نے کسی قبر پر اپنا خیمہ لگا دیا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں قبر ہے۔ انہوں نے وہاں کسی انسان کو سورہ ملک پڑھتے ہوئے سنا۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ میں نے ایک قبر پر اپنا خیمہ گاڑ لیا تھا حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں قبر ہے۔ میں نے اس میں ایک انسان کو سورت ملک کی تلاوت کرتے سنا حتیٰ کہ اس نے سورت مکمل کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سورت عذاب کو روکتی ہے اور عذاب قبر سے نجات دلاتی ہے۔[1]

(۱۳): بیہقی نے حضرت قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت ابو درداء اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے تو وہ پیالہ اور اس میں موجود کھانا اللہ کی تسبیح کرنے لگا۔

(۱۴): محمد بن منکدر سے مروی ہے کہ خادمِ رسول حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں سمندر میں سفر کر رہا تھا کہ دورانِ سفر میری کشتی ٹوٹ گئی جس میں میں سوار تھا۔ میں ایک تختہ پر سوار ہو گیا۔ اس تختہ نے مجھے ایک ایسے جنگل میں اتارا جہاں شیر موجود تھا۔ وہ شیر مجھ پر حملہ کرنے کیلئے آگے بڑھا تو میں نے کہا اے شیر! میں رسول اللہ ﷺ کا خادم ہوں تو اس نے اپنے سر کو جھکا دیا۔ اور میرے قریب آ کر کندھے سے مجھے دھکیلنے گا حتیٰ کہ مجھے جنگل سے نکال کر ایک راستہ پر گامزن کر دیا۔ اور دھیمی آواز میں دھاڑنے لگا میں نے سمجھ لیا کہ وہ مجھے الوداع کہہ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی کثیر کرامتوں میں سے یہ چند کرامتیں ہیں جن کو بطورِ نمونہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ پھر تابعین تبع تابعین اور بعد کے ادوار میں اولیائے کرام کے ہاتھوں ان کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔ جن کو شمار کرنا انتہائی مشکل ہے۔ علمائے کرام نے کرامات کے بارے میں بڑی بڑی کتب تالیف فرمائی ہیں۔ اور کثیر اکابرین ائمہ نے کراماتِ اولیاء کے اثبات میں کثیر تصنیفات تحریر کی ہیں۔ ان میں امام فخر الدین رازی، شیخ ابو بکر باقلانی، امام الحرمین ابو بکر بن فورک، حجۃ الاسلام امام غزالی، شیخ ناصر الدین سبکی، امام ابو بکر اشعری، شیخ ابو القاسم قشیری، امام نووی، حضرت عبداللہ یافعی اور علامہ یوسف نبہانی وغیر ہم کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ حتیٰ کہ اسے علم یقینی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ بعد میں آنیوالے اولیائے کرام کی نسبت صحابہؓ کرام کی کرامات کیوں کم تھیں؟ اس کا جواب علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کا وہی جواب ہے جو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ان لوگوں کے ایمان قوی تھے۔ اس لئے انہیں اپنے ایمان کو قوی کرنے کیلئے کسی چیز کی ضرورت نہ

---

[1] (ترمذی)

تھی۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کا ایمان کمزور اور ضعیف تھا۔ اس لئے کرامات کے اظہار کے ساتھ ان کے ایمان کو مضبوط اور قوی کرنے کی ضرورت تھی۔

کراماتِ اولیاء کے ظہور کی حکمت:

اولیائے کرام کو مختلف قسم کے خارق العادات امور عطا فرمانا حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ اس طرح وہاں کے ایمان واخلاص کی وجہ سے ان کی عزت افزائی کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت اور جہاد میں ان کی تائید کرتا ہے اور اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کرتا ہے۔ اور لوگوں کیلئے واضح کردیتا ہے کہ قوانین فطرت اور تمام نظام کائنات اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ اسباب بذات خود اثر نہیں کرتے بلکہ حقیقی مؤثر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہاں معترض اعتراض کرسکتا ہے کہ دین کی نصرت اور تبلیغ خارق العادات امور سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کیلئے منطقی اور عقلی دلیل قائم کرنا ضروری ہے۔

جواب: ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی احکام کی نشرواشاعت کیلئے عقل سلیم اور صحیح منطق اور مضبوط دلیل کی تائید ضروری ہے۔ لیکن تعصب اور عناد کی وجہ سے بعض لوگ ان چیزوں کو تسلیم نہیں کرتے اور خارق العادات امور کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو کرامات سے نوازتا ہے جس طرح وہ اپنے انبیائِ کرام اور رسل کی تائید معجزے کے ساتھ کرتا ہے۔ معجزے کا مقصد انبیائے کرام کے صدق کا اظہار کرنا دعوت وتبلیغ میں ان کی مدد کرنا ناقص عقول اور مقفل قلوب کو جمود کی کیفیت سے نکال کر تعصب اور عناد سے آزاد کرنا ہے۔ تاکہ انہیں غور وفکر کے ساتھ ایمان راسخ اور یقین جازم حاصل ہو جائے۔ اس سے کرامت اور معجزہ کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ معجزہ صرف انبیائِ کرام کے ساتھ خاص ہے اور کرامات اولیائے کرام کے ساتھ۔ اگرچہ بعض حکمتوں اور مقاصد میں دونوں مشترک ہیں۔ پھر ولی کی ہر کرامت اس کے نبی کے معجزہ کے قائم مقام ہوتی ہے۔

کرامت اور استدراج کے درمیان فرق:

ضروری ہے کہ کرامت اور استدراج کے درمیان فرق واضح کیا جائے۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض لوگ ظاہر طور پر اسلام کے دعویدار فاسقوں کے ہاتھوں خارق العادات امور کا ظہور ہوتا ہے حالانکہ وہ علی الاعلان معصیت کا ارتکاب اور دین سے انحراف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کرامت کا ظہور ایسے ولی کے ہاتھ پر ہوتا ہے جو صحیح العقیدہ، طاعت پر مواظبت،

معاصی سے اجتناب اور لذات و شہوات میں مستغرق ہونے سے اعراض کرنے والا ہو۔ حقیقی ولی وہی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (٦٢) الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (یونس ٦٣)

ترجمہ: سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیز گاری کرتے رہے۔

اور اس کے علاوہ فاسقوں اور زندیقوں کے ہاتھوں جو خارق العادات امور ظاہر ہوتے ہیں جیسے جسم میں تلوار کی ضرب لگانا آگ اور شیشہ وغیرہ کھانا یہ استدراج کی قسم سے ہے۔

ولی، کرامت پر کبھی بھی اطمینان وسکون کا اظہار نہیں کرتا اور نہ ہی کسی غیر پر اس کی وجہ سے فخر کرتا ہے۔ علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ صاحبِ کرامت کرامت سے مانوس نہیں ہوتا۔ بلکہ ظہورِ کرامت کے وقت اس کا خوف الٰہی شدید ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ڈرتا ہے کہ کہیں یہ استدراج نہ ہو۔

اور اس کے برعکس صاحبِ استدارج اس استدراج سے مانوس ہوتا ہے جو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور گمان کرتا ہے کہ اسے یہ کرامت اس لئے ملی ہے کہ اس کا وہ مستحق تھا۔ اس وقت وہ دوسروں کو حقیر جانتاہے اور تکبر کرتا ہے اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے عقاب اور سزا سے بے خوف ہوتا ہے اور اپنی سوء عاقبت سے نہیں ڈرتا۔ صاحبِ کرامت پر ان علامات میں سے کسی ایک کا ظاہر ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ استدراج ہے نہ کہ کرامت۔ اسی لئے اکثر محققین فرماتے ہیں کہ بارگاہِ الٰہی سے بعد اور دوری اکثر اوقات مقامِ کرامات میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین صوفیائے کرام کرامات سے اسی طرح خائف رہتے ہیں جس طرح وہ مختلف قسم کی آزمائشوں سے۔ کرامت سے انسیت حاصل کرنا راہِ سلوک میں رکاوٹ کا باعث ہے اور اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پھر آپ نے ان گیارہ وجوہات کو ذکر کیا ہے ہم یہاں صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! جو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی وجہ سے کرامت کا مستحق ہو گیا تو اس کے دل میں اپنے اس عمل کی وجہ سے قدر ووقعت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسا آدمی جاہل ہوتا ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا تو وہ جان لیتا کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے مخلوق کی تمام عبادات حقیر ہیں۔ اور اس کی نعمتوں کے مقابلہ میں ان کا ہر شکر ناتمام ہے۔ اور اس کی عظمت وجلال کے مقابلہ میں ان کے تمام علوم ومعارف حیرت اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ شیخ ابو علی دقاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں کسی قاری نے یہ آیت کریمہ پڑھی:
اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ۔ (فاطر: ۱۰)
ترجمہ: اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے۔
تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیرے عمل کے بلند ہونے کی علامت یہ ہے کہ تیرے عمل کی تیرے نزدیک کوئی وقعت باقی نہ رہے، اگر تیری نظر میں تیرے عمل کی وقعت باقی ہے تو اس کو واپس دھکیل دیا جائے گا اور اگر یہ وقعت ختم ہوگئی تو اس کو بلند کر دیا جائے گا۔
اگر ہم کسی شخص کو دیکھیں کہ اس سے خارق عادت امور ظاہر ہوتے ہیں تو ہم اس کے ولی ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے اور نہ ہی اس کے عمل کو کرامت شمار کر سکتے ہیں۔ جب تک کہ اس کے چال چلن اور احکام شریعت کی پابندی کو نہ دیکھ لیں۔
حضرت ابویزید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:
"لو ان رجلا بسط مصلاہ علی الماء و تربع فی الھواء فلا تغتروا بہ حتی تنظروا کیف تجدونہ فی الامر و النھی"
اگر کوئی شخص پانی پر اپنا مصلیٰ بچھالے اور ہوا میں چوکڑی مار کر بیٹھ جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا حتیٰ کہ تم دیکھ لو کہ اوامر ونواہی میں اسے کیسا پاتے ہو۔

کرامات کے بارے میں صوفیاء کا مؤقف:

بعض تصوف کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ صوفیائے کرام کا مقصد کرامات تک پہنچنا ہے۔ یہ لوگ حقیقت میں اپنے نفس میں پوشیدہ امراض اور مخفی علل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ صوفیائے کرام تزکیۂ نفس اور اس کو ریا اور نفاق جیسی صفات مذمومہ سے پاک کرنے اور صفاتِ حمیدہ سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ ان کے تمام اعمال اسباب غایات سے پاک ہوں۔ اور ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ریاکاری کے شبہ سے بچنے کیلئے کرامت کو چھپاتے ہیں۔
حضرت ابو عبد اللہ قرشی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: جو شخص کرامات اور خارق العادات امور کے ظہور کو اس طرح ناپسند نہیں کرتا جس طرح مخلوقِ خدا معاصی کے ظہور کو ناپسند کرتی ہے وہ درحقیقت حجاب میں ہے۔ ان چیزوں کو چھپانا ہی رحمت ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہے وہ کرامت اور خارق العادات امور کے ظہور کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہی نہیں ہے۔ جب وہ مکمل طور پر اپنے ارادہ سے مستغنی ہو جاتا ہے تو اس کیلئے اپنے نفس کو ذلت اور

حقارت سے دیکھنا متحقق ہو جاتا ہے تو اس وقت اس میں الطاف و عنایات میں وارد ہونے اور صدیقین کے مراتب سے متصف ہونے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔

شیخ علی الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کاملین اپنے ہاتھوں پر کرامت کے واقع ہونے سے ڈرتے ہیں اور بہت زیادہ خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں یہ استدراج نہ ہو۔ اس کے علاوہ صوفیائے کرام کرامت کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔ مگر کسی صحیح مقصد کیلئے کرامت کا اظہار صحیح ہے۔ جیسے کافروں اور مخالفوں کے مقابلہ میں شریعت کی حمایت اور نصرت اور کافروں گمراہوں اور شعبدہ بازوں کے جادو کو باطل کرنے کیلئے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جادو کی وجہ سے لوگوں کو ان کے دین سے گمراہ کرتے ہیں اور ان کے عقائد اور ایمان میں شکوک و شبہات ڈالتے ہیں۔

بغیر کسی جائز سبب کے کرامات کا اظہار کرنا مذموم ہے۔ کیونکہ یہ فخر خود پسندی اور نفس کو خوش کرنے کا سبب بنتا ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: یہ بات مخفی نہیں کہ اکابر صوفیاء کے نزدیک کرامت کا شمار جملہ نفسانی رعونات میں ہوتا ہے مگر جب اس کا اظہار نصرتِ دین یا کسی مصلحت کی وجہ سے ہو۔ کیونکہ ان کے نزدیک فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ وہ خود۔ یہ تو صرف اس کے مظہر ہوتے ہیں اور ان کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ یہ خارق العادات امر ان کے ہاتھوں سے ظاہر ہوا مثلاً جب وہ کسی مینڈھے کو یا مرغی کو زندہ کرتے ہیں تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ہوتا ہے۔ نہ کہ ان کی قدرت و طاقت سے۔ جب معاملہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں کرنا چاہئے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک شریعت پر استقامت ہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

شیخ ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! اولیائے کرام کی سب سے بڑی کرامت اطاعتِ خداوندی کی دائمی توفیق حاصل ہونا اور معاصی و شرعی مخالفت سے محفوظ ہونا ہے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس کرامات کا ذکر ہوا تو فرمایا! ان کرامات کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تو وقتی چیز ہے یہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ تو اپنے اخلاق کے ساتھ کسی کے اخلاق مذمومہ کو اخلاق حسنہ میں تبدیل کر دے۔

شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقی کرامت استقامت کا حصول اور اس میں کمال حاصل کرنا ہے اور اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل کا حصول اور ظاہر و باطن میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع۔ بندہ کیلئے ضروری ہے کہ ان دو چیزوں کے حصول کیلئے حریص رہے اور اپنی تمام ہمت و کوشش ان ہی کے حصول کیلئے صرف کرے۔ اس کے علاوہ رہا خارقِ عادت امر کا ظہور تو محققین کے نزدیک اس کرامت کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ یہ تو بعض اوقات اس سالک

کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جسے ابھی استقامت کاملہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ تو استدراج کے طور پر بعض لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جامع ترین صرف دو ہی کرامتیں ہیں۔

(۱)ایمان کے ساتھ یقین اور مشاہدہ کا حصول۔

(۲): نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اقتداء اور پیروی اور جھوٹے دعووں اور دھوکہ دہی سے اجتناب۔

تو جسے یہ دو چیزیں حاصل ہو جائیں اور پھر وہ غیر کی طرف مشتاق ہو تو وہ جھوٹا اور دھوکہ باز ہے۔ اور صحیح علم و عمل سے بہت بعید ہے۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جسے بادشاہ کی رضا اور اس کی مجلس میں حضوری حاصل ہو اور وہ اس رضا کو چھوڑ کر جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جائے۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کرامت کی دو قسمیں ہیں:

(۱): حسی (۲): معنوی

عوام الناس صرف حسی کرامات کو ہی جانتے ہیں جیسے دل کی بات بوجھ لینا ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں غیب کی خبریں دینا۔ کائنات میں سے کسی چیز کو لینا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا طی الارض آنکھوں سے چھپ جانا اور فوراً دعا کا قبول ہونا۔ عوام الناس اسی قسم کی کرامات کو ہی پہچانتے ہیں۔ مگر معنوی کرامات کو صرف اللہ کے خاص بندے ہی جانتے ہیں اور عوام الناس کی ان تک رسائی نہیں ہوتی۔ اور معنوی کرامات یہ ہیں کہ بندہ آداب شرع کا پابند ہو، مکارمِ اخلاق اپنانے اور برے اخلاق سے اجتناب کرنے کی توفیق حاصل ہو۔ تمام فرائض کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کا خیال رکھے۔ نیکی کرنے میں جلدی کرے، اپنے دل سے لوگوں کیلئے حسد و کینہ اور سوء ظن کو دور کرے، دل کو تمام صفات مذمومہ سے پاک کر کے اس کو مراقبہ کے ساتھ آراستہ کرے، اپنے نفس اور تمام اشیاء کے متعلق حقوق الٰہی کا خیال رکھے، اپنے دل میں انوار و تجلیات کی طرف متوجہ ہو جائے، اپنی ہر ہر سانس کا خیال رکھے، جب سانس اندر داخل ہو تو اس کو ادب سے وصول کرے اور جب باہر نکالے تو اس پر بارگاہِ الٰہی میں حضوری کے آثار ہوں۔ یہ تمام ہمارے نزدیک اولیائے کرام کی وہ معنوی کرامات ہیں جن میں مکر اور استدراج داخل نہیں ہوتا۔

صوفیائے کرام کسی صالح ولی اللہ کے ہاتھ پر کرامت کے ظہور کو اس کی افضلیت کی دلیل نہیں سمجھتے۔ امام یافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں یہ لازم نہیں کہ صاحبِ کرامت اولیائے کرام ان سے افضل ہوں جو صاحبِ کرامت نہیں ہوتے بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اولیائے کرام جن سے کرامات کا ظہور نہیں ہوتا وہ صاحبِ کرامت سے افضل ہوتے ہیں۔ کیونکہ

کرامت صاحبِ کرامت کے یقین کی تقویت کیلئے ہوتی ہے۔ اور یہ اس کے صدق اور اس کی فضیلت کی دلیل ہے نہ کہ اس کی افضلیت کی۔ کیونکہ افضلیت قوت یقین اور کمال معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کسی ولی اللہ کے ہاتھ پر کرامت کا عدمِ ظہور اس کے عدمِ ولایت کی دلیل نہیں ہے۔ امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا میں کسی ولی کیلئے ظاہری کرامت نہ ہو تو یہ اس کے ولی ہونے میں قدح کا باعث نہیں ہے۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات یہ ولی صاحبِ کرامت سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ افضلیت کا دارومدار یقین کامل پر ہے نہ کہ کرامات کے ظہور پر۔

(۳) باب نمبر تین: حقیقت اور شریعت

تمہید وتعریف: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ مشہور حدیث جبریل میں دین کو تین بنیادی ارکان میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ ارشاد فرمانا ہے کہ یہ جبریل تمہیں تمہارا دین سکھانے کیلئے آیا ہے۔

(۱): رکنِ اسلام: یہ دین کا عملی پہلو ہے جس میں عبادات، معاملات اور دیگر دینی امور شامل ہیں جن کو بجالانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کا تعلق جسم کے ظاہری اعضاء سے ہے۔ علماء کی اصطلاح میں اس کو شریعت کہتے ہیں۔ اس پہلو کی تحقیق وتشریح میں فقہائے کرام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

(۲): رکنِ ایمان: یہ دین کا وہ اعتقادی پہلو ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں، یومِ آخرت اور قضاء وقدر پر ایمان لانا شامل ہے۔ اس پہلو کی تحقیق کا حق علمِ کلام کے ماہرین نے ادا کیا۔

(۳): رکنِ احسان: یہ دین کا خالص، روحانی اور قلبی پہلو ہے۔ یعنی تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تجھے یہ مقام حاصل نہیں تو تو اس کی عبادت اس طرح کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس پہلو میں وہ تمام عرفانی احوال ومقامات، وجدانی ذوق اور علوم لدنیہ شامل ہیں۔ جو مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق عبادت کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ علماء کی اصطلاح میں اسے حقیقت کہتے ہیں۔ اور اس پہلو کی توضیح وتشریح کا سہرا صوفیائے کرام کے سر ہے۔

شریعت اور حقیقت کے باہمی تعلق کی وضاحت کیلئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر نماز کو اس کے ظاہری اعمال وحرکات اور فقہائے کرام کے بیان کردہ ارکان وشرائط کے مطابق ادا کیا جائے تو اسے شریعت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور اگر نماز میں حضور قلب حاصل ہو جائے تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔ اور یہی روحِ نماز ہے۔

اس سے نتیجہ نکلا کہ نماز کے ظاہری اعمال اس کے جسم کی مانند ہیں اور اس میں خشوع وخضوع اس کی روح ہے۔ بغیر روح کے جسم کا کوئی فائدہ نہیں۔ پس جس طرح روح اپنے قیام کیلئے ایک جسم کی محتاج ہے اسی طرح جسم کو ایک روح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی معنی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ۔“ (بقرہ: ۱۱۰)

ترجمہ: اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ۔

نماز قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو جسم اور روح کے ساتھ ادا کیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ نماز پڑھو، بلکہ فرماتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اور حقیقت کے درمیان اسی طرح گہرا ربط ہے جس طرح

جسم اور روح کے درمیان۔ کامل مؤمن وہی ہے جو شریعت اور حقیقت کا جامع ہو۔ اور صوفیائے کرام اسی چیز کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ ایمانِ کامل اور اس ارفع مقام کے حصول کیلیئے راہِ طریقت کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ یعنی کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں رہ کر مجاہدۂ نفس کرنا اور اس کی ناقص صفات کو صفاتِ کاملہ کے ساتھ تبدیل کرتے ہوئے معرفتِ الٰہی کی منزل تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ گویا کہ طریقت وہ پل ہے جو سالک کو شریعت سے حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔

سید جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "تعریفات" میں فرماتے ہیں: طریقت اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ اور حقیقت ان پر مرتب ہونے والا ثمرہ ہے۔ ان تینوں چیزوں کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ جس نے شریعت کو مضبوطی سے تھام لیا وہ راہِ طریقت پر چلتا ہوا حقیقت تک پہنچ جائے گا۔ ان میں کوئی تعارض اور تناقض نہیں ہے۔

اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں:

"کل حقیقة خالفت الشریعة فهی زندقة"۔

یعنی ہر حقیقت جو شریعت کے مخالف ہو وہ زندیقی ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ حقیقت، شریعت کے مخالف ہو کیونکہ شریعت پر عمل کے نتیجہ میں ہی تو سالک کو اس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

صوفیائے کرام کے امام احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ فقہ کے بغیر تصوف کا کوئی تصور نہیں۔ کیونکہ فقہ ظاہری احکام کو جاننے کا ذریعہ ہے اور بعینہ فقہ تصوف کے بغیر نامکمل ہے۔ کیونکہ کوئی ظاہری عمل صدق نیت اور رضائے الٰہی کے بغیر مقبول نہیں۔ اور اسی طرح تصوف اور فقہ کی بنیاد ایمان پر ہے۔ کیونکہ بغیر ایمان کے نہ فقہ مقبول ہے اور نہ ہی تصوف۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ آپس میں لازم ملزوم ہیں جس طرح جسم اور روح آپس میں لازم ملزوم ہوتے ہیں کہ روح کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اسی طرح جسم کی زندگی روح کے بغیر ممکن نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"من تصوف ولم یتفقه فقد تزندق۔ و من تفقه و لم یتصوف فقد تفسق و من جمع بینهما فقد تحقق"۔

جس نے تصوف کو اپنایا اور فقہ سے بے بہرہ رہا وہ زندیق ہوا۔ اور جس نے علمِ فقہ کو سیکھا اور تصوف پر عمل پیرا نہ ہوا وہ فاسق ہوا۔ اور جس نے ان دونوں کو جمع کر لیا اس نے حقیقت کو پالیا۔

پہلا شخص زندیق اس لئے ہوا کیونکہ اس نے حقیقت کو شریعت سے جدا تصور کیا۔ اس لئے وہ جبریہ کے عقائد کی طرف مائل ہو گیا اور کہنے لگا کہ انسان کو کسی بھی معاملہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں۔

کسی شاعر نے اس کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

القاہ فی الیم مکترفا و قال لہ   ایاک ایاک ان تبتل بالماء

اس کو باندھ کر سمندر میں پھینک دیا اور اسے کہا بچنا بچنا کہیں تو پانی سے بھیگ نہ جائے۔

اس طرح اس نے احکام شریعت پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اس نے شریعت کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش نہ کی۔

اور دوسرا شخص اس لئے فاسق ہو گیا کیونکہ اس کے دل میں تقویٰ کا نور اور اخلاص داخل نہ ہوا۔ نہ ہی اس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا تاکہ اس کو معصیت سے روکتا۔ اور سنت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔

تیسرے شخص نے حقیقت تک رسائی اس لئے حاصل کی، کیونکہ اس نے دین کے تمام ارکان یعنی ایمان، اسلام اور احسان کو جمع کیا جس کا ذکر حدیثِ جبریل میں آیا ہے۔

جس طرح علمائے ظاہر حدودِ شریعت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسی طرح صوفیائے کرام تصوف کے آداب اور اس کی روح کی حفاظت کرتے ہیں۔

جس طرح علمائے ظاہر کیلئے جائز ہے کہ وہ ادلہ شرعیہ کے استنباط اور حدود و فروع کے تعین کیلئے اجتہاد کریں۔ اور ان چیزوں پر حلت و حرمت کا حکم لگائیں جن کا ذکر قرآن پاک و حدیث شریف میں واضح طور پر نہیں بیان کیا گیا۔ بعینہ عارفین کیلئے بھی جائز ہے کہ وہ مریدین اور سالکین کی اصلاح و تربیت کیلئے آداب اور طریقے مستنبط کریں۔

سلف صالحین اور صوفیائے کرام نے حقیقی عبودیت اور صحیح اسلام تک رسائی حاصل کی۔ کیونکہ وہ شریعت، طریقت اور حقیقت پر بیک وقت عمل پیرا رہے۔ کیونکہ وہ خود ان سنہری اصولوں پر عمل پیرا تھے اس لئے انہوں نے دوسرے لوگوں کی بھی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اگر حقیقت کو دین سے الگ کر دیا جائے تو اس کی جڑ خشک ہو جائے۔ اور ٹہنیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں اور اس کا ثمرہ فاسد ہو جائے۔

مخالفین اور ان کے اعتراضات:

صوفیائے کرام پر اعتراضات کرنے والے اگر تو شریعت، طریقت اور حقیقت کی اس تقسیم کا انکار کرتے ہیں جس کو ہم نے بیان کیا ہے تو ان کا مقصد یہ ہے کہ روحِ اسلام کو اس کے جسم سے جدا کر دیں اور حدیثِ جبریل میں بیان کردہ دین کے تین ارکان میں سے ایک بنیادی رکن کو ساقط کر دیں۔ ان کا یہ عمل علمائے اسلام اور کبار فقہائے کرام کے عمل کے مخالف بھی ہے۔

ابن عابدین اپنے مشہور **حاشیہ ردالمختار** میں فرماتے ہیں کہ طریقت سے مراد وہ مخصوص طرزِ عمل ہے جس کو سالکین معرفتِ الٰہی کی منازل طے کرنے اور اعلیٰ مقامات کے حصول کیلئے اختیار کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ حقیقت دل کے ساتھ ربوبیت کے مشاہدہ کا نام ہے۔ اور یہ وہ روحانی سِر ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ حقیقت اور شریعت آپس میں لازم وملزوم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کیلئے راستہ کی دو جہتیں ہیں۔ (۱): باطن اور (۲): ظاہر۔ ظاہری راستہ کو شریعت اور طریقت کہتے ہیں اور باطنی کو حقیقت۔ شریعت اور طریقت کی اصل حقیقت ہے جس طرح مکھن کی اصل دودھ ہے۔ دودھ سے مکھن بلونے کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اور ان تینوں کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔

شیخ عبداللہ یافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت اسرارِ ربانی کے مشاہدہ کا نام ہے۔ اور شریعت پر استقامت کا نام طریقت ہے۔ طریقت کو اختیار کرنے والا حقیقت تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ حقیقت شریعت پر استقامت کی انتہاء ہے۔ اور کسی چیز کی انتہاء اس سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ حقیقت شریعت کے مخالف نہیں۔

صاحبِ **کشف الظنون** علمِ تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ علمِ تصوف علمِ حقیقت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس کو علمِ طریقت بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد نفس کو برے اخلاق سے پاک کرنا اور دل کو گھٹیا اغراض سے صاف کرنا ہے، علمِ شریعت، علمِ حقیقت کے بغیر بیکار ہے۔ اور علمِ حقیقت، علمِ شریعت کے بغیر باطل۔

علمِ شریعت جس کا تعلق ظاہری اصلاح سے ہے یہ حج کی بنیادی ضروریات کے مترادف ہے اور علمِ طریقت جس کا تعلق اصلاحِ باطن سے ہے یہ حج کی منازل اور اس کے راستہ کے پیچ وخم کو جاننے کے قائم مقام ہے۔ جس طرح صرف بنیادی ضروریات اور راستہ کی منازل کو جان لینا ظاہری حج کیلئے کافی نہیں۔ جب تک کہ انسان بنیادی ضروریات کی تیاری کے بعد راستہ پر نہ چل نکلے۔

بعینہ صرف احکامِ شریعت اور آدابِ طریقت کو جان لینا حج معنوی کیلئے کافی نہیں جب تک آدمی ان پر عمل پیرا نہ ہو۔

اگر معترضین اس تقسیم کو تسلیم کرتے ہیں لیکن شریعت، طریقت اور حقیقت کے ناموں کا انکار کرتے ہیں تو ہم ان کا اس طرح جواب دیں گے کہ علمائے امت اور فقہائے کرام کا یہی عمل ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ یہ ایک اصطلاح ہے اور اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

اگر وہ اس تقسیم اور نام کو تسلیم کرتے ہیں لیکن صوفیائے کرام کے قلبی احوال ان کے وجدانی ذوق اور ان کے علومِ لدنیہ کا انکار کرتے ہیں۔

تو ہم ان کا جواب یہ دیں گے کہ یہ وہ امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں اور سچے محبین کو عطا فرما کر ان کی عزت افزائی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی پابندی نہیں۔

یہ وہ علوم و معارف اور فیوضِ الٰہیہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علم جو دل میں ہوتا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں وہ علم جو دل میں ثابت ہوتا ہے اور یہی علم نافع ہے اور دوسرا علم وہ ہے جو زبان پر جاری رہتا ہے اور یہ علم مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ ابو نعیم نے "حلیۃ الاولیاء" میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا، اے معاذ! تونے کیسے صبح کی۔ انہوں نے عرض کی میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے والا ہوں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر قول کا کوئی مصداق، اور ہر چیز کی حقیقت ہوتی ہے۔ تمہارے اس قول کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کی۔ اے اللہ کے نبی! میں نے جب بھی صبح کی تو میں یہ گمان کرتا ہوں کہ شاید مجھ پر شام آئے یا نہ آئے اور جب شام کرتا ہوں تو صبح کرنے کا کوئی یقین نہیں ہوتا۔ اور جب بھی کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں دوسرا قدم نہیں اٹھاسکوں گا۔ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر امت گھٹنوں کے بل بیٹھی ہے ان کو ان کی کتاب کی طرف بلایا جارہا ہے اور ان کے ساتھ ان کی نبی بھی موجود ہے یا وہ بت ان کے ساتھ ہیں جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔ گویا کہ میں اہلِ جہنم کی سزا اور اہلِ جنت کے ثواب کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بات سن کر نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا، اے معاذ! تونے حق کو پہچان لیا۔ اس کو لازم پکڑ۔

سلف صالحین کو یہ علوم و معارف اس لئے حاصل ہوئے کہ انہوں نے قرآن کریم اور سنتِ نبویہ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور آپ کے صحابۂ کرام کی پیروی کی۔ اور مجاہدۂ نفس کے دوران روزوں اور قیام اللیل کو اپنایا اور اس فانی دنیا

سے زہد اختیار کیا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کشف عطا فرمایا۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے اعتراف کرتے ہوئے فرمایا، اے معاذ! **"عرفت فالزم"** (تو نے حق کو پہچان لیا پس تو اسے لازم پکڑ)۔

حضرت امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان صوفیائے کرام پر اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کے متعلق فرماتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے طریقہ پر عمل پیرا رہے۔ آپ فرماتے ہیں: عزیز من! علم تصوف وہ علم ہے جو اولیائے کرام کے دلوں میں پروان چڑھتا ہے جب ان کے دل کتاب وسنت پر عمل کرنے کی وجہ سے روشن ہوتے ہیں۔ بلکہ جو بھی کتاب وسنت پر عمل پیرا ہوتا ہے اس کے دل میں علوم ومعارف اور اسرار وحقائق کے وہ سوتے پھوٹتے ہیں جن کو زبان بیان کرنے سے عاجز ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح علمائے شریعت پر شرعی احکام کے اسرار ورموز منکشف ہوتے ہیں جب وہ اپنے علم کے مطابق اس پر عمل پیرا ہوں۔

ہمارے سلف صالحین اخلاص کے ساتھ اپنے علم پر عمل بھی کرتے تھے۔ اس طرح ان کے دل روشن اور منور ہوگئے۔ اور ان کے اعمال بشری کمزوریوں سے پاک ہوگئے۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو ان کے بعد کچھ ایسے لوگ آئے جنہوں نے اپنے علم وعمل میں اخلاص کی طرف توجہ نہ دی تو ان کے دل تاریک ہوگئے اور صوفیائے کرام پر وارد ہونے والے انوار وتجلیات سے محروم ہوگئے تو ان چیزوں کا انکار کرنے لگے۔

بعض عاقبت نااندیش اور خود غرض لوگ ابن تیمیہ وغیرہ کے کلام سے استدلال کرکے صوفیائے کرام پر اعتراض کرتے ہیں اور ان پر یہ جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ وہ شریعت کو چھوڑ کر حقیقت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اپنے کشف اور مفاہم پر اعتماد کرتے ہیں اگرچہ یہ ظاہر شریعت کے مخالف ہوں لیکن ان کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد اور باطل ہے حتیٰ کہ خود ابن تیمیہ کا کلام ان کے اس نظریہ کے بطلان پر شاہد ہے۔ کیونکہ ابن تیمیہ نے صوفیائے کرام کے کتاب وسنت پر کاربند ہونے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اور کہا ہے کہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے زمانہ کے تمام مشائخ سے زیادہ شریعت اور اس کے اوامر ونواہی پر کاربند تھے اور شریعت کو ہمیشہ ذوق پر مقدم رکھتے تھے۔ اسی طرح آپ خواہشات اور ارادۂ نفس کو ترک کرنے کا حکم فرماتے تھے۔ کیونکہ ارادۂ نفس کی وجہ سے سالک خطا کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لئے آپ سالک کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ اسے اپنے ذاتی ارادہ کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا وہی ارادہ ہونا چاہئے جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو۔

نیز یہ بھی کہا کہ جمہور سلف صالحین جو کہ صاحبِ استقامت تھے۔ جیسے فضیل ابن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابو سلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی، جنید بن محمد وغیرہ متقدمین میں اور متاخرین میں شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ احمد اور شیخ ابو بیان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بزرگ ہیں۔ جو سالک کو ایک لمحہ کیلئے بھی شریعت کے اوامر ونواہی سے خارج ہونے کی اجازت نہیں

دیتے۔ اگرچہ وہ ہوا میں اڑنے اور پانی پر چلنے کی طاقت رکھتا ہو۔ بلکہ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ آخر دم تک اوامر الٰہیہ کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے اور یہی وہ صحیح راستہ ہے جس پر کتاب وسنت اور سلف صالحین کا اجماع دلالت کرتا ہے۔ اس قسم کی اکثر چیزیں ان کی گفتگو میں موجود ہیں۔

اب ہم صوفیائے کرام کے اقوال وارشادات ذکر کرتے ہیں جو ان کے کتاب وسنت پر سختی سے کاربند رہنے پر شاہد ہیں۔

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"کل حقیقة لا تشهد لها الشریعة فهی زندقة۔ طر الی الحق عز وجل بجناحی الکتاب والسنة۔ ادخل علیه ویدک فی ید الرسول ﷺ"۔

ہر وہ حقیقت کہ شریعت جس کی مؤید نہ ہو وہ زندقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کیلئے کتاب وسنت کے پروں کے ساتھ پرواز کر اور اس کی بارگاہ میں اس حال میں داخل ہو کہ تیرا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دستِ اقدس میں ہو۔

جعلی صوفیاء جو یہ گمان کرتے ہیں کہ بعض احوال میں سالک سے شرعی تکالیف ساقط ہو جاتی ہیں ان کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فرضی عبادات کو چھوڑ دینا زندیقی ہے، ممنوعات کا ارتکاب کرنا معصیت ہے اور کسی حال میں بھی فرائض ساقط نہیں ہوتے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ سات چیزوں پر ہماری بنیاد ہے:

(۱): قرآن پاک پر عمل پیرا ہونا (۲): رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا (۳): اکلِ حلال
(۴): کسی کو تکلیف نہ دینا (۵): گناہوں سے اجتناب کرنا (۶): توبہ
(۷): حقوق کی ادائیگی پر کاربند رہنا۔

شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے جب تیرا کشف کتاب وسنت کے مخالف ہو تو کتاب وسنت پر عمل کر اور اپنے کشف کو چھوڑ دے۔ اور اپنے نفس کو یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں میری عصمت کی ضمانت ہے۔ کشف والہام میں میرا کوئی ضامن نہیں۔

شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ باطن کہ ظاہر جس کی مخالفت کرے وہ باطل ہے۔

شیخ ابو الحسن وراق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک توفیقِ الٰہی اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع وپیروی کے ذریعہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ اور جس نے آپ کی اتباع کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا وہ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ اگرچہ وہ گمان کرتا ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ہے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے نزدیک قرآن و سنت کسوٹی ہیں۔ اس لئے سالک کو چاہیئے کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت کو اس شرعی میزان کے ذریعہ پرکھ لے۔

آپ مزید برآں فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے طریقہ کی بنیاد علم و عمل ہے اور اس کا تانا پیٹا شریعت ہے نہ کہ دونوں میں سے ایک۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو صوفیائے کرام کے احوال کا بغور جائزہ لیتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے علوم و معارف شریعت سے خارج نہیں ہیں اور شریعت سے خارج کیسے ہو سکتے ہیں کیونکہ شریعت ہی تو انہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے صوفی کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا! صوفی وہ ہے جو قرآن پاک کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور سنتِ رسول اللہ ﷺ اپنے بائیں ہاتھ میں لیتا ہے۔ اپنی ایک آنکھ سے جنت کی طرف دیکھتا ہے اور دوسری سے جہنم کی طرف۔ دنیا کو اپنا تہبند بنالیتا ہے اور آخرت کو اپنی قمیض۔ اور ہر لحظہ اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔

آپ مزید ارشاد فرماتے ہیں بدن پر دس چیزیں فرض ہیں:

(۱): فرائض کی ادائیگی۔

(۲): محارم سے اجتناب۔

(۳): بارگاہِ الٰہی میں تواضع۔

(۴): اپنے بھائیوں کی اذیت رسانی سے اجتناب۔

(۵): نیک و بد کو نصیحت۔

(۶): تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب۔

(۷): مغفرت کو طلب کرنا۔

(۸): غصہ، تکبر، بدکاری، لڑائی، جھگڑے کو ترک کرنا۔

(۹): ہر وقت موت کیلئے تیار رہنا۔

اس کے باوجود تصوف کے مخالفین جب بھی صوفیائے کرام کے اخلاق کے بارے میں کوئی بات سنتے ہیں تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ صوفیاء کا کلام ہے نہ کہ شرعی۔ اس سے سننے والا یہ گمان کرتا ہے کہ تصوف شریعت سے جدا کسی چیز کا نام ہے حالانکہ

آپ جان چکے ہیں کہ تصوف شریعت کا لب لباب ہے۔ اور جو شخص بھی صوفیائے کرام کی ان کتب کا مطالعہ کرتا ہے جو دشمن کی سیاہ کاریوں سے محفوظ ہیں جیسے ابو نعیم کی کتاب حلیۃ الاولیاء، رسالہ قشیریہ، قلا آبادی کی تعرف، طوسی کی اللمع۔ امام غزالی کی احیاء العلوم، شیخ سلمی کی طبقات الصوفیاء، شیخ حارث محاسبی کی الرعیہ بحقوق اللہ اور شیخ ابن عربی کی وصایا وغیرہ۔ تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں شریعت کے مخالف کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بڑی سختی سے اپنے نفوس کا محاسبہ کرتے ہیں اور ہمیشہ عزیمت پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے طریقہ کی بنیاد علم و عمل پر ہے۔ اس کا تانا اور پیٹا شریعت اور حقیقت ہے۔

کیا شریعت اور حقیقت جدا جدا ہیں:

بعض تصوف کے جھوٹے دعویدار اور اسلام سے انحراف کرنے والے کہتے ہیں کہ دین کا مقصد صرف حقیقت ہے۔ اس طرح انہوں نے احکامِ شریعت کو معطل کر دیا ہے۔ فرائض اور واجبات کو ترک کر کے شریعت کی مخالفت کو جائز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دل کی اصلاح ہی مقصدِ حقیقی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اہلِ باطن کا نام دیتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو اہلِ ظاہر کہتے ہیں۔ یہ لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے اور زندیق ہیں۔ ان کے اقوال واعمال مخلص صوفیائے کرام پر حجت نہیں ہو سکتے۔ صوفیائے کرام نے ان لوگوں کے خطرہ سے خبردار کیا ہے اور ان کے پاس بیٹھنے اور صحبت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور ان کے احوال اور دینِ اسلام سے انحراف سے برأت کا اظہار کیا ہے۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے مرید سے فرماتے ہیں کہ چلو اس شخص کو دیکھیں جس نے اپنے آپ کو ولایت میں مشہور کر رکھا ہے۔ اس شخص کے زہد و تقویٰ کا بڑا چرچا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم اس تک پہنچے وہ اپنے گھر سے نکلا تو قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے تھوک دیا۔ جب ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا یہ عمل دیکھا تو آپ واپس لوٹ آئے اور اسے سلام تک نہ کیا اور فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے آداب میں سے ایک ادب کی حفاظت نہیں کر سکا۔ وہ اس کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے جس کا وہ دعویٰ (ولایت) کرتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو صاحبِ کرامت ہو حتیٰ کہ وہ ہوا میں بھی اڑتا ہو تو اس سے دھوکہ نہ کھاؤ بلکہ دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی بجا آوری اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت اور احکامِ شریعت کی ادائیگی میں کیسا ہے؟

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کی ظاہری سنت پر عمل پیرا نہ ہو، اس کی اتباع صحیح نہیں ہے اگرچہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح ہو اور اس سے ہزاروں کرامات کا ظہور ہو۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو۔ اپنے انجام سے غافل جابر و ظالم، خوشامد اور جاہل صوفی۔

سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس طرح نہ کہو کہ جس طرح بعض جاہل صوفی کہتے ہیں کہ ہم اہلِ باطن ہیں اور وہ اہلِ ظاہر ہیں۔ یہ دین مکمل اور جامع ہے اس کا باطن اس کے ظاہر کا لب لباب ہے اور اس کا ظاہر باطن کیلئے ظرف ہے۔ اگر ظاہر نہ ہوتا تو باطن کا بھی وجود نہ ہوتا۔ جس طرح یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دل جسم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اگر جسم نہ ہو تو دل فاسد ہو جائے۔ اسی طرح دل جسم کا نور ہے۔ اور یہ علم جس کو بعض علم باطن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سے مراد اصلاحِ قلب ہے اور اس کی بنیاد ارکانِ اسلام پر عمل کرنا اور دل کے ساتھ ان کی تصدیق کرنا ہے۔

اے مخاطب! جب تیرا دل حسن نیت سے متصف اور پاکیزہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ تو قتل، چوری، اور زنا کا ارتکاب کرے۔ سود کھائے اور شراب پئے۔ جھوٹ بولے، تکبر کرے، سختی سے پیش آئے تو تیرے دل کی حسن نیت اور پاکیزگی کا کیا فائدہ ہے؟ جب تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ تیرا دامن پاک رہے روزہ رکھے، صدقہ کرے اور تواضع وانکساری اختیار کرے اس کے باوجود تیرے دل میں نمود و نمائش اور فساد ہو تو تیرے عمل کا کیا فائدہ ہے۔

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس آدمی کا انکار کرتے ہیں جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ کسی خاص حال میں سالک سے شرعی پابندیاں ساقط ہو جاتی ہیں جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا! فرضی عبادات کو ترک کرنا زندیقی ہے اور ممنوعات کا ارتکاب کرنا معصیت ہے۔ فرض کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہو سکتا۔

شیخ الطائفہ امام جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ مذہب (تصوف) کتاب و سنت کے اصولوں کے ساتھ مقید ہے آپ مزید فرماتے ہیں کہ مخلوقِ خدا کیلئے وصولی الی اللہ کے تمام راستے بند ہیں مگر ایک راستہ کھلا ہے۔ اور وہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا طریقہ ہے۔ جس نے آپ کی سنت کی پیروی کی اور آپ کے طریقہ پر کاربند رہا۔ اس کیلئے نیکی کے تمام راستے کھلے ہیں۔

آپ کے پاس ایک آدمی نے معرفت کا ذکر کیا اور کہنے لگا، اہلِ معرفت کبھی ایسے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ نیکی کے اعمال ترک کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا! بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک مقام پر بندے سے فرائض وواجبات ساقط ہو جاتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کا یہ قول بڑا خطرناک ہے بلکہ جو شخص چوری اور زنا کرتا ہے اس کی حالت ان لوگوں سے اچھی ہے جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ عارفین اللہ تعالیٰ سے ان اعمال صالحہ کو حاصل کرتے ہیں اور انہی اعمال کے ذریعہ اس کی رضا حاصل کر لیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر میں ہزار سال بھی زندہ رہوں تو نیک اعمال میں ذرا بھی کمی نہ

کروں گا۔ آپ مزید فرماتے ہیں کہ علمِ تصوف قیل و قال کے ذریعہ حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترکِ دنیا اور خواہشاتِ نفسانیہ کو ختم کر کے حاصل کیا۔

شیخ ابراہیم بن محمد نصر آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد درج ذیل امور پر استوار ہے۔

کتاب و سنت کی پیروی۔ نفسانی خواہشات اور بدعات کو ترک کرنا۔ مشائخِ کرام کی تعظیم۔ مخلوقِ خدا کی معذرت قبول کرنا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کرنا۔ اخلاق جمیلہ کو اپنانا۔ ذکر واذکار پر پابندی کرنا۔ اور رخصت اور تاویلات سے اجتناب کرنا۔

آپ فرماتے ہیں کہ راہِ طریقت میں وہی گمراہ ہوتا ہے کہ جس کی ابتداء صحیح نہ ہو۔ کیونکہ ابتداء کی خرابی انتہاء میں اثر کرتی ہے۔

فقہاء، صوفیا شریعت اسلامیہ کے علمائے کرام یعنی فقہاء محدثین رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر گامزن تھے وہ شریعت، طریقت اور حقیقت کو جامع تھے۔ اپنی عملی عبادات کو اخلاص کے ساتھ ادا کرتے تھے وہ عبادت کی حلاوت اور اس کے اسرار سے واقف تھے۔ اسی طرح وہ اپنے نفوس کی تہذیب اور اپنے قلوب کی اصلاح کیلئے مجاہدے کیا کرتے تھے۔ تقویٰ اور معرفتِ الٰہی سے آراستہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ علمی مراتب حاصل کئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب کا فہم اور شریعت میں تعمق عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے امت کو ان کے علوم سے نفع پہنچایا۔ حالانکہ انہیں گزرے ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ گویا کہ وہ اپنے ان علمی آثار کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں۔

صاحبِ درمختار علامہ حصکفی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نقل کرتے ہیں کہ ابو علی دقاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ میں نے یہ طریقہ ابو القاسم نصر آبادی سے حاصل کیا۔ ابو القاسم فرماتے ہیں کہ میں نے اسے شبلی سے اخذ کیا اور انہوں نے سری سقطی سے اور سری سقطی نے معروف کرخی سے اور انہوں نے داؤد طائی سے اور داؤد طائی نے یہ علم اور طریقہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حاصل کیا۔ اور ان میں سے ہر ایک نے امام صاحب کی تعریف وتوصیف کی اور آپ کی فضیلت کا اعتراف کیا پھر صاحب درمختار اس پر تبصرہ فرماتے ہیں اے میرے بھائی! تعجب ہے تم پر۔ یہ صوفیائے کرام کیا تمہارے لئے اسوۂ حسنہ نہیں ہیں؟ کیا انہوں نے امام صاحب کی فضیلت کا اقرار نہیں کیا ہے کیا اس میں وہ جھوٹے ہیں؟ نہیں یہی تو طریقت کے ائمہ اور شریعت و حقیقت کے والی ہیں۔ ان کے بعد آنے والے ان کے تابع ہیں۔ اور ان بزرگوں کی مخالفت کرنے والا مردود اور بدعتی ہے۔

شاید آپ کیلئے یہ بات تعجب کا باعث ہو کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہی سے ان جیسے اکابر اولیائے صالحین نے طریقت کو اخذ کیا ہے۔ فقہائے کرام کو بھی امامِ اعظم کی پیروی کرنی چاہیئے اور ان کے طریقہ پر چل کر شریعت اور حقیقت کو جامع ہونا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے علم کو نفع بخش بنائے جس طرح امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے علم کو نفع مند بنایا۔

ابن عابدین در مختار کے حاشیہ میں علامہ حصکفی کے مذکورہ قول پر تبصرہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم اس میدان کے شہسوار ہیں۔ علم حقیقت کی بنیاد علم و عمل اور تصفیۂ نفس پر ہے اور اکثر سلف صالحین نے آپ کی ان صفات کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کو علم وورع زہد و تقویٰ میں وہ مقام حاصل تھا جس کو کوئی نہیں پا سکا آپ کو کوڑے مارے گئے تاکہ آپ قاضی کے عہدہ کو قبول کرلیں لیکن آپ نے قبول نہیں کیا۔

امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ سے زیادہ کوئی اس بات کا مستحق نہیں کہ اس کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ آپ متقی پرہیز گار، فقیہ، عالم دین اور امام تھے۔ آپ نے علم کے اسرار و رموز سے اس طرح پردہ اٹھایا کہ کوئی دوسرا اس بلندی تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے کہا کہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس سے آیا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ تو ایسے شخص کے پاس سے آیا ہے جو کہ تمام اہلِ زمین سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ ائمہ مجتہدین اور علمائے عاملین ہی حقیقی صوفیاء ہیں۔ اگر کوئی معترض یہ کہے کہ اگر طریقہ تصوف امر مشروع ہوتا تو ائمہ مجتہدین بھی اس کے بارے میں کتابیں لکھتے حالانکہ تصوف کے بارے میں ان ائمہ کرام نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ امام شعرانی اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین نے اس بارے میں کوئی کتاب اس لئے نہیں لکھی، کہ ان کے زمانہ میں قلبی امراض کم تھے اور اکثر لوگ ریا اور نفاق سے محفوظ تھے، پھر اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس زمانہ کے لوگ ان بیماریوں سے محفوظ رہتے۔ پھر بھی یہ لوگ انتہائی کم تعداد میں تھے۔ اور اس کے علاوہ اس دور میں ائمہ مجتہدین ان ادلۂ شرعیہ کو جمع کرنے میں مشغول تھے، جو مختلف علاقوں میں تابعین اور تبع تابعین کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ کیونکہ یہ ادلہ ہی تمام ادلہ کی بنیاد تھیں۔ اور ان ادلہ کے ذریعہ ہی تمام احکامِ شرعیہ کی معرفت ممکن تھی، اور یہ چیز ان امور میں مشغول ہونے سے زیادہ اہم تھی۔ جن کا تعلق دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ امام ابو حنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم جیسے جلیل القدر ائمہ کرام اپنے نفس میں ریا، خود پسندی، تکبر، حسد یا نفاق کو پاتے ہوں

اور پھر اپنے نفس کا مجاہدہ نہ کرتے ہوں، اگر انہیں ان آفات و امراض سے سلامتی کا علم نہ ہوتا تو وہ ان کے علاج میں مشغول ہونے کو ہر علم پر مقدم کرتے۔

علم

اسلام کو روزِ اول سے ہی سخت ترین دشمنوں اور مخالفوں کا سامنا ہے۔ یہ لوگ اسلامی علوم میں خرافات اور باطل نظریات داخل کر کے اور اس کے سنہری اصولوں کو مسخ کر کے اس کی بنیادوں کو اکھیڑنے کے خواہشمند ہیں۔ جیسا کہ ہم اس کے اثرات کا علمِ تفسیر، حدیث، تاریخ اور تصوف میں واضح طور پر مشاہدہ کرتے ہیں۔

(۱): **علمِ تفسیر:** تفسیر کی کتب میں بہت سی اسرائیلی روایات ملتی ہیں جو جھوٹے قصوں اور غیر اسلامی عقائد پر مشتمل ہیں۔ ان روایات کو کتب تفسیر میں ان یہودیوں نے داخل کیا ہے جو ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے ذہنوں میں یہ قصے، کہانیاں راسخ ہو چکی تھیں انہوں نے اپنے انبیاء کی تحریف شدہ کتابوں سے روایت کیا تھا۔ اور بعض مسلمانوں نے انہیں صحیح سمجھ کر قبول کر لیا۔

پھر مسلمان علماء نے توفیقِ الٰہی سے کتب تفاسیر کو ان اسرائیلی روایات سے پاک کیا اور مسلمانوں کو ان کے ضرر سے آگاہ کیا۔ خصوصًا وہ رایات جن کا تعلق عقیدہ سے تھا جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بیمار ہو گئے حتیٰ کہ آپ کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ بعض اسرائیلی روایات میں انبیاء علیہم السلام کی طرف گناہوں کو منسوب کیا گیا **(معاذ اللہ)**۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام اپنے کسی فوجی کی بیوی پر عاشق ہو گئے۔ اس کے خاوند کو جنگی محاذ پر بھیج دیا۔ وہ وہاں قتل ہو گیا تو آپ نے اس کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اور اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی کے ساتھ **معاذ اللہ** گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی حکایات ہیں جو انبیاء اور رسل علیہم السلام کے مقام کے منافی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر برائی سے محفوظ کر لیا تھا۔

ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان اسرائیلی روایات کو پس پشت ڈال کر صحیح مشہور اسلامی ماٰخذ پر اعتماد کرے۔

(۲): **حدیث:** بعض خود غرض مخالفین نے اسلام کے سنہری اصولوں کو مسخ کرنے کا یہ طریقہ اپنایا کہ انہوں نے بعض بے بنیاد اور جھوٹی باتوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے ذخیر احادیث میں شامل کر دیا تو اس سے ان کا مقصد اسلام کے بنیادی عقیدہ کو کھوکھلا کرنا اور اس میں ایسے تباہ کن افکار داخل کرنا تھا جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا جیسے تجسیم، تشبیہ، جہت اور اس جیسے دوسرے غیر اسلامی عقائد۔

اسی طرح انہوں نے ترغیب وترہیب میں بھی بہت سی احادیث وضع کیں۔ جب انہیں کہا جاتا کہ تم رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کیوں باندھتے ہو حالانکہ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔

جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

تو وہ کہتے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کیلئے جھوٹ بولا ہے نہ کہ ان کے خلاف۔ بعض لوگ سلاطین اور حکام کا قرب حاصل کرنے کیلئے احادیث گھڑا کرتے تھے تاکہ وہ دنیاوی اور مادی مقاصد حاصل کریں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی سنت کو زندہ رکھنے کیلئے ایسے مخلص اور غیور علماء پیدا کئے جنھوں نے احادیث طیبہ کے ذخیروں کی جانچ پڑتال کر کے صحیح ضعیف اور موضوع احادیث کو الگ الگ کر دیا۔ ان علماء میں حافظ المزی، زین عراقی، علامہ ابن حجر اور امام ذہبی قابلِ ذکر ہیں۔ بعض غیور علماء نے ایسی کتب تالیف فرمائیں جن میں انہوں نے صرف موضوع احادیث کو جمع کر دیا تاکہ لوگ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکیں جیسے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی "اللالی المصنوعۃ فی احادیث الموضوعۃ" اور ملا علی قاری کی "المصنوع فی الحدیث الموضوع" وغیرہ۔

(۳): تاریخ: ان لوگوں کیلئے تاریخ ایک وسیع اور زرخیز میدان تھا۔ انہوں نے تاریخ اسلام میں ایسے گمراہ کن خیالی قصے داخل کر دیئے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس طرح وہ مسلمان خلفاء اور سلاطین کی سیرت کو مسخ کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ کتاب "الف لیلہ و لیلہ" میں بہت سے عجیب وغریب جھوٹے قصے ہاورن الرشید کی طرف منسوب کئے گئے تھے۔

صلیبیوں، مستشرقین اور ان کے پروردہ گروہ نے تاریخ اسلام کے بارے میں جو بے بنیاد اور باطل پرپیگنڈہ کیا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔ ان کا مقصد اسلام کی بنیاد کو کھوکھلا کرنا اور مشاہیر اسلام کی سیرتوں کو مشکوک بنانا تھا۔ لیکن ابن ہشام، ابن اثیر، ابن کثیر اور ذہبی جیسے مسلمان حقیقی موٴرخین نے تاریخِ اسلام کی تدوین وتہذیب کی۔ اور اس کو ان بے بنیاد چیزوں سے پاک کر کے صاف ستھرا کر کے پیش کیا۔ طالب حقیقت کو چاہئے کہ وہ ان صحیح ماخذ کی طرف رجوع کرے تاکہ اچھی اور بری چیز میں تمیز کر سکے۔

(۴): تصوف: علمِ تصوف بھی دوسرے علوم دینیہ کی طرح مخالفین کی تحریف سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان میں سے بعض نے کتب صوفیاء میں منحرفانہ عقائد اور ایسی عبارات کا اضافہ کر دیا جن کا تصوف اور صوفیاء سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہ تھا۔

جس طرح کہ تصوف کی بعض کتابوں میں یہ شعر منقول ہے:

وماالکلب والخنزیر الا الھنا　　　وماالرب الا راھب فی کنسیۃ

کتا اور خنزیر ہمارا معبود ہے اور کنیسہ کا راہب ہمارا رب ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاھِھِمْ أَنْ یَقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا“ (الکھف:۵)

ترجمہ: کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے وہ نہیں کہتے مگر (سراسر) جھوٹ۔

ان میں سے بعض نے دینِ اسلام کو ایسے دوسرے امور سے فاسد کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق عقائد سے تھا۔ انہوں نے بعض صوفیائے کرام کی طرف ایسے اقوال منسوب کئے جو اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف تھے۔ جیسے حلول اور اتحاد کا قول۔ اور یہ قول کہ خالق عین مخلوق ہے اور کائنات عین خالق ہے۔

ان میں سے بعض نے صوفیائے کرام کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تا کہ لوگوں کا اعتماد ان سے اٹھ جائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ان کی کتب میں ایسے خیالی قصے اور واقعات داخل کر دیئے جن میں یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ لوگ منکرات اور کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ”طبقات کبریٰ“ میں بعض ایسے واقعات ہیں جن سے وہ بری ہیں۔

ان میں مشنری مبلغین، مستشرقین اور استعمار کے پروردہ بھی شامل ہیں جو صوفیائے کرام کی کتب کا مطالعہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی کلام کی تحریف کر کے اپنی طرف سے جھوٹی باتیں ان کی طرف منسوب کر کے ان کے متعلق کتابیں لکھیں۔ اس سے محض ان کا مقصد اسلام کی بنیاد پر زبان طعن دراز کرنا، اور روح اسلام کو اس کے جسم سے جدا کرنا ہے۔ بہت سے لوگ اس لئے دھوکہ میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے تصوف کو مستشرقین مثلاً نکلسن، گولڈ زہیر یہودی، میسینن فرانسی وغیرہ کی کتابوں سے سمجھنا چاہا، اس طرح وہ ان کے جال میں پھنس گئے۔ اور ان کے مسموم افکار سے متاثر ہو کر صوفیائے کرام کی مخالفت کرنے لگے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایک سچا مسلمان اپنے دھوکہ باز اور مکار دشمن کی بات پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے۔

ان میں سے بعض ایسے سادہ لوح لوگ تھے جو مستشرقین اور ان سے متاثر لوگوں کی باتوں پر اعتماد کرنے لگے۔ اور ان تحریف شدہ اقوال کو صوفیائے کرام کے اقوال خیال کرنے لگے۔ حالانکہ یہ تمام اقوال صوفیائے کرام اور تصوف سے انتہائی بعید تھے۔

اگر کوئی معترض کہے کہ صوفیائے کرام کی طرف منسوب یہ تحریف شدہ اقوال در حقیقت انہیں کے اقوال ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ان کی مطبوع شدہ کتابوں میں موجود ہیں۔

ان کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ صوفیائے کرام کی کتب میں جو اقوال ہیں وہ حقیقتًا انہی کے ہیں۔ کیونکہ یہ کتب بھی مخالفین کی تحریف سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس وقت ہمیں ایسے مخلص محققین کی ضرورت ہے جو اس عظیم اسلامی سرمایہ کو ان تحریفات سے پاک کریں۔

اگر صحیح طریقہ سے یہ ثابت بھی ہو جائے کہ بعض صوفیاء کا کلام شرعی حدود کے مخالف ہے تو ہم جوابًا عرض کریں گے کہ کسی فرد واحد کی کلام پوری جماعت کیلئے حجت نہیں ہو سکتی۔ خصوصًا ایسی جماعت جس کا شعار مذہب اور قرآن وسنت کی پیروی کرنا ہے حتیٰ کہ مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ صوفی کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ حدود شرعی سے واقف ہو اور اس سے سر مو انحراف نہ کرے۔ جب کسی شخص میں یہ شرط اول نہ پائی جائے اور وہ اس کے باوجود صوفی ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

صوفیائے کرام پر کئے گئے ان باطل اعتراضات کا جواب دینے سے بہتر ہے کہ کوئی مثبت کام کیا جائے کیونکہ اس کام میں مشغول ہونا اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ محققین علمائے کرام ان اعتراضات کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یہ ذہن نشین کرلیں کہ تصوف کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تصوف ایمان، اخلاق، ذوق شوق اور معرفت کا نام ہے۔ اور یہ صرف ان لوگوں کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔ اور انہیں علم و عمل اور اخلاق و معارف رسول اللہ ﷺ سے وراثت میں ملے ہوں۔ یہ وہ علم ہے جو ایک سینہ سے دوسرے سینہ کی طرف اور ایک قلب سے دوسرے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

بعض بد باطن لوگ صوفیائے کرام کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور خصوصًا تحریف شدہ اقوال اور مخالفین کے داخل کئے ہوئے جھوٹے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ تصوف صرف اسی کا نام ہے۔ اس طرح وہ صوفیائے کرام کے خلاف محاذ قائم کر کے سخت پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اگر وہ صوفیائے کرام کا حقیقی موقف جان لیتے کہ وہ کیسے شریعت کی پابندی کرتے ہیں اور قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر کس قدر سختی سے عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور کس طرح معتبر اسلامی مذاہب اربعہ پر عمل پیرا ہیں اور کس طرح اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ پر مضبوطی سے قائم ہیں تو یقینا انہیں

معلوم ہو جاتا کہ صوفیائے کرام کی طرف منسوب کردہ یہ تمام اعتراضات من گھڑت بے بنیاد اور ان کے اپنے عمل کے منافی ہیں اور یہ مخالفین کی طرف سے داخل کئے گئے ہیں۔ یا کم از کم ان کی کوئی اچھی تاویل ہو سکتی ہے۔

ہم یہاں کچھ مثالیں بیان کرتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ صوفیائے کرام اور علمائے کرام اور علمائے عظام کے مخالفین نے بہت سی ایسی چیزیں ان کی کتابوں میں داخل کر دی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ابن فراء "طبقات" میں فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق اور امام احمد بن حنبل انتہائی نیک اور متقی ہیں جن کی شہرت کو بعض برے لوگوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے فقہ جعفریہ میں بہت سے جھوٹے اور من گھڑت اقوال امام جعفر صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب ہیں۔ حالانکہ وہ ان اقوال سے بری ہیں۔ اور اسی طرح امام احمد کی طرف عقائد کے بارے میں بعض ایسی آراء منسوب ہیں جو آپ نے ارشاد نہیں فرمائیں۔

امام ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا گیا کہ کیا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا عقیدہ آج کل کے حنبلیوں کی طرح تھا؟ آپ نے جواب دیا کہ امام اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے، آپکا عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے موافق تھا۔ اور بعض جہلاء جو اپنے آپ کو حنبلی ظاہر کرتے ہیں اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں کہ آپ بھی جہت اور جسمیت کے قائل تھے تو یہ صریح جھوٹ اور بہتان ہے۔ اور وہ شخص ملعون ہے جو اس قسم کے عقیدہ کی نسبت آپ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ حافظ امام ابو الفرج ابن جوزی جو حنبلی مذہب کے ائمہ میں سے تھے انہوں نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ امام صاحب کی طرف یہ چیزیں جو منسوب ہیں وہ محض جھوٹ، افتراء اور بہتان ہے۔ آپ کا اپنا کلام ان چیزوں کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کتاب "نہج البلاغہ" بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور اس کا اکثر حصہ آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت علی بن حسین، شریف مرتضیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر کتاب "نہج البلاغہ" وضع کرنے کا الزام ہے۔ جو شخص اس کتاب کو پڑھے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حضرت امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف کذب وافتراء ہے کیونکہ اس میں سیدنا ابو بکر اور سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سب وشتم اور آپ کی تنقیص شان کی گئی ہے۔ اور اس میں ایسا تناقض اور رکیک عبارات موجود ہیں کہ قریشی صحابہ اور بعد میں آنے والے متاخرین کے بارے میں تھوڑی سی بھی سمجھ رکھنے والا شخص یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کتاب کا اکثر حصہ باطل ہے۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''طبقات کبریٰ'' میں مخالفین اور حاسدوں نے ایسی عبارات داخل کر دیں جو ظاہر شریعت کے خلاف تھیں۔

آپ اس کی وضاحت خود اپنی کتاب ''لطائف المنن و الاخلاق'' میں کرتے ہیں:

آپ فرماتے ہیں کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے صبر عطا فرمایا جب حاسدوں اور دشمنوں نے میری کتب میں ایسے کلام کا اضافہ کر دیا جو ظاہر شریعت کے مخالف تھا اور وہ یہ کلام پیش کر کے میرے خلاف فتوی دینے لگے۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے سلطان وقت کو بھی خطوط ارسال کر دیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے میں اس آزمائش میں اس وقت مبتلا ہوا جب میں ۹۴۷ھ میں حج کیلئے مکہ مکرمہ گیا۔ تو وہاں بعض لوگوں نے ایک جھوٹا مسئلہ میری طرف منسوب کر دیا جو ائمہ اربعہ کے اجماع کے مخالف تھا۔ اور وہ یہ کہ میں نے بعض لوگوں کو نماز کے وقت سے مقدم کرنے کا فتویٰ دیا جب کہ بندہ کو کوئی ضروری کام ہو۔ انہوں نے اس بات کو دوران حج عام کر دیا اور بعض مخالفین نے خط کے ذریعہ اہلِ مصر کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔ جب میں واپس مصر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں اس مسئلہ کی وجہ سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا حتیٰ کہ یہ بات مشرقی مغربی صوبوں صعید مصر اور رؤسائے سلطنت تک پہنچ چکی ہے جس کی وجہ سے میرے متعلقین کو بہت نقصان ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ مجھے بھی ترچھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ان خطوط کے بارے میں بتایا جو مکہ سے آئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کس نے میری غیبت کی اور میری عزت کو داغدار کرنے کی کوشش کی۔

پھر میں نے کتاب ''البحر المورود فی المواثیق العھود'' لکھی جس پر چاروں مذاہب کے چالیس علماء نے دستخط کئے لوگوں میں یہ کتاب انتہائی مقبول ہو گئی۔ انہوں نے اس کے چالیس نسخے تیار کئے۔ تو حاسدین غیظ و غضب سے بھڑک اٹھے۔ اور انہوں نے میرے ایک سادہ مرید سے اس کا نسخہ عاریۃً لیا اور اس میں باطل عقائد اور ایسے مسائل کا اضافہ کر دیا جو مسلمانوں کے اجماع کے مخالف تھے۔ اسی طرح انہوں نے جحا اور ابن راوندی کی حکایات اور لطائف شامل کر دیئے اور کتاب کے مختلف مقامات پر اس طرح ملا دیئے ایسا معلوم ہونے لگا گویا کہ وہ اصل کتاب ہے۔ اور پھر ان کتب کو بازار بھیج دیا جہاں طالبان علم کا مجمع رہتا ہے۔ انہوں نے ان کتابوں پر میرا نام دیکھا اور ان کو خرید لیا۔ بعض مخالفین اس کتاب کو جامعہ ازہر کے علماء کے پاس لے گئے۔ ان میں سے بعض علماء تو وہ تھے جنہوں نے اس کتاب پر دستخط کئے تھے۔ اور بعض دوسرے تھے جس کی وجہ سے ایک بہت بڑا فتنہ برپا ہو گیا اور لوگ تقریباً ایک سال تک مساجد بازاروں اور امراء کے گھروں میں میرے خلاف باتیں کرتے رہے حالانکہ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ شیخ ناصر الدین لقانی، شیخ الاسلام حنبلی، شیخ شہاب الدین بن حلبی نے میرا دفاع کیا۔ حالانکہ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ جامعہ ازہر سے میرے ایک محب نے مجھے پیغام بھیجا اور تمام حالات سے مجھے آگاہ کیا۔ میں نے اپنا وہ نسخہ اس

کی طرف بھیجا جس پر علماء کے دستخط تھے جب علماء نے اس کا مطالعہ کیا اور اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو حاسدین نے میری طرف منسوب کی جب انہیں حقیقت حال سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے اس شخص کو سب و شتم کی جس نے اس آگ کو بھڑکایا تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں بعض کم فہم اور عجلت پسند لوگوں کو جانتا ہوں جو ابھی بھی میرے متعلق برا نظریہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے میرے ان حاسدوں سے میرے متعلق باتیں سنیں۔ پھر ان حاسدین نے ان مسائل کو جو میری اس کتاب میں جمع کئے گئے تھے۔ اپنے پاس جمع کر لیا اور جب بھی وہ کسی کے بارے میں سنتے کہ وہ مجھے ناپسند کرتا تو اسے کہتے کہ ہمارے پاس اس کے متعلقہ کچھ مسائل ہیں۔ اگر تمہیں ضرورت ہے تو دکھا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ مسائل ایک حاسد سے دوسرے حاسد تک منتقل ہوتے رہے۔ اور یہ لوگ میرے خلاف علماء سے فتویٰ لیتے اور مجھے اس کا علم تک نہ تھا۔ اور جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے تمام علمائے ازہر کی طرف پیغام بھیج دیا کہ یہ تمام لوگ میرے متعلق آپ سے فتویٰ لیتے ہیں۔ اور یہ تمام مسائل میری طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ سب من گھڑت ہیں۔ اس طرح علماء نے اس کے متعلق فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔

عظیم مؤرخ عبدالحی بن عباد حنبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "شذرات الذهب فی اخبار من ذهب" میں شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سوانح کے تحت آپ کی اور آپ کی تالیفات کی تعریف و توصیف کے بعد فرماتے ہیں کہ کچھ حاسدوں نے آپ کی تالیفات میں ایسے کلمات داخل کر دئے جو ظاہر شریعت کے مخالف تھے اور اسی طرح باطل عقائد اور اجماع امت کے مخالف مسائل کا اضافہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے آپ کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا اور آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان حاسدین کو رسوا کر کے آپ کو ان پر غلبہ عطا فرمایا۔ آپ سنت پر سختی سے کاربند تھے اور حد درجہ کے متقی و پرہیز گار تھے۔ آپ غرباء و فقراء کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے حتیٰ کہ اپنے جسم کے کپڑے بھی انہیں عطا کر دیتے۔ لوگوں کی اذیت رسانی کو برداشت کرتے۔ آپ نے اوقات کو مختلف قسم کی عبادات میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ یعنی آپ مخلوقِ خدا کی راہنمائی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہتے۔ آپ کے زاویہ میں دن رات ذکر و فکر کی گونج سنائی دیتی۔ آپ جمعرات کی پوری شب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیۂ درود و سلام پڑھتے ہوئے گزارتے۔ آپ نے اس معمول کو جاری و ساری رکھا۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کی بڑی قدر تھی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائی۔

شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "یواقیت والجواهر" میں فرماتے ہیں کہ بعض زندیقوں نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مرض موت میں باطل عقائد کو آپعقائد کے سرہانے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ آپ کے شاگرد آپ کے صحیح عقیدہ سے بخوبی واقف نہ ہوتے تو وہ اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتے۔

اسی طرح شیخ مجد الدین فیروز آبادی بیان فرماتے ہیں کہ کسی ملحد نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تنقیصِ شان میں ایک کتاب لکھی اور اس کو میری طرف منسوب کر کے شیخ جمال الدین بن الخیاط کی طرف بھیج دیا۔ شیخ نے مجھ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ جمال الدین کی طرف خط بھیجا کہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حد درجہ معتقد ہوں اور میں نے آپ کے مناقب میں ایک بہترین کتاب لکھی ہے جس میں آپ کی بے حد تعظیم کا اظہار کیا ہے۔ آپ کے پاس یہ جو کتاب پہنچی ہے اس کو جلا دو یا دھو ڈالو کیونکہ یہ مجھ پر محض افتراء اور جھوٹ ہے۔

عظیم فقیہ شیخ احمد بن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ امام العارفین قطب ربانی شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''غنیۃ الطالبین'' کی بعض عبارات سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کیونکہ ان عبارات کا اضافہ کسی حاسد نے کیا ہے (اللہ تعالیٰ اسے اس عمل کی سزا دے)۔ کیونکہ آپ اس قسم کے عقائد سے بالاتر ہیں۔ آپ کے متعلق اس قسم کے عقائد کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ آپ قرآن و سنت، فقہ شافعی اور حنبلی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ دونوں مذاہب کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ان ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو باطنی علوم و معارف اور خوارق ظاہرہ و باطنہ سے بھی نوازا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض ایسے اقوال بھی ہیں جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اقوال آپ سے صادر ہوئے ہوں کیونکہ یہ اقوال تو ان یہودیوں سے صادر ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے جاہل ہیں۔ جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے حق میں کون سی چیز واجب ہے اور کون سی جائز۔ اور کون سی محال؟ اللہ تعالیٰ ان تمام نقائص سے پاک ہے اور اس قسم کے عقائد کو غوث الثقلین کی طرف منسوب کرنا عظیم بہتان ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں بھی بعض مسائل کا اضافہ کیا گیا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو احیاء العلوم کا وہ نسخہ ملا جس میں باطل عقائد کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس لئے آپ نے اسے جلانے کا حکم دے دیا۔

شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض حاسدین نے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ اگر اللہ تعالیٰ سے قیامت نہ قائم کرنے کا سوال کر دیں تو اللہ تعالیٰ قیامت قائم نہ کرے اور بعض بندے ایسے ہیں وہ اگر ابھی قیامت قائم کرنے کا سوال کر دیں تو وہ ابھی قیامت قائم کر دے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف ایسا قول منسوب کرنا صریح جھوٹ ہے۔ اور آپ اس قسم کے اقوال سے بری ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے قول سے قیامت کے بارے میں وارد شدہ نصوص قطعیہ کا رد لازم آتا ہے۔ اور یہ شارع علیہ السلام کی تکذیب کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک کتاب میں ایسا قول موجود ہے تو کسی ملحد نے اس کا اضافہ کیا ہے۔ امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود ایک کتاب دیکھی ہے جو اہلِ سنت

والجماعت کے عقائد سے بھری ہوئی تھی یہ کسی ملحد کی تصنیف کردہ کتاب تھی۔ جسے اس نے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب کر دیا۔ شیخ بدر الدین بن جماعہ جب اس کتاب پر مطلع ہوئے تو آپ نے اس کتاب پر لکھ دیا کہ جس نے اس کتاب کو حجۃ الاسلام کی طرف منسوب کیا وہ جھوٹا اور مفتری ہے۔

شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض حاسدوں نے میری کتاب "بحر المورود" میں کچھ باطل عقائد کا اضافہ کر دیا اور ان باطل عقائد کو مصر اور مکہ مکرمہ میں پھیلا دیا حالانکہ میں ان عقائد سے بری تھا۔ جس طرح کہ میں نے اس کتاب کے خطبہ میں اس چیز کا اظہار کیا ہے جب میں نے اس کو تبدیل کر دیا۔ اس کتاب پر علمائے کرام کے دستخط موجود تھے۔ اور یہ فتنہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب میں نے علمائے کرام کی طرف وہ نسخہ بھیجا جس پر وہ دستخط موجود تھے۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مخالفین نے آپ کی بعض معروف کتابوں میں باطل عقائد کا اضافہ کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "طبقات کبریٰ" ہے۔ اگر کوئی منصف مزاج شخص امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس کلام کے درمیان جس میں آپ نے صوفیائے کرام کے شریعت پر سختی سے کاربند ہونے کا ذکر کیا ہے اور طبقات کبریٰ کے درمیان موازنہ کرے تو ان دونوں کلاموں کے درمیان مخالفت اور تباین اس پر ظاہر ہو جائے۔ اور اسے معلوم ہو جائے کہ طبقات کبریٰ میں جو اس قسم کی کلام موجود ہے وہ سب جھوٹ ہے۔

اسی طرح مخالفین نے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتب میں بھی باطل عقائد کا اضافہ کیا ہے۔ شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ کتاب و سنت پر سختی سے کاربند تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس کے ہاتھ سے ایک لمحہ کیلئے بھی میزان شریعت نکل گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ قیامت تک آپ کے بارے میں لوگوں کا یہی عقیدہ ہے۔ آپ کی کلام میں سے لوگوں کو بعض چیزیں سمجھ نہیں آتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی پرواز انتہائی بلند تھی۔ اور اسی طرح اگر آپ کی کلام میں کوئی ایسی چیز ہے جو ظاہر شریعت کے خلاف ہے تو وہ مخالفین کی اضافہ شدہ ہے جس طرح کہ اس کی خبر مجھے ابو طاہر مغربی نزیل مکہ مکرمہ نے دی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ میں ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "فتوحات مکیہ" کو مختصر کر رہا تھا تو دورانِ اختصار اس میں بعض ایسی چیزیں آ جاتیں جو ظاہر شریعت کے مخالف ہوتیں میں ان کو خارج کر دیتا، پھر جب شیخ ابو طاہر مغربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے مجھے فتوحات مکیہ کا وہ نسخہ دکھایا جو انہوں نے قونیہ میں شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اپنے دستِ اقدس سے لکھے ہوئے نسخہ سے ملایا تھا تو اس میں وہ تمام چیزیں موجود نہیں تھیں۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ چیزیں مخالفین اور حاسدین کی اضافہ شدہ ہیں

جس طرح کہ مخالفین نے میری کتابوں میں بعض باطل عقائد کا اضافہ کر دیا تھا۔ اور اس کا مشاہدہ میں خود کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور انہیں معاف فرمائے۔

صاحب در مختار فرماتے ہیں: جس نے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "فصوص الحکم" کے بارے میں کہا کہ یہ مخالف شریعت ہے اور گمراہی کیلئے تصنیف کی گئی ہے۔ اور جس نے اس کا مطالعہ کیا وہ ملحد ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اس کتاب میں بعض کلمات ظاہر شریعت کے مخالف ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی یہودی نے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب میں ان کلمات کا اضافہ کر دیا ہے۔ ابن عابدین اس کے حاشیہ میں صاحب در مختار کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ بات اس لئے کہی کیونکہ آپ کے پاس ان کلمات کے زائد ہونے کا ثبوت تھا یا شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کلام کے مفہوم تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے یا ان کلمات کی تاویل ہی ممکن نہ تھی۔ اس لئے آپ نے فرمادیا کہ یہ کلمات کسی مخالف کے اضافہ شدہ ہیں جس طرح امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ بعض حاسدین نے آپ کی کتابوں میں باطل عقائد کا اضافہ کر دیا اور آپ کی طرف نسبت کر کے عوام میں ان کو مشہور کر دیا حتیٰ کہ آپ نے اپنے ہم عصر علماء سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنی کتاب کا وہ مسودہ دکھایا جس پر علماء کے دستخط تھے۔ اور وہ ان باطل عقائد سے خالی تھا۔ آپ مزید فرماتے ہیں کہ صاحب در مختار نے فرمایا کہ ان کلمات کے مطالعہ نہ کرنے میں ہی احتیاط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تو یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کلمات مخالفین کے اضافہ شدہ ہیں پھر تو بات ظاہر ہے وگرنہ ہر شخص میں شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کلام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے خطرہ ہے کہ اس کو پڑھنے والا شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق غلط نہ سوچنے لگے یا اس کے مفہوم و مقصود کو الٹ سمجھ لے۔

اس طرح مخالفین نے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا ہے کہ اہلِ جہنم نارِ جہنم میں لذت محسوس کریں گے۔ اور اگر ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو انہیں تکلیف ہو گی۔ شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ قول آپ کی کتب میں پایا جاتا ہے تو یہ مخالفین کا داخل کر دہ ہے۔ کیونکہ میں نے آپ کی کتاب "فتوحات مکیہ" کو پڑھا ہے، اس میں آپ نے اہلِ جہنم کے بارے میں تفصیلاً گفتگو فرمائی ہے۔ آپ مزید برآں فرماتے ہیں کہ شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "فصوص الحکم" میں آپ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا! اہلِ جہنم آگ کے ساتھ لذت محسوس کریں گے اور اگر ان کو وہاں سے نکال دیا گیا تو وہ واپس جہنم میں جانے کا مطالبہ کریں گے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ قول آپ کی دونوں کتابوں میں دیکھا ہے۔ میں نے فتوحات مکیہ کے اختصار کے وقت یہ قول حذف کر دیا تھا۔ کیونکہ شیخ شمس الدین شریف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ کی کتابوں میں بعض باطل عقائد کا اضافہ کر دیا گیا ہے کیونکہ اولیائے کرام

میں اجماع ہے کہ آپ کا شمار اولیائے کاملین میں ہوتا ہے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں دائمی حضوری حاصل تھی۔ آپ کے متعلق کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ آپ کوئی ایسی گفتگو فرمائیں جو شریعت کے اساسی عقائد کے مخالف ہو اور جس کی وجہ سے دینِ اسلام اور دوسرے تمام باطل ادیان کے درمیان برابری لازم آئے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہو کہ اصحابِ جنت اور دوزخ برابر ہیں۔ شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق ایسی بات وہی کر سکتا ہے جو عقل سے فارغ ہو۔ اے میرے بھائی! محتاط رہنا، کہیں تم بھی اس کی تصدیق نہ کر دینا جو باطل عقائد کو شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اپنے سمع و بصر اور دل کی حفاظت کرو۔ میں نے تمہیں مخلصانہ نصیحت کر دی ہے۔ والسلام۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد وسطیٰ میں آپ کا یہ ارشاد پڑھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے اپنے مقام میں رہیں گے اور ان میں سے کوئی بھی باہر نہ نکلے گا۔ پھر آپ اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ جہنم سے کفار و مشرکین اور منافقین کسی حالت میں بھی نہیں نکلیں گے لیکن گنہگار موحدین سزا پانے کے بعد جہنم سے نکل آئیں گے۔ جیسا کہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اپنے ارشاد سے ہوتی ہے۔ آپ نے فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۳۷۱ میں فرمایا کہ جب جہنم کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے تو اہلِ جہنم کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جب نارِ جہنم بھڑکے گی تو اس کے اوپر والا حصہ نیچے ہو جائے گا۔ اسی طرح امام باجوری جوہرۃ توحید کی شرح میں فرماتے ہیں کہ بعض صوفیائے کرام کی طرف یہ جو قول منسوب ہے کہ اہلِ جہنم عذاب کے ساتھ عادی ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ اگر انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے تو وہ تکلیف محسوس کریں گے۔ یہ سب جھوٹ اور افتراء ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا۔" (النبا: ۳۰)

ترجمہ: "پس (اے منکرو! اپنے کئے کا) مزا چکھو اب ہم نہیں زیادہ کریں گے تم پر مگر عذاب۔"

ایک مسلمان سے اس باطل عقیدہ کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے جو اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے مخالف ہو۔ شیخ محمد یوسف کافی صراحت فرماتے ہیں کہ اہلِ جنت ہمیشہ کیلئے جنت میں رہیں گے اور مختلف الانواع نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور اہلِ جہنم ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور ہمیشہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب ان سے منقطع ہو جائے گا اور یہ لذت میں تبدیل ہو جائے گا حتیٰ کہ اگر ان کو جنت میں داخلے کی پیش کش کی گئی تو انکار کر دیں گے۔ کیونکہ وہ اس میں

لذت محسوس کریں گے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والا بلا شک وشبہ کافر ہے کیونکہ اس سے بہت سی آیات قرآنیہ کی تکذیب لازم آتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱):إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۶۱) خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (البقرة ۱۶۲)

یعنی بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی، ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔

(۲): "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا، كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوْا الْعَذَابَ" (نساء:۵٦)

ترجمہ: بے شک جنھوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا ہم ڈال دیں گے انہیں آگ میں جب کبھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دیں گے ہم انہیں کھالیں دوسری تاکہ وہ مسلسل چکھتے رہیں عذاب کا۔

ان کے علاوہ دیگر آیات بھی ان کے دائمی عذاب پر دلالت کرتی ہیں۔

یہ قول بھی آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں۔ ولی اللہ سے بعض حالات میں تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کے جواب میں شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ذکر کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی ولی کو کشف کے ذریعہ معلوم ہو جائے کہ یہ برائی اس کے مقدر میں لکھی گئی ہے تو اس کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس برائی کا ارتکاب کرے۔ اسی طرح اگر کسی ولی کو کشف کے ذریعہ معلوم ہو جائے کہ رمضان شریف میں فلاں دن وہ بیمار ہو گا تو اس کیلئے اس دن روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ صبر کرے حتیٰ کہ جب وہ بیماری میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس کیلئے روزہ توڑنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوسرے اعذار کی وجہ سے روزہ توڑنے کی اجازت دی ہے۔ آخر میں شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی ہمارا اور محققین صوفیاء کا مذہب ہے۔

عارف باللہ شیخ ابراہیم دسوقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف بعض حاسدین و مخالفین نے یہ قول منسوب کیا ہے کہ آپ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ نے مجھے "انا اللہ" کہنے کی اجازت دی ہے اور فرمایا اے ابراہیم! انا اللہ (میں اللہ ہوں) کہو اور کچھ پرواہ نہ کرو۔ آپ کی طرف اس منسوب قول میں اللہ تعالیٰ کی شان میں جو بے ادبی وگستاخی ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کے بارے میں بھی یہ قول مشہور ہے کہ آپ نے کعبہ شریف کے بارے میں فرمایا! یہ وہ بت ہے جس کی زمین میں عبادت کی جاتی ہے۔ آپ کی طرف اس قول کی نسبت کرنا محض کذب وافتراء ہے حتیٰ کہ ابن تیمیہ نے خود اس بات کی نفی کی ہے جب ان سے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت رابعہ کے بارے میں جو یہ مشہور ہے کہ انہوں نے بیت اللہ شریف کے بارے میں کہا کہ یہ زمین میں پوجا جانے والا بت ہے۔ یہ سب جھوٹ اور افتراء ہے۔ کیونکہ وہ تو انتہائی پرہیز گار مؤمنہ تھیں۔ اس قول کا قائل کافر ہے اسے توبہ کرائی جائے۔ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ مسلمان بیت اللہ شریف کی عبادت نہیں کرتے بلکہ وہ تو بیت اللہ شریف کے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اسی کے حکم سے اس کا طواف اور نماز میں اس کی طرف منہ کرتے ہیں۔

اگر ہم تاریخ اسلام اور تصوف کے متعلق چھان بین کریں تو اسلام دشمن عناصر کے اضافہ شدہ مختلف امور سے آگاہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہماری یہ کتاب اس قدر گنجائش کی متحمل نہیں۔

خصوصًا تصوف کے لٹریچر میں ان اسلام دشمن عناصر نے زیادہ دلچسپی لی۔ کیونکہ یہ لوگ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ تصوف روحِ اسلام ہے اور صوفیائے کرام اسلام کی حقیقی قوت اور تبلیغِ اسلام کیلئے مینارۂ نور ہیں اس لئے وہ اس نور کو گل کرنا چاہتے ہیں۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ۔ (الصف:۸)

ترجمہ: "یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا۔ خواہ سخت ناپسند کریں کافر۔"

اسلامی لٹریچر میں اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں کتابوں کی نشرواشاعت کا کوئی منظم طریقہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی حکومت کی طرف سے کڑی نگرانی ہوتی تھی جیسا کہ آج کا یہ قانون موجود ہے کہ جو شخص مؤلف کی اجازت کے بغیر کسی کتاب کو شائع کرے گا یا اس کتاب میں کوئی اضافہ کرے گا تو اس کے خلاف قانونی کاروائی ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اس دور میں ہاتھ کے ساتھ کتاب لکھنے کا رواج تھا۔ اس لئے بعض خود غرض اور کذاب کتابوں میں عبارات کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے انہیں علماء اور صوفیاء کی طرف منسوب کر دیتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے امت محمدیہ میں ایسے نابغۂ روزگار علماء پیدا کئے جنہوں نے اسلامی کتب کو ان چیزوں سے پاک کیا اور حق وباطل کے درمیان تمیز کی۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس مختصر سی کتاب کے ذریعہ اس پاکیزہ عمل میں حصہ ڈالا ہے۔ تاکہ اسلامی تصوف کی وہ چمک دمک واپس لوٹ آئے اور لوگ اس مادہ پرستی اور الحاد کے دور میں تصوف کے روحانی فیض سے نفع حاصل کریں۔

صوفیائے کرام کے ارشادات کی تاویل:

صوفیائے کرام کی کتب میں بعض اقوال ظاہری شریعت کے مخالف ہیں ان کی دوصورتیں ہیں:

(۱): یاتو یہ اقوال اسلام دشمن عناصر اور حاسدوں کے اضافہ شدہ ہیں جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۲): یہ اقوال قابلِ تاویل ہیں ان اقوال میں اشارہ، کنایہ اور مجاز کو استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ اسلوب کلامِ عرب میں کثیر استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ أُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ (بقرہ: ۹۳)

ترجمہ: اور سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے۔

اس آیت کریم میں "العجل" سے مراد بچھڑے کی محبت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اسْئَلِ الْقَرْيَةَ۔ (یوسف: ۸۲)

ترجمہ: "قریہ سے سوال کرو۔"

یہاں اہلِ قریہ سے سوال کرنا مراد ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ" (انعام: ۱۲۲)

ترجمہ: "کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے۔"

یعنی اس کا دل مردہ تھا پس اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ۔ (ابراھیم: ۱)

ترجمہ: "تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نور (ہدایت و عرفان) کی طرف۔"

یہاں کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف نکالنا مراد ہے۔اسی طرح بعض قرآنی آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے لیکن گہری نظر و فکر اور تحقیق کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کی تاویل ہو سکتی ہے۔اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآنی آیات میں باہمی تعارض ہے۔

مثلاً ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّکَ لَا تَهْدِی مَنْ أَحْبَبْتَ۔ (قصص:۵۶)

ترجمہ: بے شک آپ نہیں دے سکتے ہدایت جس کو آپ پسند کریں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَ إِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ إِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (شوریٰ:۵۲)

ترجمہ: اور بلاشبہ آپ راہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف۔

علمِ تفسیر سے ناواقف شخص کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان دو آیات کے درمیان تعارض ہے۔کیونکہ پہلی آیتِ کریمہ رسول اللہ ﷺ سے ہدایت کی نفی کر رہی ہے اور دوسری آپ کیلئے ہدایت ثابت کر رہی ہے۔اگر وہ اہلِ علم سے پوچھتا ہے تو وہ اسے بتاتے ہیں کہ پہلی آیت میں ہدایت سے مراد ہدایت پیدا کرنا ہے اور دوسری آیت میں صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنا ہے۔اسی طرح اہلِ علم کے نزدیک ان دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں۔

اسی طرح بعض احادیثِ طیبہ کو ان کے ظاہر پر محمول کرنا صحیح نہیں بلکہ ان میں تاویل کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے وہ حدیث دوسرے احکامِ شرعیہ کے موافق ہو جائے۔اسی سلسلہ میں امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اہلِ حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلقہ احادیث میں تاویل کرنا واجب ہے۔

جیسا کہ اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"ینزل ربنا تبارک و تعالی کل لیلة الی سماء الدنیا حتی یبقی ثلث اللیل الاخر, فیقول: من یدعونی فاستجیب له؟من یسئلنی فاعطیه؟من یستغفرنی فاغفر له؟"۔

ترجمہ:"ہمارا رب ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے حتیٰ کہ جب رات کا تیسرا پہر باقی رہ جاتا ہے تو وہ فرماتا ہے کہ کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا کو قبول کروں۔کوئی ہے مجھ سے مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں۔کوئی ہے مجھ سے مغفرت مانگنے والا کہ میں اسے بخش دوں۔"[1]

---

[1] (بخاری،مسلم)

ایک جاہل نے تو جہالت کی انتہاء کر دی۔ اس نے یہ حدیث منبر پر بیان کی اور پھر ایک سیڑھی نیچے اتر کر لوگوں سے کہنے لگا۔ تمہارا رب اس طرح اپنی کرسی سے آسمانِ دنیا کی طرف اترتا ہے جس طرح میں اس منبر کی سیڑھی سے اترا ہوں۔ اور یہ صریح جہالت ہے۔

اسی طرح اس حدیث "ان اللہ خلق آدم علی صورته" کی علماء نے تاویل کی ہے۔ علامہ ابن حجر ہیثمی اس حدیث پاک کی تاویل میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "صورته" میں "ہ" ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا بھی جائز ہے۔ جس طرح حدیث کا ظاہر سیاق دلالت کرتا ہے۔ اس وقت صورت سے مراد صفت ہو گا۔ اور حدیث کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے اوصاف پر پیدا کیا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کردہ حدیث بھی اس کی مؤید ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرماتی ہیں:

"کان خلقه القرآن"۔

آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ سراپا قرآن ہیں۔ [1]

اسی طرح حدیث پاک ہے:

"تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے ساتھ متصف ہو جاؤ۔

شیخ کامل کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کو ہر قسم کے نقص سے پاک کرے تا کہ وہ اپنے پروردگار کی صفات سے متصف ہو سکے ورنہ اللہ تعالیٰ کے اوصافِ قدیم اور بندہ کے حادث اوصاف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کی انتہائی مدح و ستائش کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی صفات کے ساتھ متصف کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے تو علمائے خلف کے نزدیک اس کی تاویل واجب ہے سوائے ایک گمراہ کن فرقہ کے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ذات باری تعالیٰ کی طرف جہت اور جسم کی نسبت کر کے خطا کے مرتکب ہوئے جو اکثر علماء کے نزدیک صریح کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ہمیں ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔

علامہ مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "جامع الصغیر" میں حدیث قدسی: ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیامة یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودک و انت رب العلمین۔ قال: اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده اما علمت انک لو عدته لوجدتنی عنده۔ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت نہیں

---

[1] (مسلم)

کی۔ بندہ عرض کرے گا۔ اے میرے پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کر سکتا ہوں۔ تو تو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، کی شرح میں فرماتے ہیں! کسی نے ایک عارف باللہ سے پوچھا کہ حق تعالیٰ نے اس حدیث قدسی میں اپنی ذات کی طرف بھوک، پیاس اور بیماری کی نسبت کی ہے۔ کیا ان الفاظ کو اپنے ظاہر پر رکھنا بہتر ہے یا ان کی تاویل کرنی چاہئے جس طرح کہ اسی حدیث میں تاویل موجود ہے کہ بندہ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ میں تیری عیادت کیسے کر سکتا ہوں حالانکہ تو رب العالمین ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ عوام کیلئے اس کی تاویل کرنا واجب ہے تاکہ وہ ذات باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ نہ رکھیں لیکن عارفین کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ظاہر پر ایمان لائیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان چیزوں کی نسبت کرنا محال ہے۔ حقیقت باری تعالیٰ تمام حقائق سے مختلف ہے وہ کسی صورت میں بھی اپنی مخلوق کے ساتھ مجتمع نہیں ہو سکتی، اور نہ ہے صفت تشبیہ اسے لاحق ہو سکتی ہے کیونکہ یہ صفت اسے ہی لاحق ہوتی ہے جو کسی حال میں اپنی مخلوق کے ساتھ مجتمع ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے اس کو اپنے ظاہر پر باقی رکھا تاکہ کمال ایمان کی صفت سے محروم نہ ہوں کیونکہ ان کو اس کے ظاہر پر ایمان لانے کا مکلف بنایا گیا ہے نہ کہ اس کی تاویل پر ایمان لانا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تاویل حق تعالیٰ کی مراد کے مخالف ہو۔ پس ادب اسی میں ہے کہ ہم ہر اس چیز کو اس کی طرف منسوب کریں جو اس نے اپنی ذات کی طرف منسوب کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت وبلاغت اور جوامع الکلم عطا فرمائے تھے۔ پھر بھی آپ ﷺ کے کلام میں بعض اوقات تاویل کی ضرورت پڑتی ہے تو آپ ﷺ کے امتیوں کے کلام میں تاویل کی ضرورت بدرجہ اولیٰ ہو گی۔ کیونکہ ہم فصاحت وبلاغت کے اس مقام پر فائز نہیں ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو سرفراز فرمایا تھا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہر علم وفن کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو اہلِ فن اور اہلِ علم ہی جان سکتے ہیں۔ طب کی اصطلاحات انجینئر نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح انجینئرنگ کی اصطلاحات کو سمجھنا ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔

جو شخص کسی علم کی کتب اس کی اصطلاحات اور رموز واشارات جاننے کے بغیر پڑھتا ہے وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اس علم کی ایسی تاویلات کرتا ہے جو اصل مقصود کے مخالف ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ حیران وپریشان ہو کر گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کی بھی بعض اصطلاحات ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے اوپر وارد ہونے والے انوار وتجلیات کو بیان کرتے ہیں کیونکہ لغت ان چیزوں کو بیان کرنے سے قاصر ہوتی ہے جو شخص صوفیائے کرام کے کلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان کی صحبت اختیار کرے حتیٰ کہ وہ ان کے اشارات اور اصطلاحات کو سمجھ سکے۔ تاکہ ان کی عبارات اس کیلئے واضح ہو

سکیں اور اسے معلوم ہو جائے کہ ان کی کلام کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ خود شریعت سے ذرہ بھر انحراف کرتے ہیں بلکہ وہی تو اس کی روح کو سمجھنے والے اور اس کی حقیقت سے آشنا اور اس کے ورثہ کے محافظ ہیں۔

کسی عارف نے کیا خوب فرمایا ہے:

نحن قوم یحرم النظر فی کتبنا علی من لم یکن من اھل طریقنا۔

ہم وہ لوگ ہیں جن کی کتب میں نظر و فکر کرنا اس شخص کیلئے حرام ہے جو ہمارے طریقہ سے تعلق نہ رکھتا ہو۔

کیونکہ ان علوم و معارف کی تدوین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس شخص تک پہنچایا جائے جو اس کو سمجھنے کا اہل ہے۔ اور جو شخص اس کا اہل نہیں ہے وہ اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ اس کے مخالف ہو جاتا ہے کیونکہ انسان جس چیز سے جاہل ہو اس کا دشمن ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے سید علی بن وفا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ان علوم و معارف اور اسرار کی تدوین عوام الناس کیلئے نہیں ہوتی، بلکہ یہ خواص کیلئے ہیں۔ اگر کوئی غیر اہل اس کا مطالعہ کر رہا ہو تو اس کو منع کر دینا چاہئے۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس اجمال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام اپنی کتب کے مطالعہ سے ان لوگوں کو روکتے ہیں جو ان کے کلام کو سمجھنے سے قاصر اور ان کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس علم کو چھپانا چاہتے ہیں بلکہ وہ اس خوف سے لوگوں کو منع کرتے ہیں کہ کہیں وہ اسے غیر مقصود چیز نہ سمجھ لیں یا اس کی ایسی تاویل نہ کر دیں جو حقیقت سے بہت دور ہو۔ اور اس طرح اپنی کم عقلی کی وجہ سے صوفیائے کرام پر اعتراض کرنے لگیں۔ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے ایسی گفتگو کرے جو ان کے عقل و شعور کے مناسب ہو۔ اور ان کے علم و فہم اور استعداد کے معیار کے مطابق ہو۔ اسی سلسلہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صحیح بخاری میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے "علم کو بعض لوگوں کے ساتھ مخصوص کرنا اور بعض کے ساتھ مخصوص نہ کرنا اس خوف سے کہ وہ اسے نہ سمجھ سکیں گے"۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ و رسولہ۔

لوگوں کے ساتھ ایسی گفتگو کرو جو وہ جانتے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے۔[1]

---

[1] (صحیح بخاری)

علامہ عینی اس حدیث کی شرح کے تحت فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ خصوصی علم اس لئے عطا نہیں کیا جاتا کیونکہ ان کی عقل و فہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کی جائے۔

آدم ابن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب میں عبد اللہ بن داؤد اور وہ حضرت معروف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس چیز کو چھوڑ دو جس کا لوگ انکار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کلام جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہو وہ ترک کر دو۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ تشابہات کو عوام کے سامنے ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اسی کی مثل ایک اور حدیث امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں سے ایسی گفتگو کروگے جو ان کی عقل و فہم سے بالاتر ہو یہ بعض کیلئے باعث فتنہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص ایسا کلام سنتا ہے جو سمجھ نہیں سکتا اور نہ ہی اس کے ممکن ہونے کا تصور کر سکتا ہے تو وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اسے محال گمان کرنے لگتا ہے اور اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف کی جائے تو ان کی تکذیب لازم آتی ہے۔

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر علم میں بعض چیزیں خاص ہوتی ہیں اور بعض عام۔ اسی طرح تصوف میں بھی عموم و خصوص کا لحاظ رکھا جاتا ہے اس لئے کہ معاملات کے متعلق احکامِ الٰہی کو عمومی طور پر ہر ایک کیلئے واضح کر دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ باقی امور کو مخاطب کی استعداد کے مطابق بیان کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حدیث پاک ہے! لوگوں کے ساتھ ایسی گفتگو کرو جو وہ سمجھتے ہیں۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کی گئی کہ آپ سے دو آدمی ایک ہی مسئلہ کے متعلق سوال کرتے ہیں لیکن آپ ہر ایک کو مختلف جواب دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ سوال کا جواب سائل کی استعداد کے مطابق دیا جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔

یہی وجہ ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۵۴: میں فرمایا ہے کہ صوفیائے کرام نے کچھ رموز اور اشارات وضع کئے ہیں جن سے وہ بخوبی آگاہ ہیں۔ اور ان کا مقصد اجنبی شخص کو اپنے درمیان داخل ہونے سے روکنا ہے تاکہ وہ ان احوال سے آگاہ نہ ہو جائے جن میں وہ مگن ہے۔ یہ ان کی شفقت اور مہربانی ہے کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ نووارد کوئی ایسا لفظ سن لے جس کی حقیقت تک اس کی رسائی نہ ہو اور وہ صوفیائے کرام پر اعتراض کرنے لگے۔ اس طرح اسے ان کے فیض سے محروم کر دیا جائے اور پھر اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو جائے۔

اہلِ طریقت میں ایک انتہائی عجیب چیز پائی جاتی ہے اور ان کے علاوہ یہ چیز کسی اور گروہ میں نہیں پائی جاتی۔ اور وہ یہ کہ منطق، نحو، انجینئرنگ، حساب، علمِ کلام اور فلسفہ اور دوسرے علوم کی خاص اصطلاحیں ہوتیں ہیں جن کو نووارد شخص صرف اسی وقت جان سکتا ہے جب ان علوم کے ماہرین ان اصطلاحات سے آگاہ کریں لیکن اہلِ طریقت کا انداز نرالا ہے کہ جب کوئی طالب صادق ان کے سلسلہ میں داخل ہوتا ہے تو اسے ان کے اشارات اور اصطلاحات کی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن جونہی وہ ان کی صحبت میں بیٹھتا ہے اور ان اشارات اور رموز کو سنتا ہے جن کو وہ اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں وہ اس صحبت کی برکت سے ان تمام امور کو سمجھنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ اصطلاحات اسی نے وضع کی ہیں۔ اس طرح وہ ان علوم و معارف کے حصول میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے اور اسے یہ بات عجیب نہیں لگتی بلکہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ علم بالکل بدیہی ہے گویا کہ وہ پہلے ہی اسے جانتا تھا اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ علمائے ظاہر ہمیشہ سے ہی اہلِ تصوف کے کلام کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ عظیم محدث احمد بن سریج ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ کسی نے ان سے پوچھا کیا آپ نے ان کے کلام کو سمجھا ہے تو انہوں نے جواب دیا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا فرما رہے تھے۔ لیکن ان کے کلام دل میں اترتی جارہی تھی۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ باطنی طور پر باعمل اور مخلص ہیں اور ان کی کلام لغو اور بے اثر نہیں۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ اشارات کے ساتھ اسی وقت گفتگو کرتے ہیں کہ جب ان میں کوئی نووارد داخل ہو یا ان اشارات کو اپنی تالیفات میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ یہ بات مخفی نہیں ہے۔ کہ مخالفین کے انکار کی اصل وجہ حسد ہے۔ اگر یہ لوگ حسد کو ترک کر دیتے اور اہل اللہ کا طریقہ اپناتے تو صوفیائے کرام پر اعتراض نہ کرتے بلکہ ان کے علوم سے مستفید ہوتے لیکن خدا کو یہی منظور تھا۔ **ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔**

صاحب درمختار سے جب شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب **"فصوص الحکم"** کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے مطالعہ میں احتیاط ضروری ہے۔ علامہ ابن عابدین اس قول کے تحت لکھتے ہیں کہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کیونکہ اگر تو یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں بعض کلمات مخالفین کے اضافہ شدہ ہیں تو یہ بات ظاہر ہے ورنہ اس کلام کو سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے خدشہ ہے کہ وہ شیخ پر اعتراض نہ کرنے لگے یا اصل مفہوم کے برخلاف سمجھ لے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا نام **"تنبیہ الغبی بتبرئۃ ابن عربی"** ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں لوگ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ حق پر ہے جو ان کی ولایت کا اعتراف کرتا ہے جب کہ دوسرا اس کے برخلاف ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ میرا اس

بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ آپ کی ولایت کا اعتقاد رکھا جائے۔ اور یہ اعتقاد رکھا جائے کہ آپ کی کتب کا مطالعہ عوام الناس کیلئے حرام ہے اور آپ سے یہ منقول بھی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم لوگوں کی کتابوں میں نظر و فکر حرام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام اپنی کلام میں بعض اصطلاحات اور اشارات استعمال کرتے ہیں۔ اور ان سے وہ معنی مراد نہیں لیتے جو فقہاء کے درمیان معروف ہوتا ہے بلکہ اس سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو صوفیائے کرام کے نزدیک متعارف ہوتا ہے۔ جو شخص ان کے کلمات کو عام معنی پر محمول کرتا ہے وہ ان پر کفر کا فتویٰ لگالیتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ صوفیائے کرام کے یہ کلمات قرآن وسنت میں استعمال ہونے والے متشابہات کی مثل ہیں یعنی قرآن وسنت میں ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے چہرہ، ہاتھ اور آنکھ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی تاویل کرنا واجب ہے۔ اسی طرح صوفیائے کرام کے ان کلمات کی تاویل کرنا بھی واجب ہے۔ پھر علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! جب اصل کتاب شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ثابت ہے تو اس کتاب کا ہر کلمہ ان کی طرف منسوب ہوگا مگر یہ احتمال باقی ہے کہ کسی ملحد اور بے دین مخالف نے اپنی طرف سے کچھ کلمات کا اضافہ کر دیا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے ان کلمات سے عام معنی مراد لیا ہو لیکن اس تک رسائی ممکن نہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق امورِ قلبیہ سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس چیز کا دعویٰ کرنا کفر کے مترادف ہے۔ کسی عالم نے کسی صوفی سے سوال کیا، کیا بات ہے کہ تم اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہو جن کا ظاہری مفہوم صحیح نہیں ہوتا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم غیرت کی وجہ سے یہ کلمات استعمال کرتے ہیں تاکہ کوئی شخص اس میں داخل نہ ہو جائے۔

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ابن فارض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتب کے مطالعہ کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کتب کا مطالعہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے کیونکہ ان میں بہت سے ایسے فوائد ہیں جو دیگر کتب سے نہیں ملتے۔ ان میں ایسے عجیب وغریب اسرار بیان کئے گئے ہیں جن کا فیض مسلسل جاری وساری رہتا ہے۔ اور بہت سے دقیق مسائل کی شرح ان کتابوں میں ملتی ہے۔ ان میں کثیر ایسے اسرار ورموز ہیں جن کو عارفین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان کی حقیقت تک رسائی وہ علمائے ربانیین ہی کر سکتے ہیں جو احکام شریعت پر کامل دسترس رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان کے مؤلفین کی فضیلت کے معترف ہیں۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ بعض جہلاء نے ان کتب کا مطالعہ کیا اور ان کے مطالعہ میں مستغرق ہوگئے حالانکہ اس میں انتہائی دقیق معانی اور رموز و اشارات بیان کئے گئے تھے۔ جن کو سمجھنے سے وہ قاصر ہوگئے۔ چونکہ ان امور کو سمجھنے کیلئے علوم ظاہرہ میں دسترس کے ساتھ ساتھ اخلاق عالیہ کے ساتھ متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے یہ کلام ان کے عقل وفہم سے بالاتر تھا۔ اس لئے ان کے قدم جادہ حق سے ڈگمگا گئے۔ اور انہوں نے اصل

معنی و مقصود کی بجائے غلط معنی سمجھ لیا۔ اور اسی کو انہوں نے صحیح گمان کر لیا۔ اور قیامت کے دن خسارہ کے مستحق ہو گئے۔ کیونکہ وہ عقیدہ اہلِ حق سے منحرف ہو گئے۔ اور اپنی کم عقلی کی وجہ سے حلول واتحاد کے غلط عقیدہ میں مبتلا ہو گئے حتیٰ کہ میں نے بعض مفاسد قبیحہ اور کفریات صریحہ ان لوگوں سے سنے ہیں جنہوں نے ان کتب کا مطالعہ تو کیا لیکن ان کے اسلوب وطریقہ سے ناواقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض علمائے کرام نے ان کتابوں پر اعتراض کیا ہے لیکن ہماری نظر میں وہ معذور ہیں کیونکہ ان کا مقصد ان جہلاء کو ان کتب سے دور رکھنا تھا۔ جو ان کیلئے زہر قاتل تھیں نہ کہ ان کے مؤلفین کی ذات واحوال پر اعتراض کرنا۔

علامہ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! المختصر یہ کہ علم کلام اور عارفین کی کتب کا مطالعہ صرف علمائے ربانیین اور ان لوگوں کیلئے جائز ہے جو راہِ سلوک پر گامزن ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کیلئے ان کتب کا مطالعہ جائز نہیں ہے کیونکہ خدشہ ہے کہ وہ کہیں ایسے شبہ میں گرفتار نہ ہو جائیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کیلئے مشکل ہو جائے۔ لیکن نفس انسانی ہمیشہ لغو اور ایسی فضول باتوں میں مشغول رہتا ہے جو اس کیلئے فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

شیخ عبد الکریم جبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب انسان کامل میں فرماتے ہیں کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے سے التماس کرتا ہوں کہ اگر اس میں کتاب وسنت کے خلاف کوئی چیز نظر آئے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ میری مراد ہے جس کیلئے میں نے یہ کتاب تصنیف کی ہے اسے چاہئے کہ وہ اس پر عمل کرنے سے رک جائے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی معرفت عطا فرمائے اور کتاب وسنت سے اس کی کوئی دلیل مل جائے کیونکہ میں نے جو کچھ بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے کتاب وسنت اس کی مؤید ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ ہر وہ علم جس کی تائید کتاب وسنت سے نہ ہو وہ سراسر ضلالت و گمراہی ہے لیکن عام قاری اپنے گمان کے مطابق کسی چیز کے خلاف کتاب وسنت ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ در حقیقت کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو لیکن وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اس حقیقت تک نہ پہنچ سکا ہو۔ اس لئے اسے تسلیم کر لینا ہی بہتر ہے۔

علمائے کرام اور صوفیائے کرام کے ان اقوال و فرمودات سے درج ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱): جو شخص راہِ طریقت پر گامزن نہیں ہے اس کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اہلِ طریقت کی کتب کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ خدشہ ہے کہ وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے جس کا ارادہ ان کتب کے مؤلفین نے کیا ہے۔ کیونکہ یہ شخص اہلِ طریقت کی اصطلاحات اور اشارات سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اجمالی طور پر صوفیائے کرام کی کتب تین حصوں میں منقسم ہیں۔

(۱): یہ کتب عبادات کو ان کے ظاہری اور باطنی آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے احسن طریقہ سے ادا کرنے کے متعلق بحث کرتی ہیں۔

(۲): یہ کتب مجاہدۂ نفس، تزکیۂ دل اور اس کے احوال یعنی ناقص صفات، شک، وسوسہ، ریا، حسد، شہرت اور حب مرتبہ سے دل کو صاف کرنے اور اس کو صفات کاملہ، توبہ، رضا، توکل، تسلیم و رضا، محبت، اخلاص، صدق اور خشوع وغیرہ سے آراستہ کرنے کے متعلق بحث کرتی ہیں۔

یہ دونوں اقسام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی "احیاء العلوم" اور شیخ ابو طالب مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی "قوت القلوب" اور اس قسم کی دیگر کتب میں مذکور ہیں اور ان علوم کو علوم معاملات کہتے ہیں۔

(۳): یہ کتب معارف ربانیہ، علوم لدنیہ اور ذوق ووجدان اور حقائق کشفیہ کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اکثر کتب اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں جیسا کہ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ہیں۔ اس طرح شیخ عبد الکریم جیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "انسان کامل" بھی اسی میں شامل ہے۔ اور اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ سے ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو اہلِ طریقت میں سے نہیں ہیں۔ اور ان علوم کو علوم مکاشفہ کہتے ہیں۔

(۲): مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف، مطالعہ کتب اور اس کی اصطلاحات جاننے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کیلئے کسی شیخ کامل کی صحبت ضروری ہے۔ شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے مرشد علی خواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ گمان نہ کرنا کہ تم صوفیائے کرام کی کتب کے مطالعہ اور ان کی اصطلاحات جان لینے سے صوفی بن جاؤ گے، بلکہ صوفی بننے کیلئے ان کے اخلاق عالیہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اور اسی طرح کتاب و سنت کے جن اخلاق وآداب سے وہ آراستہ ہوئے ان کو جاننا بھی ضروری ہے۔

(۳): صوفیائے کرام نے ان رموز واشارات کو اس لئے وضع کیا تاکہ اس علم کو وہی حاصل کر سکے جو راہِ سلوک کو اپنانا چاہتا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تصوف، مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کیلئے اہلِ ذوق کی صحبت ضروری ہے۔

(۴): وہ عبارات جن میں عقائد حقہ کے بر خلاف باطل عقائد کا ذکر ہے وہ یقیناً مخالفین کی اضافہ شدہ ہیں۔ کیونکہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ صوفیائے کرام کتاب و سنت پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔

(۵): وہ عبارات جو ان سے بالیقین ثابت ہیں اور ان کی تاویل ممکن ہے اور ان کو صحیح عقیدہ اہلِ سنت پر محمول کرنا ممکن ہے تو اس کی تاویل کرنا واجب ہے، کیونکہ یہی ان کا عقیدہ ہے جس کی تصریح انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمات میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ رسالہ قشیریہ، فتوحات مکیہ، التعرف اور احیاء العلوم وغیرہ کے مقدمات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

(۶):اس کے علاوہ ان کی طرف منسوب شدہ وہ عبارات جن کی تاویل ممکن نہیں ہے اگر تو یہ ثابت ہو جائے کہ یہ واقعی ان کی عبارات ہیں تو ان عبارات کا انہیں ذمہ دار ٹھہرا دیا جائے گا۔ لیکن ہم انہیں تسلیم نہیں کریں گے بلکہ ایسا عقیدہ رکھنے والے کی تکفیر کریں گے، لیکن کسی معین شخص کو کافر نہیں کہیں گے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ کیسے ہو گا؟ ہم صرف عقیدہ اہلِ سنت کے ذمہ دار ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے عقیدہ کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

اب ہم آپ کے سامنے کچھ ایسی عبارات پیش کرتے ہیں جن پر بعض جہلاء نے اعتراض کیا ہے اور اس کی وجہ سے صوفیائے کرام کے شریعت سے خارج ہونے کا الزام لگایا ہے۔ لیکن جب آپ کو ان عبارات کے صحیح مفہوم سے آگاہی ہو جائے گی تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ معترضین کے اعتراضات یا تو جہالت کی بنا پر ہیں یا حسد کی وجہ سے۔

(۱):امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض صوفیاء سے یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

”دخلنا حضرۃ اللہ، وخرجنا عن حضرۃ اللہ“۔

ہم بارگاہِ الٰہی میں داخل ہوئے اور اس کی بارگاہ سے نکلے۔

یہاں ”حضرۃ“ (بارگاہ) سے مراد کوئی معین جگہ نہیں ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ زمان ومکان کی حدود سے بالاتر ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک کسی عارف کو مشاہدہ حق حاصل رہتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے اور جب وہ مشاہدہ حق سے محجوب ہو جائے تو کہتے ہیں کہ وہ بارگاہِ الٰہی سے خارج ہو گیا۔

(۲): شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن اپنے بعض دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو میں نے یہ شعر پڑھا:

یامن یرانی ولا اراہ　　　کم ذا اراہ ولا یرانی

اے وہ ذات جو مجھے دیکھتی ہے اور میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اور کئی دفعہ میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے نہیں دیکھتا۔

میرے ایک دوست نے یہ سن کر کہا: یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ وہ تمہیں نہیں دیکھتا حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ تمہیں ہر حال میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔

میں نے اس کے جواب میں فی البدیہ شعر پڑھا:

یامن یرانی مذنبا　　　ولا اراہ آخذا

کم ذا اراہ منعما　　　ولا یرانی لائذا

اے وہ ذات جو مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھتی ہے اور میں اسے گرفت کرتے ہوئے نہیں دیکھتا، میں اسے انعام واکرام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے پناہ طلب کرتے ہوئے نہیں دیکھتی۔

(۳) امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا: "لیس فی الامکان ابدا مما کان۔" اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس سے عمدہ ممکن نہیں۔ شاید آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ تمام ممکنات جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں موجود تھیں اور اس کا علم قدیم زیادتی اور اضافے کو قبول نہیں کرتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" (طٰهٰ:۵۰)

ترجمہ: "جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی راہنمائی کی۔"

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اس قول کی تاویل میں یہی مفہوم بیان کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کلام انتہائی محققانہ ہے کیونکہ مراتب صرف دو ہی ہیں ایک قدوم، دوسرا حدوث۔ حق سبحانہ وتعالیٰ قدوم کے مرتبہ پر فائز ہے اور اس کے علاوہ باقی تمام حدوث کے مرتبہ پر۔ اگر اللہ تعالیٰ اتنی مخلوق پیدا کر دیتا جو عقلاً حد وحساب سے ماوراء ہوتی تو تب بھی یہ مخلوق مرتبۂ حدوث سے مرتبۂ قدوم تک ترقی نہ کر سکتی۔

(۴) ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا:

"خضنا بحرا وقفت الانبیاء بساحلہ"۔

یعنی ہم اس بحر میں غوطہ زن ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جس کے ساحل پر کھڑے ہیں۔

شیخ ابو المواہب شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس قول کی تاویل میں فرماتے ہیں! عارفین اولاً بحر توحید میں دلیل کے ساتھ غوطہ زن ہوتے ہیں اور اس کے بعد مرتبہ شہود پر فائز ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام پہلے ہلہ میں ہی مرتبہ شہود کے ساحل پر پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ایسے ایسے مقامات طے کرتے ہیں جن کو احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ گویا کہ عارفین کی جس مقام پر انتہاء ہوتی ہے وہاں انبیاء علیہم السلام کی ابتداء ہوتی ہے۔

(۵) شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"یصل الولی الی رتبۃ یزول عنہ فیھا کلفۃ التکلیف"۔

یعنی آپ فرماتے ہیں کہ ولی دورانِ سلوک اس مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس سے عبادات کی مشقت زائل ہو جاتی ہے۔

ابو المواہب شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ولی ابتدائے سلوک میں مشقت اور تھکاوٹ محسوس کرتا ہے لیکن جب وہ معرفت کے انتہائی مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ عبادت میں راحت وسکون محسوس کرتا ہے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ارحنا بھا یا بلال۔** یعنی اے بلال! ہمیں نماز سے راحت پہنچاؤ۔

(۶) صوفیائے کرام اکثر اوقات مدد کا کلمہ بھی استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: **"المدد یا رسول اللہ ﷺ، المدد یا شیخ کامل"** اس کلمہ کی بھی صحیح شرعی تاویل ممکن ہے۔

معترضین کہتے ہیں کہ اس کلمہ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں غیر اللہ سے سوال اور مدد طلب کرنا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال کرنا اور مدد طلب کرنا جائز نہیں۔

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اذا سألت فاسئل اللہ و اذا استعنت فاستعن باللہ۔

ترجمہ: "جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر۔ اور جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں بیان فرمایا ہے کہ اسی کی ذات امداد کا مصدر و منبع ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کلا نمد ھٰؤُلَآءِ وَھٰؤُلَآءِ مِنۡ عَطَاءِ رَبِّک۔

ترجمہ: "ہم ہر ایک کی امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے۔"

یہ معترضین تو انتہائی جاہل ہیں جن کو یہ معلوم نہیں کہ صوفیائے کرام ہی خالص موحد ہیں۔ وہ اپنے مرید کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایمان ویقین کی حلاوت سے آشنا کرتے ہیں اور اس کو شرک اور اس کی جملہ آلائشوں سے دور کر دیتے ہیں۔

المدد کے کلمہ کی وضاحت سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام احوال میں دو چیزوں پر نظر رکھے۔

(۱): اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہو کہ وہی مسبب الاسباب اور اس کائنات میں کسی چیز کی تخلیق اور اس کی امداد کرنے میں فاعل حقیقی ہے۔ بندہ کیلئے جائز نہیں کہ وہ اس کی مخلوق میں سے کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے۔ خواہ اس کا مقام ومرتبہ کتنا ہی بلند ہو نبی ہو یا ولی۔

(۲): اس کی نظر ان اسباب پر بھی ہونی چاہئے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ہر شئی کیلئے سبب بنا دیا ہے۔

مؤمن مختلف اسباب کو بروئے کار لاتا ہے لیکن ان پر کلی طور پر اعتماد نہیں کرتا اور نہ ہی مستقل طور پر ان کی تاثیر کا عقیدہ رکھتا ہے۔ کیونکہ بندہ اگر یہ عقیدہ رکھے کہ یہ اسباب بذاتِ خود موئثر ہیں تو اس کیلئے عقیدہ شرک کے مترادف ہے کیونکہ اس نے ایک **الله** کو چھوڑ کر کئی کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ اور اگر مؤمن صرف مسبب پر نظر رکھے اور اسباب سے قطع نظر کرلے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی مخالفت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کیلئے سبب مقرر فرمایا ہے۔ مؤمن کا کمال اسی میں ہے کہ وہ بیک وقت ان دونوں چیزوں پر نظر رکھے۔ یعنی مسبب سے بھی غافل نہ ہو اور نہ ہی سبب سے بے نیاز۔ اس مفہوم کو بیان کرنے کیلئے ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر بشر کا خالق ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا ایک ظاہری سبب بنا دیا ہے اور وہ زوجین کا باہمی ملاپ اور پھر رحمِ مادر میں جنین کی افزائش، پھر ایک خاص مدت کے بعد اس کی پیدائش ہوتی ہے۔

زندگی کی طرح موت بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لیکن اس نے موت کیلئے بھی ایک ظاہری سبب بنا دیا ہے اور وہ ملک الموت ہے۔

جب ہم مسبب کی طرف دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

"اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ" (زمر: ۴۲)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو۔"

اور اگر ہم کہیں کہ ملک الموت نے فلاں کی روح قبض کی ہے تو ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنایا۔ بلکہ ہم نے سبب کو مدِ نظر رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ۔ (سجدہ: ۱۱)

ترجمہ: "فرمائیے! جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے۔"

اسی طرح حقیقی رازق تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن اس نے حصولِ رزق کے بہت سے اسباب پیدا کر دیئے ہیں جیسے تجارت، زراعت، صنعت کاری وغیرہ۔ اگر ہم مسبب حقیقی کو مدِ نظر رکھیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مفہوم کی سمجھ آتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ (ذاریات: ۵۸)

ترجمہ: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی (سب کو) روزی دینے والا اور زور والا ہے۔"

اگر ہم اسباب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہیں کہ فلاں آدمی اپنا کمایا ہوا رزق کھاتا ہے تو اس کی وجہ سے ہم مشرک نہیں بن جائیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ما اکل احد طعاما قط خیرا من ان یاکل من عمل یدہ۔

ترجمہ: "کسی نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھایا۔" (بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے مسبب اور سبب کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

و انما انا قاسم و اللہ یعطی۔ (بخاری)

میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

اسی طرح منعم حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ارشاد فرمایا:

مَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللہِ۔ (نحل: ۵۳)

ترجمہ: "اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی دی ہوئی ہیں۔"

اور مسبب اور سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَ إِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللہُ عَلَیْهِ وَ أَنْعَمْتَ عَلَیْهِ۔ (احزاب: ۳۷)

ترجمہ: "اور یاد کیجئے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا۔"

معاذ اللہ! اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی عطا میں شریک ہیں۔ بلکہ آپ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر انعام کے سبب ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے دستِ اقدس پر ہی ایمان لائے۔ آپ کی وجہ سے انہیں آزادی کی دولت نصیب ہوئی۔

بعینہ کسی دوسرے سے مدد طلب کرنے کا معاملہ ہے۔ جب ہم مسبب حقیقی کی طرف دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

اذا استعنت فاستعن باللہ۔

ترجمہ: "جب کبھی تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کر۔"

اور جب ہم سبب کی طرف دیکھیں تو کہتے ہیں:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی۔ (مائدہ: ۲)

ترجمہ: "اور ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور تقوی کے کاموں میں۔"

اسی ضمن میں حدیث نبوی ﷺ ہے:

و اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے۔“

جب کوئی مؤمن اپنے بھائی کو کہے کہ یہ سامان اٹھانے میں میری مدد کرنا تو وہ اپنے اس قول کی وجہ سے مشرک نہیں بن جائے گا۔ اور نہ ہی اس کا شمار غیر اللہ سے مدد طلب کرنے والوں میں ہو گا۔ کیونکہ مؤمن کی دونوں آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کی نگاہ مسبب پر بھی ہوتی ہے اور سبب پر بھی اور جو اس پر شرک کی تہمت لگاتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

اسی طرح ہدایت کیلئے بھی یہی قاعدہ کلیہ استعمال کرتے ہوئے جب ہم مسبب کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہدایت کا حقیقی سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ارشاد فرمایا:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ۔ (قصص:۵۶)

ترجمہ: ”بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں۔“

اور جب ہم سبب کو مدِ نظر رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول مکرم ﷺ کو ارشاد فرمارہا ہے!

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ (شوریٰ:۵۲)

ترجمہ: ”بلاشبہ آپ راہنمائی کرتے ہیں صراط مستقیم کی طرف۔“

یعنی اللہ تعالیٰ جس کی ہدایت کا ارادہ فرماتا ہے تو رسول اللہ ﷺ اس کو ہدایت دینے کے سبب ہیں۔

علمائے ربانیین اور شیخ کاملین مخلوق کو ہدایت دینے اور ان کو معرفتِ الٰہی تک پہنچانے میں رسول اللہ ﷺ کے حقیقی جانشین ہیں۔ جب کوئی مرید اپنے شیخ سے ہدایت حاصل کرتا ہے تو وہ ہدایت کے اسباب میں سے ایک سبب کو اختیار کرتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور ان لوگوں کو ہدایت کا وسیلہ بنادیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ۔ (سجدہ:۲۴)

ترجمہ: ”اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا وہ راہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے جب تک وہ صابر رہے اور جب تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے۔“

مرید کا اپنے شیخ سے روحانی تعلق ہوتا ہے جس کے درمیان مادی رکاوٹیں اور مسافت حائل نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ شیخ کامل وہ ہے جس کی دوری بھی سالک کو فائدہ دے جس طرح اس کا قرب اس کیلئے فائدہ مند

ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ مرید کی ہدایت کا سبب ہے تو اگر مرید اپنے شیخ سے مدد طلب کرتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ مشرک نہیں ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ یہاں سبب کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ حقیقی طور پر ہدایت دینے والا اور امداد کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ شیخ تو صرف ایک سبب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی راہنمائی کیلئے مقرر کر دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ وہ بحر ذخار ہیں جس سے یہ اولیائے کرام فیض حاصل کرتے ہیں۔

جب ہم نے شیخ اور مرید کے درمیان روحانی تعلق کو تسلیم کر لیا تو اس تعلق پر مرتب ہونے والی مدد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیاوی امور میں بعض کو بعض کیلئے سبب بنا دیا ہے۔

ایک سلیم الفطرت شیخ کیلئے اتنی مثالیں کافی ہیں۔ اور جب بھی صوفیائے کرام کے کلام میں کوئی ایسی چیز دیکھے گا جو ظاہرًا شرع کے خلاف ہو وہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس میں تاویل کرے گا۔ کیونکہ اب اس پر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ تاویل اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ کی کلام، فقہاء و محدثین اور اصولیین کی کلام میں جائز ہے۔ اسی وجہ سے امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ہر صاحب عقل و شعور کیلئے کسی بھی ولی کے متعلق سوء ظن رکھنا حرام ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ جب تک ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچتا، ان کے اقوال وافعال میں تاویل کرے۔ اور اس تاویل سے وہی شخص پس و پیش کرتا ہے جو توفیق الہٰی سے محروم ہو۔

وحدۃ الوجود، حلول اور اتحاد

بعض مخالفین جہالت کی بنا پر صوفیاء کرام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ حلول اور اتحاد کا عقیدہ رکھتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ شجر و حجر، بحر و بر، انسان و حیوان حتیٰ کہ کائنات کے تمام اجزاء میں حلول کر گیا ہے۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق عین خالق ہے یعنی اس کائنات میں موجود ہر چیز بعینہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

بلا شک وشبہ یہ عقیدہ صریح کفر اور امت کے عقائد کے مخالف ہے۔ صوفیائے کرام جو کہ اسلام، ایمان اور احسان کے جامع ہوتے ہیں ان کے متعلق تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس درجہ گمراہی اور کفر میں مبتلا ہوں۔ ایک منصف مزاج مؤمن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بغیر کسی تحقیق کے ان پر کفر کی تہمت لگا دے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ ان کی امہات الکتب (فتوحات مکیہ، احیاء العلوم، رسالہ قشیریہ وغیرہ) میں ذکر کردہ ان کے عقائد کا مطالعہ کرے۔

شاید کہ مخالف یہ کہے کہ تمہارے اس قول کی وجہ سے صوفیائے کرام حلول واتحاد کے عقیدہ سے بری نہیں ہو سکتے بلکہ یہ تو حقیقت سے فرار اختیار کرنا ہے یا حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے صوفیائے کرام کے ساتھ والہانہ عقیدت کی بنا پر ان کا دفاع کرنا ہے۔ کیونکہ ان کو اس تہمت سے بری الذمہ قرار دینے کیلئے دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اب ہم صوفیائے کرام کے اپنے اقوال پیش کرتے ہیں جو ان کو اس تہمت سے بری الذمہ قرار دینے کیلئے کافی ہیں۔ بلکہ وہ تو خود لوگوں کو اس باطل عقیدہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کی طرف منسوب اقوال یا تو حاسدین و مخالفین کے اضافہ شدہ ہیں یا اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے مطابق ان کی تاویل ممکن ہے۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بتوں کے پجاریوں کی اتنی جرأت نہیں کہ وہ اپنے معبودانِ باطلہ کو عین ذات باری تعالیٰ قرار دیں بلکہ انہوں نے تو کہا:

"مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى" (الزمر: ۳)

ترجمہ: "ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں۔"

تو صوفیائے کرام کے بارے میں کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتحاد و حلول کا عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ یہ تو ان کے حق میں محال ہے۔ کیونکہ ہر ولی کو یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ حقیقت باری تعالیٰ باقی تمام حقائق کے برعکس اور مخلوق کی تمام معلومات سے خارج ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط ہے۔

حلول واتحاد اجناس میں ممکن ہے۔ اور ذاتِ باری تعالیٰ جنس سے پاک ہے اور پھر قدیم، حادث میں اور خالق مخلوق میں کیسے حلول کر سکتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد عرض کا جوہر میں حلول کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات عرض سے پاک ہے اور اگر جوہر کا جوہر میں حلول کرنا مراد ہو تب بھی ذاتِ باری تعالیٰ کو جوہر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ مخلوقات کا ایک دوسرے میں حلول واتحاد محال ہے کیونکہ دو شخصوں کا ایک بن جانا ممکن نہیں چونکہ ان دونوں کی ذات میں تباین موجود ہے۔ جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق اور مخلوق، صانع اور صنعت، واجب الوجود اور حادث الوجود میں تباین بھی انتہائی ضروری ہے۔

علمائے کرام اور محقق صوفیائے کرام ہمیشہ سے ہی حلول واتحاد کے عقیدہ بے بطلان کی صراحت کرتے رہے ہیں اور اس کے فاسد اور گمراہ کن ہونے پر تنبیہہ کرتے رہے ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! ذاتِ باری تعالیٰ اس چیز سے ارفع واعلیٰ ہے کہ حوادث اس میں حلول کریں یا وہ حوادث میں حلول کرے۔ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ اس میں کوئی شئ حلول کرے یا وہ کسی شئ میں حلول کرے یا وہ کسی چیز کے ساتھ متحد ہو جائے۔

آپ **باب الاسرار** میں فرماتے ہیں! عارف کیلئے، **انا اللہ** (میں اللہ ہوں) کہنا جائز نہیں۔ خواہ وہ قرب کے انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز ہو بلکہ عارف باللہ سے تو ایسے قول کو صدور ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا حقیر سا بندہ ہوں۔

آپ فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۱۶۹: میں فرماتے ہیں کہ قدیم (ذات باری تعالیٰ) کبھی حوادث یعنی مخلوقات کا محل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی وہ مخلوقات میں حلول کرتا ہے۔

آپ باب الاسرار میں فرماتے ہیں کہ جس نے حلول کا عقیدہ رکھا وہ مریض ہے اور وہ لا علاج مرض میں مبتلا ہے۔ اتحاد کا عقیدہ رکھنے والے ملحد ہیں اور حلول کا عقیدہ رکھنے والے جاہل ہیں۔

فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۵۵۷ میں اس موضوع پر طویل گفتگو کے بعد فرماتے ہیں کہ کائنات بعینہ ذاتِ باری تعالیٰ نہیں ہے اور نہ ہی حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں حلول کیا ہے۔ کیونکہ اگر بات ایسی ہوتی تو ذاتِ باری تعالیٰ کو نہ ہم قدیم کہہ سکتے ہیں اور نہ بدیہہ۔ اور باب نمبر ۳۱۴: میں فرماتے ہیں کہ اگر انسان کا انسانیت سے اور فرشتے کا ملکیت سے ترقی کرنا اور اپنے خالق کے ساتھ اتحاد صحیح ہوتا تو تمام حقائق تبدیل ہو جاتے۔ اور معبود، معبود نہ رہتا، خالق مخلوق بن جاتا اور مخلوق خالق بن جاتی۔ اور کوئی بھی کسی علم پر اعتماد نہ کرتا۔ اس لئے حقائق کا تبدیل ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

اس طرح آپ کے اشعار بھی حلول واتحاد کی نفی کرتے ہیں:

(۱) ان لوگوں کی بات چھوڑ دو جن کے عالم نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد ہو گیا۔

(۲) اتحاد محال ہے اس کا عقیدہ وہی رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے بے خبر ہے۔

(۳) اور اس کی حقیقت وشریعت سے جاہل ہے۔ اے مخاطب! تو اپنے معبود کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا۔

آپ فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۲۹۲ میں فرماتے ہیں کہ حلول واتحاد کی نفی کی سب سے بڑی عقلی دلیل یہ ہے کہ چاند پر سورج کا عکس پڑتا ہے۔ اس وجہ سے وہ روشن ہو جاتا ہے۔ چاند بذاتِ خود اس میں منتقل نہیں ہوتا۔ بلکہ چاند تو اس کی روشنی کا محل ہے۔ اسی طرح بندہ میں ذاتِ باری تعالیٰ حلول نہیں کرتی، بلکہ وہ اس کے انوار و تجلیات کا مظہر ہے۔

صاحب کتاب **نهج الارشاد** فرماتے ہیں کہ مجھے شیخ کمال الدین مراغی نے بتایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ شیخ ابو العباس مرسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو کہ شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ ہیں کی خدمت میں حاضر ہوا اور حلول واتحاد کے قائلین کے بارے میں بات کی تو آپ نے ان کی شدید مخالفت کی اور فرمایا! کیا مخلوق بعینہ خالق ہو سکتی ہے؟

اس کے علاوہ اگر صوفیائے کرام کی کتب میں بعض ایسے اشارات ملتے ہیں جو ظاہراً حلول واتحاد پر دلالت کرتے ہیں یہ یا تو مخالفین کے اضافہ شدہ ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ وہ اس عقیدہ باطلہ سے برأت کا اظہار کرتے

ہیں یا ان اشارات سے ان کا مقصد حلول واتحاد نہیں تھا۔ مگر بعض خود غرض مخالفین نے ان کی متشابہ کلام کو اس غلط مفہوم پر محمول کیا ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ علمائے محققین کو ہی صوفیائے کرام کے کلام تک رسائی حاصل ہے اور ان کے نزدیک یہ کلام عقیدۂ اہلسنت والجماعت کے مطابق ہے۔ کیونکہ وہ صوفیائے کرام کے کامل ایمان اور تقویٰ کی کیفیت سے آگاہ تھے اس لئے اگر انہیں ظاہر طور پر کوئی چیز مخالف شرع نظر آئے تو اس کی تاویل کرتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب **"الحاوی للفتاوی"** میں فرماتے ہیں! بعض محقق صوفیائے کرام کی کتب میں لفظ اتحاد آیا ہے لیکن یہ حقیقت توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جب توحید میں مبالغہ مقصود ہو تو وہ لفظ اتحاد بولتے ہیں۔ توحید، واحد اور احد کی معرفت کا نام ہے۔ بعض جاہل اس حقیقت تک رسائی نہ کر سکے اور اس کا غلط مفہوم سمجھ کر تباہ وبرباد ہو گئے۔ پھر فرماتے ہیں کہ عقیدہ اتحاد باطل اور محال شرعاً اور عقلاً مردود۔ انبیاء علیہم السلام، مشائخ کرام اور علمائے عظام کے اجماع سے مردود ہے۔ محقق صوفیاء کا یہ مذہب نہیں بلکہ بعض لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اس کا قول کیا ہے۔ اس طرح وہ نصرانیوں کے مشابہ ہو گئے ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ ان کا ناسوت، لاہوت کے ساتھ متحد ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ اکثر مشائخ کو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ باطلہ سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر ان کی کلام میں لفظ اتحاد واقع ہوا ہے تو اس سے مراد اپنی ذات کو مٹا کر اثبات توحید ہوتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی لفظ اتحاد فنائے مخالفات اور بقائے موافقات یعنی دنیاوی خواہشات کے فنا ہونے اور اخروی خواہشات کے باقی ہونے اوصاف مذمومہ کے فنا ہونے اور اوصاف حمیدہ کے باقی رہنے شک وشبہات کے فنا ہونے اور ایمان ویقین کے باقی رہنے غفلت وسستی کے فنا ہونے اور ذکر وفکر کے باقی رہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول **"سبحانی ما اعظم شانی"** (میں ہر عیب سے پاک ہوں اور میری شان بہت بلند ہے) کی تاویل یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو اپنی زبان سے بیان کیا ہے نہ کہ ان کا اپنا قول ہے۔ اسی طرح جس نے "انا الحق" کہا اس کا قول بھی اسی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ان عارفین کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حلول واتحاد کے قائل تھے۔ کیونکہ ایک عام عقلمند آدمی کے بارے میں بھی یہ گمان نہیں کیا جا سکتا وہ تو مکاشفہ مشاہدہ کی منازل پر متمکن تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ صاحب علم وعمل مجاہدہ اور حدود شریعت پر سختی سے کاربند تھے۔ ایسے لوگوں کی طرف حلول واتحاد کے عقیدہ کی نسبت کرنا خطا ہے جس طرح نصرانیوں نے اپنے غلط گمان کی وجہ سے حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت کر دی تھی۔ دینِ اسلام میں بعض جاہل صوفیاء کی وجہ سے یہ عقیدہ پیدا ہوا ہے۔ محقق صوفیاء وعارفین اس سے بری الذمہ ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ اتحاد دو معنوں کے درمیان مشترک ہے۔ ایک وہ مذموم معنیٰ جو لفظ حلول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ صریح کفر ہے۔ اور دوسرا مقام فنا پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ صوفیائے کرام کی خاص اصطلاح ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی لفظ کو صحیح معنیٰ میں استعمال کرنے سے کسی شخص کو روکا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہی یہ شرعاً ممنوع ہے کیونکہ اگر یہ شرعاً ممنوع ہوتا تو کوئی بھی اس کو استعمال نہ کرتا حالانکہ اکثر کہتے ہیں کہ میرے اور میرے ساتھی کے درمیان اتحاد ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح محدثین کا قول یہ ہے! مخرج حدیث میں اتحاد ہے۔ فقہاء کہتے ہیں! مویشیوں کی نوع میں اتحاد ہے۔ اور نحوی کہتے ہیں! عامل لفظاً یا معنیً متحد ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ محقق صوفیاء کے کلام میں اگر لفظ اتحاد استعمال ہوا ہے تو اس سے ان کی مراد فنا ہوتی ہے یعنی اپنے نفس کو مٹا کر تمام امور کو اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرنا۔ اس سے وہ مذموم معنیٰ مراد نہیں ہوتا جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت علی بن وفا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے ایک قصیدہ میں اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

یظنوا ابی حلولا و اتحادا و قلبی من سوی التوحید خالی

وہ میرے متعلق حلول واتحاد کا گمان کرتے ہیں حالانکہ میرا دل توحید کے علاوہ ہر چیز سے خالی ہے۔

اس شعر میں آپ نے حلول واتحاد سے برأت کا اظہار فرمایا ہے۔

شیخ شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت علی بن وفا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کی کلام میں جہاں بھی لفظ اتحاد آیا ہے اس کی مراد بندہ کا حق تعالیٰ کے ارادہ میں فنا ہونا ہے۔ جس طرح کہ "فلاں اور فلاں بندے کے درمیان اتحاد ہے" اس وقت کہا جاتا ہے جب ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ارادہ کے مطابق عمل کرے۔

ابن قیم اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں لکھتے ہیں کہ فنا کے درجات میں تیسرا درجہ خواص اولیائے کرام اور ائمہ مقربین کا ہے۔ اور اس سے مراد ماسوی اللہ کے ارادہ سے فنا اور اس راستہ پر چلنا ہے جو اس کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اور اپنی مراد کو محبوب کی مراد میں فنا کرنا ہے حتیٰ کہ غیر کا تصور ہی باقی نہ رہے۔ اس طرح اس کی مراد اور محبوب کی مراد متحد ہو جاتی ہے اور یہ دونوں مرادیں ایک بن جاتی ہیں۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ عقلاً اس اتحاد کے علاوہ کوئی اتحاد صحیح نہیں۔ اور اسی

طرح علم و خبر کا اتحاد بھی ممکن ہے۔ اس طرح دو مرادیں اور دو معلوم چیزیں اور دو مذکور امر ایک ہو جاتے ہیں حالانکہ ان دونوں ارادوں اور علم و خبر میں تباین ہوتا ہے۔ محبت کی غایت یہی ہے کہ محب کی مراد محبوب کی مراد کے ساتھ متحد ہو جائے اور محب کا ارادہ محبوب کی مراد میں فنا ہو جائے۔ یہ اتحاد اور فنا محبین کا خاصہ ہے۔ یہ لوگ اپنے محبوب کی عبادت میں فنا ہو کر غیر کی عبادت سے دور ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت خوف رجاء توکل اور اس سے استعانت طلب کرنے میں فنا ہو کر غیر کی محبت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اور جس کو فنا کا یہ مقام حاصل ہو جائے وہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے محبت کرتا ہے۔ اور اگر کسی سے بغض رکھتا ہے تو صرف اللہ کیلئے۔ اس کی دوستی اور دشمنی اللہ کیلئے ہوتی ہے۔ وہ اللہ کیلئے عطا کرتا ہے اور اسی کے حکم سے اپنی عطا کو روکتا ہے۔ اسی کی بارگاہ سے اپنی امیدیں وابستہ کرتا ہے اور صرف اسی سے مدد طلب کرتا ہے۔ اس کا کامل دین ظاہری و باطنی طور پر اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا ہے اور اس کے رسول ﷺ اس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں اور وہ اللہ و رسول ﷺ سے مخالفت کرنے والوں سے دوستی نہیں رکھتا۔ اگرچہ وہ اس کا قریب ترین ہو۔ اور حقیقت میں یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی خواہشات نفس کو اپنے رب کی رضا میں فنا کر دے اور اس کی بنیاد اس بات کی شہادت پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور یہ شہادت علم و معرفت عمل حال اور قصد کے اعتبار سے ہونی چاہئے۔ اور اس شہادت میں جو نفی واثبات پایا جاتا ہے اس کی حقیقت فنا اور بقا ہے یعنی غیر اللہ کو معبود بنانے کی نفی کرے اور اس وحدہ لا شریک کی معبودیت پر باقی رہے یہی فنا و بقا اس توحید کی حقیقت ہے۔ جس پر تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام متفق ہیں۔ اسی کیلئے آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور اسی کیلئے مخلوق کی تخلیق ہوئی۔ تمام شریعتیں بھی اسی پر قائم ہوئیں۔ بازار جنت بھی اسی پر قائم ہے۔ اور اسی پر خلق اور امر کی بنیاد ہے آخر میں فرماتے ہیں کہ اس مقام پر بہت سے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے لیکن معصوم وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے محفوظ رکھ لے۔ استعانت توفیق اور عصمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: اگر تو سالک فنا کے بلند مقام کیلئے کوشاں ہے تو اس کے دل میں کوئی ایسی مراد باقی نہیں رہے گی جو دینی شرعی نبوی اور قرآنی مراد کے مخالف ہو بلکہ یہ دونوں مرادیں متحد ہو جائیں گی اور وہ عین مراد الٰہی بن جائے گا۔ اور رب تعالیٰ بندے کی مراد بن جائے گا۔ اور یہی خالص محبت کی حقیقت ہے اور اسی میں اتحاد صحیح ہو سکتا ہے یعنی مراد میں متحد ہو جانا نہ کہ مرید اور ارادہ میں۔

اس کے باوجود کہ ابن تیمیہ صوفیائے کرام کا مخالف اور ان کے ساتھ سخت عداوت رکھتا ہے۔ وہ بھی ان کو اتحاد کی تہمت سے بری قرار دیتا ہے۔ اور ان کے کلام کی تاویل کرتا ہے اور اپنے فتاوی میں بیان کیا ہے کہ اہلِ معرفت میں سے کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس میں یا اس کے علاوہ کسی مخلوق میں حلول کر گیا ہے یا اس کے ساتھ متحد ہو گیا ہے۔ اگر بعض اکابر

صوفیائے کرام سے اس قسم کے قول منقول ہیں تو یہ سب جھوٹ ہیں جو اتحاد کے قائل بعض انتہاء پسندوں نے ان کی طرف منسوب کئے ہیں۔ شیطان نے انہیں گمراہ کر کے ان کو نصرانیوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ تمام مشائخ کرام، سلف صالحین اور ائمہ کرام اس بات پر متفق ہیں کہ خالق اور مخلوق جدا جدا ہیں نہ تو مخلوق میں اس کی ذات شامل ہے اور نہ ہی اس کی ذات میں مخلوق کا حصہ شامل ہے۔ قدیم اور حادث اور خالق و مخلوق میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اور یہ عقیدہ ان کی کتب میں کثیر مقامات پر موجود ہے جس کو یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں۔

وہ صوفیائے کرام کی کلام کی تاویل کرتے ہوئے اپنے مجموعہ رسائل میں فرماتے ہیں کہ کسی شاعر کے قول "میں اور میرا محبوب دونوں ایک ذات ہو گئے" کی تاویل یہ ہے کہ شاعر نے یہاں معنوی اتحاد مراد لیا ہے۔ جس طرح کہ دو محبت کرنے والے ایک جان ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک جس چیز سے محبت کرتا ہے دوسرا بھی اسی سے محبت کرتا ہے۔ جب ایک کسی سے بغض رکھتا ہے تو دوسرا بھی اس سے بغض رکھتا ہے۔ ان کا قول و فعل ایک ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک ذات کا دوسری ذات سے متحد ہونا مراد نہیں بلکہ ان کے افعال واقوال کا مشابہ ہونا مراد ہے کیونکہ جب محب محبوب کی محبت میں مستغرق ہو جاتا ہے ت وہ اپنی ذات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

جس طرح کہ کسی شاعر کا قول ہے:

غبت بک عنی   فظننت انک انی

میں تیری وجہ سے اپنی ذات سے بے خبر ہو گیا حتیٰ کہ میں یہ خیال کرنے لگا کہ تو میں ہوں۔

ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ اس اتحاد کو موافقت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ اتحاد جائز ہے۔

اس تمام بحث سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ صوفیائے کرام کے کلام میں لفظ اتحاد کا یہی صحیح معنی مراد ہوتا ہے جو عقیدہ اہلسنت والجماعت کے موافق ہے اور اس کو کسی دوسرے معنی پر محمول کرنا صحیح نہیں۔ انصاف پسند مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھے اور ان کی کلام کی ایسی تاویل کرے جو شرعی قواعد کے موافق ہو۔

مسئلۂ وحدۃ الوجود: مسئلۂ وحدۃ الوجود کے بارے میں علمائے کرام کی مختلف آراء ہیں ان میں سے بعض نے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وحدۃ الوجود کے قائلین پر کفر و گمراہی کا فتویٰ لگا دیا ہے اور ان کی کلام کے صحیح مفہوم کو نہ سمجھ سکتے۔ اور ان میں سے بعض نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے ان پر کفر و گمراہی کا فتوی نہیں لگایا بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کیلئے صوفیائے کرام و مشائخ عظام کی بارگاہ میں رجوع کیا ہے۔ کیونکہ ان عارفین نے اگرچہ اس مسئلہ پر طویل بحث فرمائی ہے۔

لیکن اس سے علمائے کرام کا اشکال زائل نہیں ہوتا۔ کیونکہ مشائخ کرام نے یہ گفتگو اپنے مریدین کیلئے فرمائی ہے نہ کہ ان لوگوں کیلئے جو اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے یہ مسئلہ وضاحت طلب ہے تاکہ اہلِ نظر کے دل مطمئن ہو جائیں۔

سید مصطفی شریف ان علماء میں سے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وجود ایک ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے ذاتِ باری تعالیٰ واجب الوجود ہے اس میں تعدد صحیح نہیں۔ اس کے برعکس موجود ہر ممکن چیز کو کہتے ہیں۔ اور اس میں حقائق کے اعتبار سے تعدد صحیح ہے۔ لیکن ہر موجود کا قیام ذات واجب الوجود کے ساتھ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موجود اور وجود دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وجود کی دو قسمیں ہیں:

(۱): وجود قدیم (۲): وجود حادث

مگر جب وجود ثانی سے موجود مراد لیا جائے یعنی مصدر بول کر مفعول کا معنی مراد ہو۔ اس وقت ہم اس کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اگر وجود ثانی سے یہ معنی مراد لیا جائے تو وہ تمام اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں جو اہلِ نظر وحدۃ الوجود کے قائلین پر کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ظاہری حس صرف موجود کا مشاہدہ کرتی ہے اور روح، وجود کا۔ اور جب روح موجود کا مشاہدہ کرتی ہے تو یہ مشاہدہ ثانوی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہاں رؤیت سے مراد مشاہدہ ہے، آنکھ سے دیکھنا نہیں کیونکہ رؤیت بصر کے خصائص میں سے ہے اور مشاہدہ بصیرت کے خصائص سے۔ اسی وجہ سے کلمۂ شہادت میں "اشہد" کا لفظ ہے نہ کہ اری (میں دیکھتا ہوں)۔ بلکہ یہ لفظ استعمال کرنا جائز نہیں۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ انصاف پسند اور غیور علماء کی یہی شان ہے کہ وہ ہر معاملہ میں احتیاط برتتے ہیں اور کسی مؤمن کی تکفیر میں جلدی نہیں کرتے۔ بلکہ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کیلئے وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں کیونکہ مسئلہ وحدۃ الوجود بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس کی مزید وضاحت کر دیں تاکہ اس طرح دین کی خدمت بھی ہو جائے اور متلاشیانِ حق کی راہنمائی بھی ہو سکے۔

مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ وجود کی دو قسمیں ہیں:

(۱): قدیم اور ازلی وجود: یہ واجب اور ضروری ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ۔ (الحج: ٦)

ترجمہ: یہ (رنگا رنگیاں اس کی دلیل ہیں) کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے۔

اس آیت کریمہ میں حق سے مراد "ثابت الوجود" ہے۔

(۲): ممکن عرضی اور جائز الوجود: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود چیز ہے۔ وحدۃ الوجود یعنی ایک ہی ہے اور وہ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک حق ہے اور دوسرا کفر۔ اس لئے وحدۃ الوجود کے قائلین کے دو گروہ ہیں۔

(۱): پہلا گروہ: یہ وحدۃ الوجود سے یہ مراد لیتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اور مخلوق متحد ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی وجود نہیں۔ ہر چیز وہی ہے اور وہی تمام اشیاء کا عین ہیں اور ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نشانی ہے جو دلالت کرتی ہے کہ وہی اس کا عین ہے یہ قول صریح کفر اور زندیقی ہے اور یہود ونصاری اور بتوں کے پجاریوں کے باطل عقائد سے بھی زیادہ گمراہ کن عقیدہ ہے۔

صوفیائے کرام نے اس باطل عقیدہ کے قائلین کی سخت مذمت کی ہے اور ان کی تکفیر کی ہے۔ اور لوگوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ عارف باللہ ابو بکر محمد بنانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! اے سالک! اس شخص کی ہمنشینی سے محتاط رہ جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز موجود نہیں۔ کیونکہ یہ صراحۃً زندیقیت ہے کیونکہ عارف جو شریعت کا پابند اور حقیقت میں راسخ قدم ہو اس قسم کے عارف باللہ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے اس قسم کی گفتگو صادر ہو۔

(۲): دوسرا گروہ: انہوں نے پہلے گروہ کے عقیدہ کو باطل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ عقیدہ "خالق عین مخلوق ہے" رکھنا صریح کفر ہے۔ اور انہوں نے وحدۃ الوجود سے یہ مراد لیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات جو کہ قدیم اور ازلی ہے اس کا وجود ایک ہے۔ بلاشک وشبہ وہ تعدد سے پاک ہے۔ انہوں نے وجود سے وجود عرضی اور حادث وجود مراد نہیں لیا۔ کیونکہ اس کا وجود مجازی ہے۔ اور اپنی اصل کے اعتبار سے عدمی ہے۔ کسی کو نفع ونقصان دینے کی قوت نہیں رکھتا۔ کائنات فی نفسہ فانی اور ہلاک ہونے والی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔ (قصص:۸۸)

ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس ذات کے۔

اس کی ایجادات اس کا مظہر ہیں۔ کائنات اسی کے حکم سے قائم اور ثابت ہے اور اسی کے اشارہ سے فنا ہوسکتی ہے۔ اس کی صفتِ قیومیت سے ہی نظام کائنات چل رہا ہے۔

پھر ان لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱): وہ لوگ جنہوں نے یہ مفہوم پہلے اعتقاد اور دلیل اور پھر ذوق و شہود سے اخذ کیا۔ پھر شہود ان پر غالب آ گیا تو بحرِ توحید میں گم ہو کر اپنی ذات سے بے خبر ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شریعت پر ثابت قدم رہے اور یہی قول حق ہے۔

(۲): وہ لوگ جنہوں نے لفظی علم گمان کیا اور اس کی عبارات میں مستغرق ہو کر اس کے ظاہری اشارات کو مضبوطی سے تھام لیا اور شہودِ حق سے غافل ہو گئے۔ بعض اوقات ان الفاظ کی حلاوت میں ایسے کھو گئے کہ اس کے مقابلہ میں شرعی احکام کو حقیر سمجھنے لگے اور ایسی گفتگو کرنے لگے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت پر عمل پیرا لوگ اہلِ غفلت ہیں اور حقیقت پر عمل پیرا اہلِ عرفان۔ لیکن ان کی یہ کلام صریح جھوٹ اور بہتان پر مبنی ہے کیونکہ شریعت اور مقامِ احسان ایک ہی چیز ہے بہر حال اس دور میں صوفیائے کرام کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ اور تعبیرات سے اجتناب کریں جن میں محض الہام، غیوض اور اشتباہ کا خدشہ ہو تا کہ لوگ ان سے بد ظن نہ ہوں یا ایسا نہ ہو کہ ان کے کلام کی ایسی تعبیر کریں جو غیر مقصود ہو کیونکہ بہت سے بے دین اور جعلی پیر اس قسم کے الفاظ و عبارات استعمال کرتے ہیں تا کہ اپنے دل میں چھپے ہوئے باطل عقائد کو ظاہر کر سکیں اور اس طرح محرمات کو حلال کر کے ان منکرات اور فواحش کو جائز قرار دے سکیں جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں۔ اس دور میں حق و باطل کے درمیان تمیز ختم ہو چکی ہے۔ جرم کا ارتکاب کوئی کرتا ہے اور اس کی سزا کسی کو ملتی ہے۔

اسی لئے صوفیائے کرام نے اپنے ظاہر و باطن پر احکامِ شریعت کو لازم کیا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے مریدین کو بھی شریعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شریعت، طریقت میں داخل ہونے کا دروازہ اور معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کی سیڑھی ہے۔ اور جس سالک نے شریعت سے ذرا بھی انحراف کیا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اور صوفیائے کرام کے شریعت پر سختی سے کاربند ہونے کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ فرمایئے حقیقت و شریعت کی بحث)۔

علمائے کرام اور مشائخ عظام کے اقوال سے قارئین کرام پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صوفیائے کرام کی طرف حلول واتحاد اور وحدۃ الوجود کی طرف جو نسبت کی جاتی ہے وہ ان سے بری الذمہ ہیں۔ اور ان کے کلام کی ایسی تاویل ہو سکتی ہے جو شرعاً جائز اور اہلسنت والجماعت کے عقیدہ کے مطابق ہو۔ مشائخ عظام اور صوفیائے کرام نے یہ مراتب و منازل کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو کر حاصل کئے ہیں اور یہی وہ سلف صالحین ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھاما اور آپ کی کامل اتباع سے رضائے الٰہی کے مستحق ہوئے اور سعادت دارین سے بہرہ مند ہوئے۔

اور انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهُ فَأُوْلٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُوْلٰئِکَ رَفِيْقًاo (النساء: ٦٩)

ترجمہ: "اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔"

حقیقی صوفیاء کرام اور جعلی پیر

کچھ خود غرض لوگوں نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر صوفیائے کرام کو بدنام کر دیا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ان میں شمار تو کرتے ہیں لیکن ان کے اقوال، افعال اور سیرت کے لحاظ سے ان کا صوفیائے عظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ اظہارِ حق کیلئے ہم حقیقی اور جعلی صوفیاء کے درمیان فرق کریں خصوصًا وہ مشائخ عظام جو ایمان تقویٰ اور ورع کی اعلیٰ منازل پر فائز تھے اور اسلام کی نشر واشاعت میں اہم کردار رہے۔ اس لئے ہمیں یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہئے کہ تصوف اور صوفیاء کے درمیان واضح فرق ہیں۔ جس طرح ایک مسلمان اپنے افعال قبیحہ کی وجہ سے دینِ اسلام کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک جعلی پیر اپنی بدکرداری کی وجہ سے تصوف کا نمائندہ نہیں بن سکتا۔

شریعت میں یہ جائز نہیں کہ ایک پڑوسی کے ظلم کی وجہ سے دوسرے پڑوسی سے مواخذہ کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ مسلمانوں کی بدکرداریوں کا الزام پاکیزہ دینِ اسلام پر لگا دیا جائے۔ اور اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ بعض جعلی پیروں کی حرکات کو نیک طینت اور پاکیزہ سیرت صوفیائے کرام کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اگر بعض علمائے کرام نے صوفیائے کرام کی طرف منسوب بعض افعال قبیحہ پر اعتراض کیا ہے تو اس سے ان کا مقصود تصوف کو بدنام کرنے والے جعلی پیر ہیں۔

مشائخ کرام نے بھی ان لوگوں سے اجتناب کرنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ شیخ احمد زروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "قواعد تصوف" میں فرماتے ہیں کہ جعلی پیر، اہلِ ھویٰ اصولیین کی طرح ہیں۔ ان کے اقوال کو رد اور ان کے افعال سے اجتناب کریں۔ لیکن اہلِ تصوف میں ان کے داخل ہونے کی وجہ سے اہلِ حق کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے برے لوگ ہر شعبہ میں موجود ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح قیامت تک جاری رہے گا جس طرح تمام علماء، فقہاء، مدرسین، قاضی، تاجر اور امراء برابر نہیں ہیں اسی طرح تمام صوفیاء بھی برابر نہیں ہیں ان میں بعض لوگ نیک اور پرہیز گار اور بعض اس سے بھی اعلیٰ درجات پر فائز ہیں اور اسی طرح ان میں بعض جعلی پیر بھی ہیں۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اسے ہر عام وخاص جانتا ہے۔ اس میں کسی شک

وشبہ کی گنجائش نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ پہلے حق کو پہچانے تا کہ اہلِ حق کو پہچان سکے۔ اور یہ مشہور کلیہ ہے کہ آدمی حق سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ حق آدمی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

علمائے کرام جن جعلی پیروں پر اعتراض کرتے ہیں، ہم بھی ان کے خلاف ہیں مگر وہ صوفیائے کرام جو کتاب وسنت پر عمل پیرا ہو کر شرعی احکام پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ ہم ان کی بات کرتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں آئندہ فصل میں علمائے سلف وخلف کی صوفیائے کرام کے بارے میں آراء ذکر کریں گے۔

تصوف کے مخالفین

وہ لوگ جو اسلامی تصوف پر تنقید کرتے ہیں اور اس پر طعن وتشنیع کے تیر برسا کر مختلف قسم کے الزامات لگاتے ہیں۔

ان کی دو قسمیں ہیں:

(ا): وہ لوگ جو اپنی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف بُغض وعناد کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔

اس قسم میں اسلام دشمن مستشرقین اور ان کے وہ ایجنٹ شامل ہیں جن کو انہوں نے اسلام پر تنقید کرنے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور حقائق اسلام مسخ کرنے اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ بندی کا زہر پھیلانے کیلئے تیار کیا ہے۔

شیخ احمد اسد نے اپنی کتاب **"الاسلام علی مفترق الطرق"** میں ان کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔

یہ لوگ نظرِ غائر سے اسلامی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں تا کہ وہ اسلام کی قوت کے راز تک رسائی حاصل کر سکیں اور یہ معلوم کر سکیں کہ کس دروازے کے ذریعہ اس میں داخل ہو سکتے ہیں اور کس راستہ پر چل کر اپنے خبیث مقاصد تک پہنچ سکتے ہیں۔ ان مستشرقین میں سے سب سے زیادہ مشہور نکلسن گولڈ زہیر اور مینسن وغیرہ ہیں۔

بعض اوقات یہ لوگ زہر کو شہد میں ملا کر دیتے ہیں یعنی پہلے اپنی بعض کتب میں اسلام کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں جب قاری ان پر اعتماد کرنے لگتا ہے اور ان پر مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ اس کے عقائد میں تشکیک پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے دل کو بے بنیاد اعتراضات سے بھر دیتے ہیں جو انہوں نے اپنے پاس سے ہی گھڑے ہوتے ہیں۔

کبھی یہ لوگ علمی مفکرین اور محققین کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور بعض اوقات دین پر غیر تمندی کا اظہار کر کے اس کے قیمتی اثاثہ پر رونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اس طرح تصوف پر طعن وتشنیع کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ تصوف اسلام کی روح اور اس کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ مسلمانوں کو اس سے بد ظن کرنے کیلئے کبھی تو یہ دعوی کرتے ہیں کہ تصوف یہودیت سے ماخوذ ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ یہ نصرانیت اور بدھ مت کی ایک شکل ہے۔ اور صوفیائے کرام کی طرف باطل عقائد اور گمراہ کن افکار کی نسبت کرتے ہیں۔ یعنی حلول واتحاد، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الادیان وغیرہ۔

ہمیں ان سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ وہ ہمارے دشمن ہیں اور یہ مکار دشمن کی چالیں ہیں۔ کیونکہ ہم ان کے خبیث مقاصد سے بخوبی آگاہ ہیں اس لئے ہمیں ان کے اقوال کی تردید کیلئے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہمیں ان لوگوں پر افسوس ہے کہ اسلام کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کے شدید دشمنوں کی آراء کو اپنا کر اسلام کی روح اور جوہر یعنی تصوف کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ کیا ایک عقلمند مسلمان کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ ایک مشرک کافر اور دشمنِ اسلام کے اقوال کو اپنے مسلمان بھائیوں پر طعن کرنے کیلئے حجت سمجھے۔

اگر یہ مستشرقین دینِ اسلام کے متعلق اپنے دفاع میں سچے اور اس سے محبت اور اس پر غیرت کا مظاہرہ کرنے میں مخلص ہیں تو پھر کیوں نہیں دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے؟ اور دینِ اسلام کو کیوں اپنی زندگی کا نصب العین نہیں بنا لیتے؟

(۲): وہ لوگ جو تصوف کی حقیقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اس گناہ میں گرفتار ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی تصوف کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ انہوں نے اس علم کو مخلص علمائے کرام اور کامل صوفیائے کرام سے حاصل نہیں کیا بلکہ ان کا علم تصوف کے بارے میں سطحی مطالعہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں:

(ا): یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصوف بعض جعلی پیروں اور مدعیانِ تصوف سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ حقیقی تصوف اور ان مسخ شدہ حقائق کے درمیان فرق نہیں کرتے جو ان جعلی پیروں سے صادر ہوتے ہیں جن کا اس کام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(ب): یہ وہ لوگ ہیں جو صوفیائے کرام کی کتب میں موجود امور سے دھوکہ کھا گئے جو کہ مخالفین کی اضافہ شدہ تھیں انہوں نے تحقیق اور حقیقی نظر و فکر کے بغیر ہی ان کو تصوف کے حقیقی اصول تسلیم کر لیا۔ یا انہوں نے بذاتِ خود کتب صوفیاء کا مطالعہ کیا اور اپنے محدود سطحی علم اور خاص قلبی رجحان کی وجہ سے ان کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکے۔ اور انہوں نے یہ تکلیف گوارا نہ کی کہ وہ صوفیائے کرام کی متشابہ کلام کی تاویل کیلئے اس واضح کلام کی طرف رجوع کرتے جو شریعت کے ذرا بھر بھی مخالف نہیں بلکہ یہ کلام اس شفاف نور کی طرح ہے جو ظلمتوں اور تاریکیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے دل میں کجی اور مرض ہوتا ہے وہ قرآن کریم کے متشابہ کلام کو لے کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق اس کی تاویل کرتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر محکم آیات کی طرف نہیں دیکھتا جو ان متشابہ آیات کی وضاحت کرتی ہیں۔

ان ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَیکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِهٰتٌ فَأَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِیْلِهِ۔ (آل عمران:۷)

ترجمہ: وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں پس وہ لوگ جن کے دل میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے۔ ان کا مقصد فتنہ انگیزی اور (غلط) معنیٰ کی تلاش ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اور مشائخِ عظام نے اپنے واضح صریح عقائد کو اپنی کتب میں درج کر دیا ہے تاکہ کسی جاہل احمق یا خود غرض پر یہ عقائد متشابہ نہ ہو جائیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ کی ابتداء میں اپنے عقیدہ کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اسی طرح صاحب رسالہ قشیریہ اور دیگر صوفیائے کرام نے بھی اپنی کتب میں ان عقائد کو ذکر کیا ہے۔

(ج): یہ وہ فریب خوردہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے علوم و ثقافت کو مستشرقین سے اخذ کیا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مزعومہ اعتراضات کے بارے میں یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کا جواب ممکن ہی نہیں ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہیں۔ اگر ان میں کچھ عقل و فہم ہوتی تو وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیتے کہ یہ مستشرقین جن سے علم حاصل کر رہے ہیں یہ اسلام دشمن ہیں اور انہوں نے اسلامی حقائق کو مسخ کرنے اور اس کے جوہر و روح یعنی تصوف میں تنقید کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔

بہر حال امت اسلامیہ میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا ان کی مخالفت کرنے والے ان کی مدد سے دست بردار ہونے والے انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ امرِ الٰہی (روز قیامت) آجائے۔ اگر جن و انس متحد ہو کر ان کے خلاف محاذ آراء ہو جائیں تب بھی گم کردہ راہوں کو ہدایت دیتے رہیں گے۔ اور اس راہ میں آنے والے مصائب پر صبر کرتے رہیں گے۔ گمراہی و جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو نورِ الٰہی سے منور و تاباں کرتے رہیں گے۔ یہ لوگ خود بھی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سنت پر سختی سے عمل پیرا رہتے ہیں اور مرورِ زمانہ کے باوجود آپ کے نور سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

تصوف کے بارے میں علمائے کرام کی آراء

اس کتاب کے آخر میں تصوف کے بارے میں بعض اکابرِ امت اور مفکرین کی آراء ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ جان لینے کے بعد کہ تصوف روح اسلام اور اس کے تین بنیادی ارکان یعنی اسلام، ایمان اور احسان میں سے ایک رکن ہے۔ ان آراء کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بعض لوگ جو نورِ بصیرت سے محروم اور حقائقِ اسلام سے ناآشنا ہیں اور جعلی پیروں کی حرکات کی وجہ سے تصوف پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کیلئے اور ہر اس شخص کیلئے جو حقیقت تصوف سے ناآشنا ہے۔ ہم ان آراء کو ذکر کر رہے ہیں

تاکہ تہذیبِ نفوس اور قلوب کو حقیقی زندگی عطا کرنے کے سلسلہ میں تصوف کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں۔ اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ پوری دنیا میں اسلام کی نشر واشاعت میں تصوف نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

(۱): امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: شریعت اور حقیقت کی بحث میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق تفصیلی کلام گزر چکا ہے آپ شریعت وطریقت دونوں کو اہمیت دیتے تھے اور آپ میدان طریقت کے شہسوار تھے جیسا کہ علامہ ابن عابدین نے اپنے مشہور حاشیہ میں ذکر کیا ہے۔

(۲): امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: "من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما فقد تحقق" (جس نے فقہ میں مہارت حاصل کی لیکن تصوف سے نابلد رہا وہ فاسق ہو گیا۔ اور جس نے تصوف میں کمال حاصل کیا لیکن فقہ سے نا آشنا رہا وہ زندیق ہو گیا۔ اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا اس نے حقیقت کو پا لیا۔)

(۳): امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: آپ فرماتے ہیں کہ میں نے صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کی ہے اور ان سے تین باتیں سیکھی ہیں۔

(۱) الوقت سيف ان لم تقطعه قطعك۔ (وقت ایک تلوار کی طرح ہے اگر تو اسے انہیں کاٹے گا تو وہ تجھے کاٹ دے گی۔)

(۲) نفسك ان لم تشغلها بالحق شغلتك بالباطل۔ (اپنے نفس کو اگر حق میں مشغول کرو گے تو یہ تمہیں باطل میں مصروف کر دے گا۔)

(۳) العلم عصمة۔ (علم انسان کو برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔)

آپ فرماتے ہیں کہ دنیا کی تین چیزیں میرے نزدیک محبوب ہیں: ترک تکلف، لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، اہلِ تصوف کے نقش قدم پر چلنا۔

(۴): امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: آپ صوفیائے کرام کی صحبت سے پہلے اپنے بیٹے کو فرمایا کرتے تھے۔ اے بیٹے! علمِ حدیث کو مضبوطی سے تھام لو اور ان لوگوں کی صحبت سے بچو جو اپنے آپ کو صوفیاء کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اکثر دینی احکام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن جب آپ نے ابو حمزہ صوفی بغدادی کی صحبت اختیار کی اور صوفیائے کرام کے احوال سے آگاہ ہوئے تو فرمانے لگے۔ اے بیٹے! ان لوگوں کی ہم نشینی کو لازم پکڑو کیونکہ یہ لوگ کثرتِ علم، مراقبہ، خشیتِ الٰہی، زہد اور بلند ہمتی کی وجہ سے ہم پر فوقیت لے گئے۔

علامہ محمد سفارینی حنبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شیخ ابراہیم بن عبد اللہ قلانسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صوفیاء کرام کے متعلق فرمایا: میرے علم میں ان سے افضل کوئی قوم نہیں۔ آپ سے عرض کی گئی کہ یہ لوگ جب محفلِ سماع میں حاضر ہوتے ہیں تو ان پر وجد کی کیفیت آ جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں خوشی کا اظہار کریں۔

(۵): امام حارث محاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امام حارث محاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ راہِ حق تک رسائی حاصل کرنے کیلئے اپنی سخت جد وجہد کے متعلق گفتگو فرماتے ہیں: حدیث میں وارد ہوا ہے کہ یہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ایک فرقہ ناجی ہے۔ اور باقی کے متعلق اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے زندگی کا ایک حصہ اختلافِ امت میں غور و فکر کرنے میں صرف کر دیا۔ اس سلسلہ میں میں واضح راستہ اور صراط مستقیم کا متلاشی رہا۔ طلبِ علم اور اس پر عمل میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ علمائے کرام کے ارشادات کے مطابق آخرت کی طرف لے جانے والے راستے کو تلاش کرتا رہا۔ اسی دوران میں نے قرآن کریم کے اکثر حصہ کو تاویلاتِ فقہاء کے ساتھ سمجھ لیا۔ اور اس کے بعد احوالِ امت میں غور و فکر کیا، اس کے مختلف مذاہب اور ان کے دلائل کو پرکھا اور اپنی عقل کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے جان لیا کہ ان کا یہ اختلاف بحرِ عمیق ہے جس میں کثیر لوگ غرق ہو گئے، بہت کم لوگ محفوظ رہ سکے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک گروہ یہ خیال کرتا ہے کہ نجات انہیں کیلئے ہے اور ان کے مخالفین کیلئے ہلاکت ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱): وہ لوگ جو احوالِ آخرت سے آگاہ ہیں ان کی تعداد انتہائی قلیل ہے ان کے ساتھ ملاقات انتہائی مشکل ہے۔

(۲): وہ لوگ جو جاہل ہیں اور ان سے دوری ہی بہتر ہے۔

(۳): وہ لوگ جو علماء کا لبادہ اوڑھے ہیں۔ امور دنیا میں مشغول ہو کر اسی پر قناعت کر بیٹھے ہیں۔

(۴): وہ لوگ جو اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں اور اپنے علم کی وجہ سے تعظیم و تکریم کے متلاشی ہیں اور دین کے بدلے دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(۵): وہ لوگ جو عالم ہونے کا دعوی کرتے ہیں لیکن علم کی حقیقت سے نا آشنا ہیں۔

(۶): وہ جو عبادت گزاروں کے مشابہ اور اعمالِ خیر میں پیش پیش ہیں لیکن نہ تو ان کے پاس غنا ہے اور نہ ہی ان کا علم سامعین کے دلوں میں اثر کرتا ہے اور نہ ہی ان کی رائے پر کوئی اعتماد کرتا ہے۔

(۷): وہ لوگ جو انتہائی زیرک اور ہوشیار ہیں لیکن تقوی و پرہیز گاری سے کوسوں دور ہیں۔

(۸): وہ لوگ جو اپنی خواہشات کے تابع ہیں دنیا کیلئے ذلیل ہوتے ہیں اور اس میں ریاست و سرداری کو طلب کرتے ہیں۔

(۹): شیطان نما انسان جو آخرت کو بھول کر دنیا پر حریص ہیں اور اس کو جمع کرنے میں مصروف ہیں اور "ھل من مزید" کے خواہش مند ہیں۔ وہ دنیا میں ظاہری طور پر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مردہ ہیں۔

میں نے اپنی ذات کو ان لوگوں میں تلاش کیا تو مجھے بڑی پریشانی لاحق ہوئی تو میں نے صراط مستقیم کی تلاش میں ہدایت یافتہ لوگوں کی راہنمائی کے حصول کا قصد کیا۔ علم کو پیش نظر رکھ کر گہری نظر و فکر کی تو مجھے کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے معلوم ہوا کہ خواہشاتِ نفس کی پیروی ہدایت سے بے بہرہ اور حق سے دور کر دیتی ہے اور انسان ہمیشہ تاریکی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اس لئے میں نے سب سے پہلے اپنے دل سے خواہشات کو ختم کرنے سے ابتداء کی۔ اور تباہ کن خواہشات ہلاکت خیز فرقوں سے بچتے ہوئے میں نے کسی فرقہ پر ناجی ہونے کا حکم نہ لگایا اور ناجی امت کا حکم لگانے میں کافی دیر متردد رہا۔ اور پھر راہِ نجات کی تلاش میں کوشاں رہا۔

پھر میں نے پایا کہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تقویٰ و پرہیز گاری کو اپنانے، ادائیگیٔ فرائض، حلال و حرام اور اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں انتہائی احتیاط، اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسول کریم ﷺ میں اخلاص پر راہِ نجات کی بنیاد ہے۔ اس لئے محدثین سے فرائض و سنن کا علم حاصل کیا۔ میں نے ان کا بعض مسائل میں اتفاق اور بعض میں اختلاف دیکھ لیکن وہ تمام اس بات پر متفق تھے کہ فرائض و سنن کا حقیقی علم ان علماء کے پاس ہے جن کو ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کے احکام کی معرفت حاصل ہے۔ اور ان فقہاء کے پاس بھی یہ علم موجود ہے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ رضائے الٰہی کا حصول ان کا مطلوب و مقصود ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء سے بچتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو احکام الٰہیہ اور انبیاء و مرسلین کی سنتوں کے امین ہیں۔

میں نے امت کے مختلف گروہوں میں ان صفات سے متصف گروہ کو تلاش کیا اور ان کے علم سے فیض یاب ہوا۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ قلیل تعداد میں ہیں اور ان کا یہ علم کم ہوتا جا رہا ہے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اسلام کا آغاز پردیس میں ہوا اور عنقریب پردیسی ہو جائے گا جس طرح اس کی ابتداء ہوئی۔ خوشخبری ہے پردیسیوں کیلئے۔[1]

مجھے یقین ہو گیا کہ یہی لوگ اسلام میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی قلت تعداد کی وجہ سے مجھے افسوس ہوا۔ مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ اختلاف امت کی وجہ سے مجھ پر جو شدید اضطرابی کیفیت طاری ہوئی اسی حالت میں پیغامِ اجل نہ آجائے۔ اس لئے میں نے ان علوم کی تحصیل میں جلدی کی جو ایک مسلمان کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ اور حصول علم میں انتہائی احتیاط سے کام

---

[1] (صحیح مسلم)

لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ان لوگوں کی صحبت حاصل ہوگئی جن میں تقویٰ وپرہیز گاری اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے ان کے ارشادات اور نصائح کو سلف صالحین کے عمل کے مطابق پایا۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ امت کو ارشاد وراہنمائی کرنے میں متفق ہیں۔ نہ تو وہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرتے ہیں اور نہ ہی رجاء کی اتنی تلقین کرتے ہیں کہ لوگ معصیت میں مبتلا ہوجائیں اور مصائب ومشکلات میں صبر کرنے اور اس کی قضا پر راضی رہنے اور اس کی نعمتوں پر شکر کرنے کی تلقین کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات ذکر کرکے اس کو بندوں کے نزدیک محبوب بناتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرنے پر ابھارتے۔ یہی وہ لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت کے معترف اور اس کی کتاب اور سنت رسول اللہ ﷺ کو جاننے والے اور دینی احکام کو سمجھنے والے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن کو ناپسند۔ یہ لوگ بدعات اور خواہشات نفس سے بچتے اور دین کے معاملہ میں غلو سے اجتناب کرتے۔ لڑائی جھگڑے کو ناپسند کرتے۔ غیبت اور ظلم کے قریب تک نہ جاتے اپنی خواہشات کی مخالفت اور اپنے نفوس کا محاسبہ کرتے۔ انہیں اپنے اعضاء پر پورا کنٹرول تھا۔ اپنے کھانے پینے، لباس اور تمام احوال میں انتہائی تقویٰ وپرہیز گاری سے کام لیتے۔ شبہات سے پہلو تہی کرتے اور خواہشات نفس کو ترک کرکے قوت لایموت پر گزارہ کرتے۔ مباح اور حلال چیزوں میں بھی بہت کم رغبت رکھتے۔ قیامت کے دن ہونے والے حساب وکتاب سے خوفزدہ رہتے اپنے حال میں ہی مگن رہتے۔ اپنے آپ کو انتہائی حقیر سمجھتے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی فکر میں مبتلا رہتا۔ یہ لوگ احوال آخرت اور روزِ جزا اللہ تعالیٰ کے عظیم ثواب اور دردناک عذاب سے باخبر تھے۔ اور یہ چیز ان کے دائمی غمگین رہنے کا سبب تھی۔ اس لئے انہوں نے دنیا کے سرور اور نعمتوں سے اعراض کیا۔ انہوں نے دین کے ایسے اوصاف اور تقویٰ وپرہیز گاری کی ایسی حدود بیان کیں جس کی وجہ سے میرا دل خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے یہ جان لیا کہ دین کے آداب اور ورع وپرہیز گاری ایسا سمندر ہے جس سے نجات میرے بس کی بات نہیں۔ اور مجھ جیسا شخص ان حدود پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جب میں نے یہ تمام اوصاف ان لوگوں میں دیکھے تو مجھ پر ان کی فضیلت ظاہر ہوئی اور ان کا خلوص دکھائی دیا تو میں نے یقین کرلیا کہ یہی لوگ راہِ آخرت کے مسافر اور انبیاء ومرسلین کی سنت کے تابع ہیں۔ یہی وہ چراغ ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ مینارہ نور ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے میں ان کے مذہب میں رغبت کرنے لگا۔ اور ان کے آداب کو تسلیم کرکے ان سے اکتساب فیض کرنے لگا۔ میں ان کی خدمت میں مشغول ہوگیا۔ میرے نزدیک دنیا کی کوئی چیز بھی ان سے عزیز نہ تھی اور نہ ہی کسی کو ان پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کی برکت کی وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ علم عطا فرمایا جس کے دلائل قوی اور دیگر علوم پر اس کی فضیلت عیاں تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جو اس کو اختیار کرکے اس پر عمل پیرا ہوگا وہ نجات پاجائے گا۔ اور جو اس کی مخالفت کرے گا وہ کج رو ہوگا۔ اور جو اس کا انکار کرے گا اس کے دل

پر سیاہی جم جائے گی۔ اور اس کو سمجھنے والا کامیاب ہو جائے گا۔ ان سب چیزوں کو جان لینے کے بعد میں نے یقین کر لیا کہ اس علم کو اپنانا اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا واجب ہے۔ اس لئے میں نے صدق دل سے اس کو قبول کر لیا اور اس کو اپنے دین کی اساس قرار دیا اور اسی پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھی۔ اس کی برکت سے میرے احوال میں تبدیلی آگئی اور میں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ وہ مجھے اس نعمت کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور جو علم مجھے عطا فرمایا ہے اس پر عمل کرنے کی قوت عطا فرمائے۔ حقیقۃً میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

(۶): شیخ عبد القاہر بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: عظیم امام حجۃ المتکلمین شیخ عبد القاہر بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں فرماتے ہیں: اس باب کی فصل اول اہلسنت والجماعت کی اقسام کے بیان میں ہے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلسنت والجماعت میں آٹھ قسم کے لوگ شامل ہیں:

(۱): وہ لوگ جو توحید و نبوت، احکام وعد و وعید ثواب و عقاب شرائط اجتہاد امامت و قیامت وغیرہ علوم کے ماہر ہیں۔

(۲): ان میں وہ ائمہ و فقہاء شامل ہیں جن کا تعلق اہلِ رائے اور حدیث سے ہے۔ یہ لوگ اصولِ دین میں اللہ تعالیٰ اور اس کی ازلی صفات کے بارے میں صفاتیہ مذہب والوں کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ قدریہ اور معتزلہ کے مخالف ہیں۔ جنت کی نعمتوں اور عذابِ جہنم کے دائمی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ خلفائے راشدین کی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں۔ سلف صالحین کیساتھ دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمعہ ہر اس امیر کے پیچھے واجب ہے جو صحیح العقیدہ ہو۔ قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہ سے احکامِ شریعت کا استنباط بھی ان کے نزدیک واجب ہے۔ یہ جماعت امام ابو حنیفہ امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اصحاب پر مشتمل ہے۔

(۳) یہ محدثین کا گروہ ہے جنہیں نبی کریم ﷺ سے مروی احادیث پر گہری درک حاصل ہے۔ یہ لوگ صحیح اور ضعیف حدیث کے درمیان امتیاز کرنے کے ماہر ہیں۔ اسی طرح جرح و تعدیل کے اسباب سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کا یہ علم باطل فرقوں کے عقائد سے پاک ہوتا ہے۔

(۴) یہ وہ لوگ ہیں جو ادب اور صرف و نحو کے ماہر شمار ہوئے ہیں۔ یہ خلیل بن احمد، ابی عمرو ابن علا اور سیبویہ جیسے مایہ ناز ائمہ کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

(۵) یہ لوگ قرآن کریم کی مختلف قرأتوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مذہب اہلسنت کے مطابق قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل بھی جانتے ہیں۔ اور اہلِ ہویٰ کی تاویلات سے گریز کرتے ہیں۔

(٦) یہ صوفیائے کرام کا وہ گروہ ہے جو دنیا کی بے ثباتی پر یقین رکھتا ہے اور اس سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اور جب انہیں آزمائش میں مبتلا کیا جائے تو اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ راضی برضارہ کر جو کچھ میسر ہو اسی پر قناعت کرتے ہیں انہیں بخوبی علم ہے کہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے اچھائی اور برائی کے متعلق سوال ہو گا۔ ذرے ذرے کا حساب دینا پڑے گا۔ اس لئے وہ یوم آخرت کیلئے تیاری کرتے ہیں۔ محدثین کے کلام کی طرح ان کا کلام عبارت واشارہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ریاء کیلئے نیکی نہیں کرتے اور نہ ہی حیاء کی وجہ سے اس کے تارک ہوتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کی بنیاد توحید پر اور تشبیہ کی نفی پر ہے۔ اپنے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا اسی پر توکل کرنا اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، جو میسر ہو اسی پر قناعت کر لینا اور اس پر اعتراض نہ کرنا ان کا مذہب ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ۔ (جمعه: ۴)

ترجمہ: ’’یہ اللہ کا فضل ہے عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔‘‘

(۷) یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی حفاظت کیلئے اسلامی سرحدوں پر ڈیرہ ڈالے ہوئے دشمنان اسلام سے برسرپیکار رہتے ہیں۔

(۸) ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان علاقوں میں آباد ہیں جن میں اہلسنت والجماعت کے طور طریقے غالب ہیں۔ نہ کہ ان علاقوں میں آباد لوگ جن میں باطل فرقوں کے عقائد غالب ہیں۔

(۷) امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امام ابو قاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے مشہور رسالہ کے مقدمہ میں صوفیائے کرام کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو اپنا مقرب بنایا ہے۔ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد ان کو اپنے تمام بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ان کے دلوں کو اپنے اسرار کا خزینہ بنادیا ہے اور تمام امت میں سے اپنے انوار و تجلیات کیلئے ان کو خاص کر لیا ہے۔ یہ مخلوق خدا کے فریادرس بھی ہیں۔ عمومی احوال میں انہیں اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بشری کدورتوں کو پاک کر کے انہیں مقامِ مشاہدہ پر فائز کر دیتا ہے۔ اور انہیں آداب عبودیت کے بجالانے کی توفیق عطا کرتا ہے اور احکام ربوبیت کے مصدر ومنبع سے انہیں روشناس کرا دیتا ہے۔ وہ فرائض وواجبات کو احسن طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل واحسان سے کائنات میں جو تصرف کا اذن ملتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود انتہائی عاجزی وانکساری سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرتے ہیں اور اپنے احوال ومقامات کی طرف توجہ نہیں کرتے کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔ مخلوق کا اس پر کوئی حکم نہیں اور نہ ہی

اس پر کسی کا کوئی حق واجب ہے۔ مخلوق کو ثواب عطا کرنا اس کا محض فضل واحسان ہے اور اس کو عذاب دینا عدل ہے اور اس کا ہر فیصلہ اٹل ہے۔

(۸): امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صوفیائے کرام کے بارگاہ الٰہی تک پہنچانے والے ان کے سلوک اور طریقے کے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ صوفیائے کرام ہی اللہ تعالیٰ کے خاص راستہ پر چلنے والے ہیں۔ ان کی سیرت اچھی ان کا طریقہ تمام طرق سے صحیح اور ان کے اخلاق تمام سے عمدہ ہوتے ہیں پھر صوفیائے کرام کے مخالفین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معترضین اس طریقہ کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جس کی پہلی شرط ماسوی اللہ سے دل کو پاک کرنا ہے اور پھر کلیۃً ذکر الٰہی میں دل کو مستغرق کرنا نماز کی تکبیر تحریمہ کے قائم مقام ہے اور جس کی انتہاء فنافی اللہ ہے۔

(۹): امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: عظیم مفسر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب **"اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین"** میں فرمایا کہ امت اسلامی کے فرقوں کے متعلق لکھنے والے اکثر لوگوں نے گروہ صوفیاء کا ذکر نہیں کیا اور یہ خطا ہے کیونکہ صوفیائے کرام کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ معرفتِ الٰہی کے حصول کا طریقہ اپنے آپ کو علائق بدنیہ سے پاک کرنا ہے اور یہ بہترین طریقہ ہے۔ اور دوسرے مقام پر آپ فرماتے ہیں! صوفیائے کرام وہ لوگ ہیں جو غور وفکر اور نفس کو علائق بدنیہ سے پاک کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ تمام تصرفات اور اعمال میں ان کا دل ذکرِ الٰہی سے خالی نہ ہو۔ اور وہ بارگاہِ الٰہی میں انتہائی باادب رہتے ہیں اور یہ لوگ تمام انسانی فرقوں میں افضل ترین ہیں۔

(۱۰): العزبن عبد السلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: سلطان العلماء عزبن عبد السلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے اپنے اصولوں کی بنیاد شریعت کے ان قواعد پر استوار کی ہے جنہیں دنیا وآخرت میں زوال نہیں۔ اور دوسرے لوگوں نے اپنے اصولوں کی بنیاد محض رسوم پر رکھی ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاتھوں واقع ہونے والی کرامات اس کی دلیل ہیں کیونکہ یہ چیزیں قربت اور رضا پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ عمل کے بغیر علم اگر بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اہلِ علم کے ہاتھ پر کرامات کا ظہور فرما دیتا اگرچہ وہ اپنے علم پر عمل پیرا نہ بھی ہوتے لیکن یہ بعید از قیاس ہے۔

(۱۱): امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے رسالہ **"المقاصد"** میں فرماتے ہیں کہ تصوف کے پانچ اصول ہیں:

(۱) ظاہراً وسرًا اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنا
(۲) اقوال وافعال سنت کی اتباع کرنا
(۳) ہر حال میں مخلوقِ خدا سے لاتعلق رہنا
(۴) قلیل وکثیر میں اللہ تعالیٰ پر راضی رہنا

(۵) تنگی وخوشحالی میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرنا

(۱۲): شیخ ابن تیمیہ: شیخ احمد بن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں صوفیائے کرام کے کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ سالکین میں سے صاحبِ استقامت جس طرح جمہور مشائخ سلف جن میں فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم، ابو سلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی اور جنید بن محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم وغیرہ متقدمین سے اور متاخرین میں سے شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ حماد، شیخ ابوالبیان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم وغیرہ شامل ہیں۔

یہ تمام مشائخ سالک کیلئے شرعی امر اور نہی سے آزاد ہونے کو جائز قرار نہیں دیتے۔ اگرچہ وہ ہوا میں اڑتا ہو یا پانی پر چلتا ہو۔ بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ تادم واپسی امر کو بجالائے اور نہی سے اجتناب کرے۔ اور یہی بات حق ہے جس پر کتاب وسنت اور سلف صالحین کا اجماع دال ہے۔

(۱۳): امام شاطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: عشیرہ محمدیہ کے مجلہ مسلم میں سید ابو تقی احمد خلیل کا مضمون "امام شاطبی صوفی سلفی" کے عنوان سے چھپا ہے آپ فرماتے ہیں امام شاطبی کی کتاب "الاعتصام" کو وہابی اپنی بعض آراء کیلئے بنیادی ماخذ شمار کرتے ہیں۔ صاحب کتاب کو اپنا امام مانتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس امام شاطبی نے اپنی کتاب میں اسلامی تصوف کے متعلق چند اہم فصلیں ذکر کی ہیں۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ تصوف دین کا اہم رکن ہے۔ یہ نئی چیز نہیں ہے کہ اسے دین میں داخل کیا گیا ہو۔ آپ نے یہاں تحقیق کا حق ادا کر کے مخالفین کی زبانوں کو بند کر دیا ہے۔ قلوب واذہان میں ان کی تحقیق نے گہرے نقوش چھوڑے۔

آپ فرماتے ہیں: اکثر جہلاء کا صوفیاء کے بارے میں یہ اعتقاد ہے کہ وہ کتاب وسنت کی اتباع میں تساہل پسندی سے کام لیتے ہیں۔ اور غیر شرعی امور کو اپنے اوپر لازم قرار دیتے ہیں لیکن یہ الزام خلاف واقع ہے اور اس قسم کے اعتقاد کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ سب سے پہلے جس چیز پر ان کے طریقہ کی بنیاد ہے وہ اتباعِ سنت اور ان چیزوں سے اجتناب کرنا ہے جو خلاف سنت ہوں حتیٰ کہ امام الصوفیاء ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے اپنے لئے تصوف کا نام اسی وجہ سے خاص کیا تھا۔ تاکہ وہ اہلِ بدعت سے ممتاز ہو جائیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمان صحابی کے لقب سے موسوم تھے کیونکہ صحبت رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہ تھی۔ پھر ان کے بعد آنے والے لوگوں کو تابعی کا لقب دیا گیا۔ ان کے بعد لوگوں کے مراتب مختلف ہو گئے۔ اور وہ خواص جو دین پر سختی سے کاربند تھے انہیں زاہد وعابد کہا جانے لگا پھر جب بدعتوں کا ظہور ہوا تو ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان میں زاہد وعابد ہیں۔ اس صورتِ حال میں اہلسنت کے وہ

خواص جو اپنے نفوس پر خصوصی توجہ رکھتے تھے اور اپنے دلوں کو غفلت سے محفوظ رکھتے تھے وہ تصوف کے اس نام کے ساتھ مشہور ہو گئے۔

(۱۴): ابن خلدون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: ابن خلدون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں: علم تصوف ان علومِ شرعیہ میں سے ہے جو ملتِ اسلامیہ میں معرضِ وجود میں آئے۔ صوفیائے کرام کا طریقہ صحابہ ؓکرام، تابعین اور بعد میں آنے والے سلف صالحین کے نزدیک حق وہدایت کا طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد عبادت کی طرف بھرپور توجہ اور ذاتِ باری تعالیٰ سے خاص تعلق دنیا کی زیب وزینت سے اعراض اور لذتِ مال وجاہ وحشمت جس کی طرف عوام الناس متوجہ ہوتے ہیں ان سے زہد اختیار کرنے اور عبادت کیلئے خلوت نشینی اختیار کرنے پر ہے۔ یہ تمام چیزیں صحابہ ؓکرام اور سلف صالحین میں عام تھیں لیکن دوسری صدی اور اس کے بعد والے دور میں لوگ دنیا کی طرف متوجہ ہو گئے تو عبادت گزار لوگوں کے ساتھ صوفیائے کرام کا لقب خاص ہو گیا۔

(۱۵): شیخ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: شیخ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب **"معید النعم و مبید النقم"** میں صوفیاء کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں: اللہ تعالیٰ انہیں طویل زندگی عطا فرمائے انہیں اور ہمیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ صوفیائے کرام کی حقیقت سے لاعلمی اور جعلی پیروں کی کثرت سے ان کے بارے میں مختلف اقوال مشہور ہیں۔ حتیٰ کہ امام جوینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ان کی حقیقت سے آگاہی ممکن نہیں۔ کیونکہ ان کو کسی ایک تعریف کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا۔ امام سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ علمِ تصوف کی تعریف کرنا ممکن ہے۔ صوفیائے کرام وہ لوگ ہیں جو دنیا سے اعراض کرتے ہیں اور اکثر اوقات عبادت میں مصروف رہتے ہیں پھر آپ نے تصوف کی مختلف تعریفات ذکر کی ہیں اور آخر میں فرمایا: حاصل کلام یہ ہے کہ صوفیائے کرام اللہ تعالیٰ کے وہ خاص بندے ہیں جن کے ذکر سے رحمت سایہ فگن ہوتی ہے اور جن کی دعا سے بارش نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے اور ان کے طفیل ہم سے بھی راضی ہو۔

(۱۶): امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "تائید الحقیقۃ" میں فرماتے ہیں: علم تصوف فی نفسہ ایک عظیم علم ہے۔ اس کا دار و مدار اتباع سنت، ترک بدعت نفس اور اس کی خواہشات سے کنارہ کشی اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی قضا پر راضی رہنے اس کی محبت کی خواہش اور ماسوی اللہ سے ناپسندیدگی پر ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں بہت سے ایسے لوگ داخل ہو گئے ہیں جن کا تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور انہوں نے تصوف میں غیر شرعی امور کو داخل کر دیا ہے۔ اور یہ بات تمام صوفیائے کرام کے بارے میں بدگمانی کا سبب بنی ہے اسی لئے اہلِ علم نے حقیقی صوفیائے کرام اور جعلی صوفیاء کے درمیان تمیز کرنے کی کچھ علامات ذکر کی ہیں تاکہ حق و باطل

کے درمیان فرق ہو سکے میں نے ان امور میں غور و فکر کیا ہے جن کی وجہ سے اہل علم صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن میں نے کوئی ایسا حقیقی صوفی نہیں دیکھا جو ان عقائد کا حامل ہو بلکہ ان امور کا ارتکاب وہ اہلِ بدعت اور غالی لوگ کرتے ہیں جو دعویٰ تو صوفیاء ہونے کا کرتے ہیں لیکن حقیقت میں صوفیاء نہیں ہوتے۔

(۱۷): علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: خاتمۃ المحققین عظیم فقیہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "مجموعہ رسائل" میں دین میں اضافہ شدہ بدعات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جن کا ارتکاب وفات اور ختم وغیرہ کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ ان امور کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جو اہلِ علم کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو صوفیاء کی طرف نسبت کرتے ہیں اس کے بعد آپ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے کہ یہاں صوفیاء سے مراد حقیقی صوفیاء نہیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ ہماری گفتگو ان مشائخِ عظام اور صوفیائے کرام کے بارے میں نہیں ہے جو ہر قسم کی گھٹیا خصلت سے مبرا ہیں۔ امام الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ بعض لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دائیں بائیں جھکنے لگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت میں خوش ہونے دو۔ معرفتِ الٰہی کے سفر نے ان لوگوں کے جگروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے تھکاوٹ نے ان کے دلوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ ان پر اضطراب کی کیفیت طاری ہے۔ اگر وہ اپنے حال کے مداوا کی خاطر کچھ آرام کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر تو بھی یہ لذت چکھ لیتا تو آہ وبکا میں ان کو معذور سمجھتا۔ علامہ کمال پاشا سے جب اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

(۱) اگر تیری حقیقت تک رسائی ہے تو وجد میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر تو مخلص ہے تو رقص (تواجد) میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۲) تو تو ایک ٹانگ پر چل رہا ہے اور جس کو اس کا مولا پکارے اس پر لازم ہے کہ وہ سر کے بل چلے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ذکر اور سماع کے وقت جو مختلف کیفیات ہم نے ذکر کی ہیں ان میں رخصت ان عارفین کیلئے ہے جو اپنے اوقات کو اچھے اعمال میں صرف کرتے ہیں۔ افعالِ قبیحہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر وہ کچھ سنتے ہیں تو اسی ذات سے۔ اور اگر وہ کسی کے مشتاق ہوتے ہیں تو وہ بھی اسی کیلئے۔ جب وہ اس کا شکر کرتے ہیں تو اس کی نعمتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ جب وہ اس کو پا لیتے ہیں تو نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہیں۔ جب اس کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پر سکون ہو جاتے ہیں۔ جب اس کے قرب سے سرفراز ہوتے ہیں تو بارگاہِ قدس میں خوب سیر کرے ہیں۔ جب ان پر وجد غالب آ جاتا ہے اور اس کی ارادت کا جام طہور نوش کر لیتے ہیں تو بعض سالکین پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے تو وہیں سجدے میں گر کر اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں

اور بعض پر لطف و کرم کے بادل برستے ہیں تو وہ جھومنے لگتے ہیں اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض وہ خوش نصیب ہوتے ہیں کہ مطلع قرب سے محبوب ان کیلئے جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ جلوۂ محبوب میں مست ہو کر بے خود ہو جاتے ہیں۔

آپ مزید فرماتے ہیں کہ عارفین کا سماع حقائق ربانیہ کے حصول کا سبب ہے اور یہ سماع ذاتِ باری تعالیٰ کی حمد و ثنا نعت رسول مقبول ﷺ اور حکیمانہ مواعظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہمارا اعتراض ان لوگوں پر نہیں ہے جو ان عارفین کی اقتدا کرتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے کچھ فیض حاصل کر لیتے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت اور شوق میں مگن رہتے ہیں بلکہ ہمارا اعتراض تو ان فاسق و فاجر عام لوگوں پر ہے جو صوفیائے کرام کو بدنام کرتے ہیں۔

(۱۸): شیخ محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ: مجلہ مسلم نے شیخ محمد عبدہ کی تصوف کے متعلق رائے ذکر کی ہے اور شیخ علی محفوظ نے اپنی کتاب "ابداع" میں اس کو نقل کیا ہے کہ شیخ محمد عبدہ فرماتے ہیں۔ تاریخ اسلام اور اسلام میں ظاہر ہونے والی وہ رسوم و بدعات جنہوں نے اسلام کے حقیقی حسن کو مسخ کر دیا ہے اور مسلمانوں کے جہالت میں گرفتار ہونے کے اسباب کے متعلق تحقیق کرنے والے بعض محققین غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق تصوف بھی ان اسباب میں شامل ہے جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے دین سے بے بہرہ اور اس توحید خالص سے دور کر دیا ہے جو اخروی عذاب سے نجات کی بنیاد ہے اور اسی پر اعمال کے صحیح ہونے کا دار و مدار ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم اجمالی طور پر تصوف کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

تصوف کا ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں ہوا اس وقت اس کو ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی اور اس کا بنیادی مقصد تعمیرِ اخلاق اور نفوس کو تہذیب و شائستگی سے آراستہ کر کے احکام دین پر عمل پیرا ہونے کیلئے نفوس کی تربیت اور ان کو دین کی طرف مائل کرنا اور تدریجاً دین کے اسرار و رموز سے اس کو آگاہ کرنا تھا۔ فقہاء اور علمائے ظاہر صوفیاء پر اعتراض کرتے تھے۔ ان پر بے دینی کی تہمت لگاتے تھے۔ اس وقت فقہاء کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ امراء اور سلاطین اسلامی احکام نافذ کرنے میں ان کے دست نگر تھے۔ اس صورت حال میں صوفیاء اپنے طرز عمل کو مخفی رکھنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اپنا مقصد سمجھانے کیلئے بعض اشارات رموز اور اصطلاحات وضع کر لئے اور صرف اسی کو اپنے ساتھ ملاتے جو ان کی کڑی شرائط اور آزمائش پر پورا اترتا ہو۔ اور یہ کہا کرتے کہ جو ہمارے ساتھ چلنے کا خواہشمند ہے پہلے طالب پھر مرید اور پھر سالک ہے۔ اور سلوک کے بعد یا تو وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا یا راستہ سے بھٹک جائے گا وہ طویل عرصہ تک طالب کے اخلاق و اطوار کا امتحان لیتے تاکہ وہ جان لیں کہ طالب صحیح الارادہ اور پختہ عزم ہے۔ صرف ان کے اسرار پر آگاہی حاصل کرنے کیلئے نہیں آیا۔ اس چیز کا یقین ہونے کے بعد تدریجاً اس کی تربیت کرنا شروع کر دیتے تھے۔

(۱۹): الامیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب **"حاضر العالم الاسلامی"** میں **"افریقہ میں اسلام کی ترقی اور اس کے اسباب"** کے تحت لکھتے ہیں کہ اٹھارھویں انیسویں صدی میں سلسلہ قادریہ اور شاذلیہ کے پیروکاروں میں ترقی کی نئی تحریک پیدا ہوئی۔ اور سلسلہ تیجانیہ اور سنوسیہ کا آغاز ہوا۔

سلسلہ قادریہ کے پیروکار مغربی افریقہ میں دینِ اسلام کے انتہائی پرجوش مبلغ تھے۔ انہوں نے سینیگال سے بنین تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے ان علاقوں میں تعلیم و تجارت کے ذریعہ دین کی نشرواشاعت کی۔ مغربی افریقہ کے اکثر تاجر سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض مریدین جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے مدارس کھول لیتے اور یہ مدارس صرف سلسلہ قادریہ کی خانقاہوں میں ہی نہ قائم کرتے بلکہ قریہ قریہ میں مدارس قائم کرتے۔ اور دورانِ تعلیم افریقی بچوں کو دین کی تبلیغ کرتے اور پھر محنتی اور ذہین طلبہ کو خانقاہ کے خرچ پر طرابلس، قیروان کے مدارس فاس کی جامع القرویین اور مصر کی جامع الازہر میں اعلی تعلیم کیلئے بھیجتے۔ یہ طلبہ وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سوڈان میں عیسائیوں کے مشنری مبلغین سے مقابلہ کرتے۔

آپ سلسلہ قادریہ کے شیخ طریقت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایران کے شہر جیلان میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک عظیم صوفی تھے۔ آپ کے مریدین کی تعداد شمار سے باہر ہے حتیٰ کہ آپ کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے اسپین تک پہنچ گئے۔ جب غرناطہ میں عربوں کی سلطنت کا زوال آیا تو سلسلہ قادریہ کا مرکز وہاں سے فاس منتقل ہو گیا۔ اس سلسلہ کی برکت کی وجہ سے اہلِ بربر کی کثیر بدعات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ اہلسنت والجماعت سے وابستہ ہو گئے۔ اسی طرح پندرہوں صدی عیسوی میں مغربی افریقہ کے بہت سے حبشی اس سلسلہ کی برکت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

سلسلہ سنوسیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ سلسلہ سنوسیہ کے متعلقین افریقہ کے مختلف علاقوں میں اسلام کی شمع کو روشن کرتے ہوئے نائیجیریا تک پہنچ گئے اور وہاں کے قبائل کو اسلام کی دعوت دی اور اسی سلسلہ کی برکت سے بحیرہ چاؤ کے اردگرد کے علاقے وسط افریقہ میں عالم اسلام کا مرکز بن گئے۔ ان علاقوں میں سلسلہ سنوسیہ کے مریدین کی تعداد چار ملین کے لگ بھگ ہے۔ ان کا طریقۂ تبلیغ یہ ہے کہ سوڈان سے چھوٹی عمر کے غلاموں کو خریدتے ہیں پھر جغبوب اور غزامس وغیرہ کے علاقہ جات میں تربیت کرتے ہیں۔ جب یہ بلوغ کی حد تک پہنچ کر اپنی تعلیم کو مکمل کرتے ہیں تو انہیں آزاد کرکے سوڈان کے قرب وجوار میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی قوم کے باقی لوگوں کی دینِ اسلام کی طرف راہنمائی کریں۔ اس طرح سلسلۂ سنوسیہ کے سینکڑوں مبلغین براعظم افریقہ کے مختلف ممالک میں اسلام کی نشرواشاعت کیلئے کوچ کرتے ہیں۔ شیخ محمد مہدی اور ان کے بھائی شیخ شریف اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چل کر اسی مقصد کیلئے کوشاں ہیں یعنی براعظم افریقہ میں اسلام کو بیرونی اثرات

سے آزاد کر کے خلافت راشدہ کے نظام کو قائم کرنا۔ المختصر یہ کہ ان سلاسل کے مریدین نے بر اعظم افریقہ میں اسلام کی نشر واشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آپ سلسلہ سنوسیہ کے متعلق مزید فرماتے ہیں: سلسلہ سنوسیہ کے مبلغین انتہائی جوشیلے اور غیور ہیں۔ یہ صحرائی خانقاہوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں دینِ اسلام کی نشر واشاعت کیلئے ان تمام علاقوں میں نکلتے ہیں جن کے باشندے بت پرست ہیں۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک ان مسلمان مبلغین نے مغربی افریقہ اور وسطی افریقہ میں اسلام کی نشر واشاعت کیلئے حیران کن کامیابیاں حاصل کی ہیں حتیٰ کہ بہت سے یورپی مفکرین نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ بیس سال پہلے اسی سلسلہ میں ایک انگریز نے کہا تھا کہ وسط افریقہ میں اسلام کو بہت کامیابی ہورہی ہے اور بت پرستی کا نام ونشان اس طرح مٹتا جارہا ہے جس طرح سورج کی کرنوں کے سامنے رات کی تاریکی چھپ جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں عیسائی مشنری ناکام ہوگئی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ سلسلہ شاذلیہ شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب ہے۔ ان کی بیعت عبد اللہ بن سلام بن مشیش سے تھی اور ان کے مرشد ومربی ابومدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے جو ۱۱۲۷ء کو شبیلیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم فاس میں حاصل کی اور پھر حج کا ارادہ کر کے نکلے اور حج بیت اللہ کے بعد جابیہ کے مقام پر اقامت پذیر ہوگئے اور درس تصوف دیتے رہے۔ بہت سی مخلوقِ خدا آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئی اور یہ سلسلہ ان سلاسل میں سے تھا جو پہلے پہل سرزمینِ مغرب میں داخل ہوئے اور اس کا مرکز مراکش میں تھا اور اسی سلسلہ کے مشائخ میں سے شیخ عربی درقاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ المتوفی:۱۸۲۳ء تھے۔ جنہوں نے اپنے مریدوں میں نئے سرے سے دینی حمیت کی روح پھونک دی۔ فرانسیسی فوج کو روکنے میں ان لوگوں نے اہم کردار ادا کیا۔

امیر شکیب ارسلان اپنے اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں کہ براعظم افریقہ میں اسلام کی اس ترقی کا سہرا تصوف اور اولیائے کرام سے اعتقاد پر ہے۔

(۲۰): شیخ رشید رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: شیخ رشید رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ بلاشرکت غیر ارکانِ دین میں سے ایک اہم رکن کی تعلیم وتربیت ان کے ذمہ ہے اور وہ علم واخلاق حسنہ اپنانے کے ذریعہ نفس کو مہذب بنانا ہے۔ پھر جب ملتِ اسلامیہ میں علوم کی تدوین ہوئی تو مشائخ کرام نے بھی تہذیب اخلاق او محاسبۂ نفس کے بارے میں کتب تالیف فرمائیں۔

(۲۱): شیخ راغب الطباخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: عظیم مؤرخ شیخ محمد راغب اپنی کتاب "ثقافت اسلامیہ" میں فرماتے ہیں کہ جب تصوف تزکیۂ نفوس اور تصفیہ اخلاق سے عبارت ہے تو یہ بہترین طریقہ اور اعلیٰ ترین مقصد ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بھی مقصد تھا۔

رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

ترجمہ: "میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔"[1]

آپ فرماتے ہیں! جب ہم پہلے دور کے صوفیائے کرام کی سیرتوں میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیرت مکارمِ اخلاق، زہد، ورع وعبادت پر مشتمل اور قرآن وسنت کی عملی تصویر ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"مذھبنا ھذا مقید باصول الکتاب والسنۃ"۔

ترجمہ: ہمارا یہ مذہب کتاب وسنت کے اصولوں کے ساتھ مقید ہے۔

علامہ زبیری حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں:

"الطرق کلھا مسدودعلی الخلق الا علی من اقتدی اثر الرسول"۔

یعنی "مخلوقِ خدا پر تمام راستے بند ہیں سوائے اس شخص کیلئے جس نے جنابِ رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔"[2]

رسالہ قشیریہ میں آپ فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن پاک حفظ نہ کیا اور حدیث پاک نہ روایت کی۔ وہ علم تصوف میں اقتداء کے قابل نہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ علم حدیثِ رسول اللہ ﷺ سے مؤید ہے۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: علم تصوف تین چیزوں کا نام ہے:

(۱): صاحبِ تصوف وہ ہے جس کی معرفت کا نور اس کے تقویٰ وپرہیزگاری کے نور کو نہ بجھائے۔

(۲): ایسے باطنی علم کے متعلق گفتگو نہ کرے جو ظاہر کتاب اللہ کے منافی ہو۔

(۳): کرامات اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کی بے ادبی کا سبب نہ ہوں۔

---

1 (مسند امام احمد)

2 (شرح احیاء العلوم، جلد ۱، ص ۱۷۴)

صاحبِ **شذرات الذهب** نے **ج:۵:ص:۲۷۹:** میں شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہر وہ علم جس میں خواطر قلب تیری طرف سبقت لے جائیں نفس اس کی طرف مائل اور اس سے لذت محسوس کرے اسے ترک کر دو۔ اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

کتاب **التعرف** اور **رسالہ قشیریہ** میں ان کے علاوہ بھی دیگر مشائخ کرام کے اقوال موجود ہیں:

یہ مشائخ عظام خود بھی تہذیب نفس، ورع وزہد اور عبادات کے ساتھ متصف تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دور میں مختلف اہم دینی فرائض بھی سر انجام دیتے رہے۔ انہوں نے مخلوقِ خدا کی راہِ خدا کی طرف راہنمائی کی اور دعوت دی۔ اور لوگوں کو دنیا پر مرمٹنے اور جہنم کا ایندھن اکٹھا کرنے سے منع کیا اور ان کو ان شہوات ولذات سے روکا جو ارتکاب محرمات میں منہمک رہنے اور ان واجبات کی ادائیگی سے غفلت کا سبب بنتی ہیں جن کیلئے انسان کی تخلیق ہوئی۔ اگر انسان ان شہوات پر کنٹرول نہ کرے تو اس کا نتیجہ لا قانونیت فساد کثرتِ زنا اور قتل وغارت کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ مشائخ عظام اپنے وعظ وارشاد اور نورانی قلوب سے پھوٹنے والی حکمتوں اور حقائق کی وجہ سے مخلوقِ خدا کے اخلاق کے محافظ تھے۔ انہوں نے امت کو صراط مستقیم کی راہ دکھائی اور انہیں حقیقی سعادت کی طرف دعوت دی۔ یعنی انسان کو چاہیئے کہ وہ ان تمام امور کو بجالائے جن کا اسے حکم ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کو نظر انداز نہ کرے۔ اس طرح یہ مشائخ عظام اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر ہمیشہ سے عمل پیرا رہے:

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئک هم المفلحون (آل عمران:۱۰۴)

ترجمہ: ”ضرور ہونی چاہیئے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب وکامران ہیں۔

یہ سلف صالحین ملت کے نگہبان، امت کے سردار اور اس کی ہدایت کیلئے مینارہ نور تھے۔ انہی مشائخ عظام اور دیگر محدثین وفقہاء کی بدولت امت صراط مستقیم پر گامزن ہوئی۔ ان کے دنیاوی حالات مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اخروی امور بھی بہتر ہو گئے اس طرح وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوئے۔

ان صوفیائے کرام کے حالات زندگی میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر مشائخ کے مریدین ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ جب بھی کوئی نیا شخص ان کے سلسلہ میں داخل ہوتا تو وہ سابقہ مریدین کے ساتھ اس کا بھائی چارہ قائم کر دیتے۔ اس طرح مریدین کے درمیان الفت ومحبت کی فضا قائم ہو جاتی۔ وہ باہم ہمدردی سے پیش آتے اور نیکی کی نصیحت

کرتے۔ غنی فقیر پر رحم کرتا۔ بڑا چھوٹے سے شفقت سے پیش آتا۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے بھائی بھائی اور ایک جسم کی مانند بن گئے۔ یہ لوگ اپنے مشائخ کرام کا انتہائی ادب واحترام اور خدمت کرتے۔ جب مشائخ عظام مجلس میں تشریف لاتے تو مریدین احترام کیلئے کھڑے ہو جاتے اور جب وہ تشریف فرما ہو جاتے تو یہ مریدین حضرات بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ان کے حکم کی بجا آوری کرتے اور ان کے اشارہ ابرو کے منتظر رہتے۔

صوفیاء عظام کا ملت اسلامیہ کیلئے عظیم اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ جب امیر سلطنت جہاد کا قصد کرتا ہے تو یہ اپنے مریدین کو جہاد پر برانگیختہ کرتے تو مریدین اپنے مشائخ سے قلبی اعتقاد کی وجہ سے مجاہدین میں شریک ہو جاتے اور اکثر اوقات بذات خود بھی لشکر اسلام میں شامل ہو کر حدود اسلام کا دفاع کرتے اور دوسروں کو بھی ثابت قدمی کی تلقین کرتے اور یہ چیز دشمن پر فتح ونصرت کا سبب بنتی۔

علمِ تاریخ کے مطالعہ سے اس قسم کے کثیر واقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ بہت سے محدثین اور علماء کرام بھی میدان جہاد میں پیش پیش رہے۔

صوفیائے کرام کی یہ خصوصیت ہے کہ جب ان کے متبعین کے درمیان دنیاوی امور میں اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ صادر فرماتا ہے تو اس طرح وہ راضی خوشی اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور انہیں عدالتوں میں مقدمہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ شیخ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تمام امور کا ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرید دوسرے کو کہتا ہے کہ اگر تم نے میرے ساتھ انصاف نہ کیا تو میں شیخ کے پاس تمہاری شکایت کر دوں گا۔ تو وہ اس خوف کی وجہ سے اپنی مذموم حرکت سے باز آ جاتا ہے کیونکہ اسے یہ خواہش ہوتی ہے کہ شیخ کے پاس اس کی شہرت خراب نہ ہو۔

(۲۲): علامہ احمد شرباصی: شیخ احمد شرباصی جو معروف اسلامی رائٹر اور جامعہ ازہر کے استاد ہیں وہ مجلہ اصلاح اجتماعی میں "الاخلاق عند الصوفیاء" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں! میرا یہ عقیدہ ہے کہ تصوف کی مکمل حقیقت اور بنیاد اس مرتبہ احسان پر ہے جس کو رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے حدیث جبریل میں ارشاد فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے کثیر مدعیان اس تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ اس لئے وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔

حقیقت میں تصوف کی بنیاد ذوق پر ہے۔ کریمانہ اخلاق ذوق سلیم کا ہی دوسرا نام ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان حیوان سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اخلاق کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اخلاق کو تصوف کی اساس وبنیاد قرار دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر تصوف کی جگہ لفظ اخلاق کو استعمال کیا جائے تب بھی مقصود میں فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ تصوف کا دارومدار مجاہدۂ نفس، تطہیر نفس اور اس کو ہر جمال وکمال سے آراستہ کرنے پر ہے۔ اور یہی مکارم اخلاق کی اصل ہے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک اخلاق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے فتوت اور شجاعت کو تصوف کی اصل قرار دیا ہے حتی کہ تاریخ فتوت میں فتوت صوفیاء کے نام سے مستقل عنوان ملتا ہے۔ ایثار اور دوسروں کو اپنی ذات پر مقدم کرنے کا اصول اسی سے لیا گیا ہے امام قشیری نے فرمایا کہ فتوت کی اصل یہ ہے کہ بندہ ہمیشہ غیر کی خدمت کو ترجیح دے اور حضرت ابن ابی بکر ہوازی نے فرمایا کہ فتوت کی اصل یہ ہے کہ تو اپنے ذات کو بہتر خیال نہ کرے۔

اسی وجہ سے صوفیائے کرام ان سنہری اصولوں پر گامزن ہیں کہ نہ ہی وہ کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور نہ شکوہ کرتے ہیں۔ جود وسخا ان کا شیوہ ہے۔ مصائب وتکالیف کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔ دشمنوں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیشہ بلندی کے طالب ہوتے ہیں۔

وہ اس حدیث "طوبی لمن شغلہ عیبہ عن عیوب الناس" (خوشخبری ہے اس شخص کیلئے جس کے عیب نے اس کو لوگوں کے عیوب سے غافل کر دیا)۔ کو اصل بنا کر اخلاق محمدی کو اپناتے ہیں۔ اسی وجہ سے ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: تیرا اپنے باطنی عیوب کی طرف متوجہ ہونا ان عیوب کی طرف متوجہ ہونے سے بہتر ہے جو تجھ سے چھپا دیئے گئے ہیں۔

صوفیائے کرام حرص وطمع ختم کرنے کیلئے مختلف اسباب ووسائل کو بروئے کار لاتے ہیں تاکہ انسانی شخصیت میں روحانی منازل طے کرنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضرت ابو بکر وراق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ اگر طمع سے کہا جائے کہ تیرا باپ کون ہے تو وہ جواب دے گا کہ قضاوقدر میں شک۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ تیرا پیشہ کیا ہے؟ وہ جواب دے گا: حصولِ ذلت۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ تیرا مقصد کیا ہے؟ وہ جواب دے گا: محرومی۔ اسی سلسلہ میں ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ذلت کا درخت طمع کے بیج سے پروان چڑھتا ہے۔

جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصرہ تشریف لائے اور جامع مسجد تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں کچھ قصہ گو لوگوں کو قصے سنا رہے ہیں۔ آپ نے انہیں منع کر دیا حتی کہ آپ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس پہنچے جو صوفیائے کرام کے پیش رو ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے نوجوان، میں تجھ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے صحیح

جواب دے دیا تو تمہیں یہاں وعظ کی اجازت مل جائے گی۔ ورنہ دوسرے ساتھیوں کی طرح تمہیں بھی کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عرض کی آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ آپ نے فرمایا کہ دین کا دار و مدار کس چیز پر ہے؟ جواب دیا ورع و پرہیز گاری پر۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ دین کا فساد کس چیز پر ہے؟ جواب دیا کہ طمع پر۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا بیٹھو۔ تم جیسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کریں۔

ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دل میں کسی چیز کا طمع و حرص پیدا ہوا تو ہاتف غیبی نے ندا دی کہ تیرا دین تب محفوظ و سلامت رہے گا کہ جب تو دنیاوی چیزوں کی لالچ کو چھوڑ دے گا۔

صاحبِ طمع کبھی بھی سیر نہیں ہوتا۔ اگر آپ لفظ طمع کے حروف میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے تمام حروف مجوف یعنی نکتوں سے خالی ہیں۔ صوفیائے کرام نے اپنے متبعین کو قناعت اور استغفار کا درس دیا اور ان کیلئے خودی اور عزت نفس کا دروازہ کھولا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بدکاری اور بدکاروں کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ اور ظلم و سرکشی کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ ہی جاہ و مرتبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دین کی خاطر قربانی اور دعوت جہاد دینا صوفیاء کی اقدار میں سے ہے۔ اسی طرح صبر کا درس اور اس میں مبالغہ انہی اخلاقیات کا حصہ ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے ایک صوفی دوست کی عیادت کیلئے گئے۔ مرض کی شدت سے ان کے منہ سے آہ نکل گئی۔ تو آپ نے اسے فرمایا کہ جو محبوب کی ضرب پر صبر نہ کرے وہ سچا عاشق نہیں ہے۔ اس مریض نے جواب دیا بلکہ جو محبوب کی چوٹ پر لذت محسوس نہ کرے وہ سچا عاشق نہیں۔

مراقبہ کی حالت میں زندگی گزارنا بھی صوفیائے کرام کے اخلاق کا حصہ ہے۔ اس مراقبہ کی وجہ سے بندے کا اپنے رب سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ اور اس کا قرب و جوار حاصل ہوتا ہے۔ ان کی اخلاقی تربیت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے متعلقین کو نرم مزاجی اور باہمی تعاون کا درس دیتے ہیں تاکہ ان کے درمیان تکلف ختم ہو جائے۔ کیونکہ جب ایک سالک کا دوسرے کے ساتھ دین، اخلاق اور تصوف کے اعتبار سے مضبوط تعلق استوار ہو جاتا ہے پھر وہاں کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مریدین کی توجہ اس طرف بھی مبذول کراتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی عبادت سے دھوکہ نہ کھا جائیں نہ ہی اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے مایوس ہو جائیں۔

ثابت قدمی، وقار و سنجیدگی اور اسباب ذلت سے بچنے کا درس دینا بھی صوفیائِ کرام کے اخلاقی نظام کا حصہ ہے۔

شیخ احمد شرباصی "نور الحقیق" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ تصوف وہ عظیم دستور ہے جس کو دور حاضر کے اہلِ تصوف نے ضائع کر دیا۔ اس کے مخالفین اور دشمنوں نے اس پر ظلم کیا اور مدعیانِ تصوف نے اس کے جمال اور خوبصورتی کو ضائع کر دیا

اور کچھ عرصہ سے بعض لوگوں کے نزدیک تصوف انتہائی مذموم اور ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا ہے۔ حالانکہ اس کا جمال و خوبصورتی اور صوفیائے کرام کی عظمت کا انکار ممکن نہیں۔ دوسری طرف ان کے اقوال و اعمال کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ گویا کہ تصوف کی حالت اس قیمتی موتی کی طرح ہے جس کو سیاہ چیتھڑوں میں لپیٹ دیا گیا ہو۔ جس کی وجہ سے کچھ جاہل اس موتی کو سیاہ گمان کرنے لگے ہیں۔ اگر انہیں اس کی حقیقت تک رسائی ہو جائے اور اس کے گرد لپیٹے ہوئے تمام پردوں کو اٹھا دیا جاتا تو اس کی چکاچوند روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ مجھے تصوف کے اس صاف شفاف چشمے پر افسوس ہے جس کو گردش دوراں نے گدلا کر دیا ہے۔ اس دور میں وہ علماء اور صوفیاء جو حیران و پریشان دنیادار لوگوں کو بتائیں کہ تصوف اسلام کا ایک اہم جز اور رسول اللہ ﷺ کی بنیادی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور انہیں اس بات سے آگاہ کریں کہ تصوف پر انتہائی ظلم و ستم کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں ملا دی گئی ہیں جن کا تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مدعیانِ تصوف نے بعض اہم چیزوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس میں تحریف کر دی ہے۔ اور بعض جلد باز اس کا تمسخر اڑاتے ہیں جو نہ تو اس کی حقیقت سے آشنا ہیں اور نہ ہی اس کے مشرب سے بہرہ ور۔ مزید برآں یہ کہ انہوں نے تصوف کی کسی کتاب کا مطالعہ تک نہیں کیا۔ ان تمام مذکورہ عوامل کی وجہ سے تصوف کی اہمیت و قدر کم ہو گئی۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ آج کے دور میں کوئی کامل شخصیت نظر نہیں آتی جو لوگوں کو حقیقتِ تصوف سے آگاہ کرے۔ تحقیق اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حق کو جب اس کے قبول کرنے والے نہ ملیں تو وہ مخفی و پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بھیجتا ہے جو اس کی اشاعت اور ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور لوگوں کو اس پر طوعاً و کرھاً برانگیختہ کرتے ہیں۔ تو پھر وہی حق اپنی پوری شان و شوکت سے آشکار ہو جاتا ہے۔

تمہارا اس وسیع ترین اور عجیب خزانے کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں بے حد و حساب مال و دولت اور جسمانی امراض کی منافی دواؤں کے ساتھ ساتھ نفسانی علاج کا روحانی طریقہ کار اور کبھی نہ ماند پڑنے والا دل کا نور ہو۔ اگر تمہیں کوئی شخص اس قسم کے خزانے کے بارے میں بتائے اور اس تک پہنچنے والے راستے تک مکمل معلومات بہم پہنچائے تو کیا تم اس خزانے تک پہنچنے کیلئے اپنی مکمل کوشش صرف نہیں کرو گے۔ جس میں تمہیں دنیا و آخرت کی ہر نعمت ملے گی۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ کہ یہ مخفی دوا، پوشیدہ خزانہ اور سراسر علمی اسرار و رموز پر مبنی ہے۔ یہ وہ دوا ہے کہ جس کی تجھے تیرے علم و فہم اور اخلاق کو ضرورت ہے۔ لیکن تو نہ تو اس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جب تک تو اپنے مکمل ہوش و حواس کے ساتھ اپنی بصیرت اور بصارت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کیلئے تجھے اپنا مال جان اور وقت نکالنا پڑے گا۔ اور ان عوامل کی وجہ سے تو اس تک رسائی حاصل کر سکے گا۔ کیا تو نے ان میں سے کسی چیز پر عمل کیا ہے اور حقیقی نعمتوں تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا ہے۔

مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تیرا تعلق صوفیاء سے ہے یا نہیں۔ اور نہ ہی مجھے اس چیز کی پرواہ ہے کہ تو صوفیائے کرام کے مخالفین میں سے ہے یا ان کے دوستوں میں سے۔ میرے نزدیک سب سے اہم بات کہ تو حقیقت حال سے آگاہ ہو اور اس عظیم مقصد سے آشنا ہو کہ جس سے آگاہی حاصل کرنے کا مطالبہ دین بھی کرتا ہے اور عقل بھی۔ اس لئے تجھ پر لازم ہے کہ تو تصوف کا مطالعہ کرے تا کہ تو اس کی حقیقت سے آشنا ہو سکے۔ اس کے بعد تجھے حق حاصل ہے کہ تو تصوف کے حق میں فیصلہ دے یا اس کے خلاف۔ اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ تاریخ تصوف اور صوفیائے کرام کے احوال میں بعض چیزیں مخالفین کی زیادہ کی ہوئی ہیں۔ اس چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے وگرنہ بعض اوقات حق باطل کے پس پردہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے یہ دینی فریضہ ہے کہ تو باطل کے ان حجابات کو تار تار کر دے تا کہ تو نورِ حق سے مستفید ہو سکے۔

اختتام میں میری خواہش ہے کہ ایک مضبوط علمی تحریک منظم کی جائے جو تصوف پر تحقیق کرے اور اس کی کتب کی اشاعت کا بندوبست کرے۔ بلکہ تصوف میں شامل ہونے والے ناپسندیدہ خرافات واقوال اور سیہ کاریوں سے تصوف کو پاک کر دے۔ تا کہ ہم باطل کو پہچان کر اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکیں تا کہ ایک دفعہ پھر حق چار دانگ عالم میں عام ہو جائے۔

اے نوجوانانِ اسلام! تصوف تمہاری تاریخ اور اخلاق کا ایک اہم حصہ ہے جس کو تم طویل عرصے سے ضائع کر رہے ہو۔ ماضی میں تصوف کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی ہے وہ کافی ہے لیکن اب سستی کو چھوڑ کر تصوف کو اپنالو۔ کیونکہ یہ دواء بھی ہے اور غذا بھی۔ اللہ تعالیٰ ہی صراطِ مستقیم کی ہدایت دینے والا ہے۔

(۲۳): شیخ ابو الحسن ندوی: آپ اپنی **"المسلمون فی الهند"** میں فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام لوگوں سے توحید، اخلاص، اتباعِ سنت، گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حضور اطاعت پر بیعت لیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو برائی، بدکاری، برے اخلاق، ظلم اور قساوت قلبی سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہونے کی رغبت دلاتے اور تکبر، حسد، بغض، ظلم حبِ جاہ جیسے برے اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی نصیحت فرماتے۔ تزکیۂ نفس اور اس کی اصلاح کی ترغیب دلاتے۔ اور لوگوں کو ذکرِ الٰہی، اخلاص، قناعت اور ایثار کا درس دیتے۔ مزید بر آں یہ بیعت شیخ اور مریدین کے درمیان مضبوط اور گہرے تعلق کی علامت گردانی جاتی ہے۔ یہ مشائخِ عظام ہمیشہ وعظ و نصیحت کیا کرتے اور یہ کوشش کرتے کہ ان میں حبِ الٰہی اور اس کی رضا کا شوق اور نفس کی اصلاح کا جذبہ بھڑک اٹھے۔ پھر شیخ معاشرے میں صوفیائِ کرام کے اخلاق، اخلاص اور تعلیم و تربیت کی تاثیر کے بارے میں بیان فرماتے ہیں اور بعض مثالیں بیان کرتے ہیں۔ جو اس تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سید احمد شہید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ لوگوں کا ان کی طرف شدید رجحان تھا وہ جس شہر سے بھی گزرتے کثیر تعداد میں لوگ ان کے دست پر بیعت اور گناہوں سے توبہ کرتے آپ دو ماہ تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ تقریباً ایک

ہزار افراد روزانہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ اور بیعت کا یہ سلسلہ آدھی رات تک جاری رہتا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے وہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ بیعت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ چھ سات عمامے باہم باندھ کر لوگوں میں پھیلا دیتے تھے تو لوگ ان عماموں کو پکڑ کر بیعت کرتے۔ اور اس طرح وہ دن میں سترہ یا اٹھارہ دفعہ بیعت کا اہتمام کرتے۔

آپ شیخ الاسلام حضرت علاؤالدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ کے عہد کے آخری سالوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس دور میں شراب، فسق وفجور، جوا، بدکاری اور عشق اور دیگر منکرات میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ لوگ ان چیزوں کا نام لینا بھی گناہ سمجھتے تھے بلکہ گناہ کبیرہ کو لوگ کفر کی مثل سمجھتے اور اعلانیہ طور پر سودی کاروبار اور ذخیرہ اندوزی سے حیا کرتے۔ حتیٰ کہ بازاروں میں جھوٹ، ناپ تول میں کمی اور ملاوٹ کے واقعات نادر الوقوع ہو گئے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ان صوفیاء ومشائخِ عظام کی تربیت نے مریدین میں باہمی تعاون اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ان مشائخ کی وعظ ونصیحت اور تہذیب وتربیت کی وجہ سے لوگ شریعت پر سختی سے کاربند ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ کلکتہ (جو کہ ہندوستان کا بہت بڑا شہر اور انگریزوں کا مرکز تھا) میں شراب کی تجارت ختم ہو گئی۔ شراب خانے اجڑ گئے۔ اور شراب بیچنے والوں نے حکومت کو ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اور یہ ان مشائخِ عظام اور صوفیائے کرام اور مصلحین کے اخلاق وعمل کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کی کوششوں سے بہت سے لوگ راہِ راست پر آ گئے۔ انہوں نے گناہوں، برائیوں اور خواہشاتِ نفسانی سے توبہ کر لی۔ اور یہ کسی حکومت یا قانون کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ اتنی کثیر تعداد میں موئثر ہو اور انہیں راہِ راست پر لا سکے۔

آپ اپنی کتاب "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" میں مشہور صوفی بزرگ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ کی مجلس وعظ میں ستر ہزار آدمی ہوتے تھے۔ آپ کے دستِ اقدس پر پانچ ہزار سے زیادہ یہود ونصاریٰ نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے آپ کے دستِ اقدس پر توبہ کی۔ آپ نے عوام الناس کیلئے بیعت اور توبہ کا دروازہ کھول دیا اور کثیر تعداد آپ کے فیض سے مستفید ہوئی۔ ان لوگوں کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں اور سختی سے شریعت پر کاربند ہو گئے۔ آپ اپنے مریدین کی تربیت ونگرانی پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ مریدین بیعت اور تجدیدِ ایمان کے بعد احکامِ شریعت پر کاربند رہنے کی ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ پھر آپ جس مرید میں استقامت اور تربیت خلق کی اہلیت اور صلاحیت دیکھتے اسے بیعت کی اجازت دے دیتے۔ آپ کے خلفاء دین کی نشرواشاعت کیلئے مختلف علاقوں میں پھیل گئے جنھوں نے مخلوقِ خدا کی تربیت کی شرک وبدعات، جاہلیت اور منافقت کے خلاف جہاد کیا اور اس طرح دینِ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچا اور تمام عالمِ اسلام میں ان لوگوں نے مدارس خانقاہیں قائم کیں۔

آپ کے خلفاء و مریدین اور دیگر مشائخ و صوفیاء جنہوں نے آپ کا طریقۂ تبلیغ اپنایا روح اسلام شعلہ ایمان اور جہاد تبلیغ اسلام کا فریضہ سر انجام دینے میں اہم کردار ادا کیا اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ اگر یہ روحانی شخصیات نہ ہوتیں تو وہ مادی قوتیں امتِ اسلامیہ کا کام تمام کر دیتیں جو مختلف حکومتوں کے بل بوتے پر کام کر رہی تھیں۔ ان مشائخ عظام کو ہی یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے ان دور دراز علاقوں میں اسلام کی شمع روشن ہوئی جہاں اسلامی لشکر کو رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اور انہی کی برکت سے افریقہ، ملائشیا میں اسلام پھیل گیا۔

شیخ ابو الحسن ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "روائع اقبال" میں علامہ اقبال کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے تصوف، اہلِ تصوف اور ان کے ذریعہ سے ہندوستان میں دینِ اسلام کی تجدید کا ذکر کیا اور شیخ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی شیخ ولی اللہ دہلوی اور سلطان محی الدین اورنگزیب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کی تعریف و توصیف فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ میرا نظریہ یہی رہا ہے کہ اگر ان لوگوں کا وجود مسعود اور جہاد نہ ہوتا تو ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور فلسفہ دینِ اسلام پر غالب آجاتا۔

(۲۵): صبری عابدین: استاذ صبری عابدین مجلہ لواء الاسلام میں فرماتے ہیں کہ میں نے بذات خود سوڈان اریٹیریا حبشہ اور صومالیہ میں صوفیائے کرام کے احوال کا مطالعہ کیا ہے ان علاقوں میں اہلِ تصوف کی مکمل قیادت سید میر غنی کے ہاتھ میں تھی اور خصوصًا اریٹیریا میں شرعی قاضی کی تقرری آپ کے کنٹرول میں تھی۔ اس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا بلکہ آپ قاضی کے علاوہ خطیب اور مؤذن بھی خود ہی مقرر کرتے تھے شیخ طریقت ہونے کے سبب آپ کو یہ حق حاصل تھا۔

در اصل صوفیائے کرام پوری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں پچاس سال پہلے شیخ بکری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک کتاب لکھی جس میں آپ نے عیسائی مبلغین کا قول نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ان مبلغین کا کہنا ہے کہ ہم ایشیا اور افریقہ کے جن دور دراز علاقوں میں گئے تو وہاں ہم نے پہلے سے ایک صوفی کو پایا جو ہم پر غالب آجاتا۔

کاش کہ آج کا مسلمان اہلِ تصوف کی روحانی اور مادی قوت کا ادراک کر لیتا انہی لوگوں کے لشکر دفاعِ اسلام کیلئے بر سرپیکار ہیں۔ میں نے خود حبشہ، سوڈان اور اریٹیریا کی سڑکوں پر سویڈن کے عیسائی مبلغین کو دیکھا ہے جو عیسائیت کی اشاعت کیلئے وہاں بھیجے گئے تھے ان مبلغین کے قریب ہی میں نے کچھ خیمے دیکھے جن کو اہلِ تصوف نے نصب کیا تھا اور یہ لوگ چالیس سال تک ان عیسائی مبلغین کا مقابلہ کرتے رہے اس لئے میری یہ استدعا ہے کہ ہم ان تحریکوں کو ختم کرنے کیلئے باہم تعاون کریں جو ہمیں دینی اور سیاسی طور پر نقصان پہنچا رہی ہیں۔ صوفیائے کرام پر اعتراض کرنے والے اپنی جہالت کی بنا پر اعتراض کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی بے عملی ہی ان کیلئے سب سے بڑی مصیبت ہے صرف صوفیائے کرام کا ہی ایسا گروہ ہے جو نہ صرف مکمل طور پر احکام پر عمل پیرا ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عمل کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے اپنے آپ پر لازمی قرار دیا ہے کہ وہ رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کریں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ عزیمت پر عمل کے ساتھ ساتھ رخصت کو اپنانا بھی پسند فرماتا ہے وجہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے مسلک کی بنیاد زہد پر ہے اور یہ بات جاننا ضروری ہے کہ زہد نبی کریم ﷺ کے عمل سے ماخوذ ہے رسول اللہ ﷺ نے زندگی اور اسکی لذتوں میں زہد اختیار فرمایا آپ نے ساری زندگی میں نہ تو پتلی روٹی کھائی اور نہ ہی میز پر کھانا کھایا۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ خلفائے راشدین اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کیلئے بہترین نمونہ ہے مشائخِ عظام نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ حقیقی صوفی وہی ہے جو سختی سے کتاب و سنت پر کاربند رہے۔ انہوں نے اپنے اصولوں کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان کتب میں درج ذیل کتابیں مشہور و متداول ہیں۔

رسالہ قشیریہ، ابو القاسم قشیری، احیاء العلوم، امام غزالی، حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم اصفھانی، کتاب قواعد التصوف، شیخ احمد ذروق۔

وہ لوگ جو بعض علوم کا انکار کر کے ان پر تنقید کرتے ہیں حالانکہ وہ خود ان علوم سے قطعًا ناواقف ہوتے ہیں ان کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو طب و حکمت سے ہی بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتا ہے جس طرح کہ علا اسلکافی نے طب کا انکار کیا ہے۔

جب مصر میں صلیبی لشکر نے دمیاط پر حملہ کیا تو شیخ ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ امام عزالدین بن عبد السلام اور ابو الفتاح ابن دقیق العید اور دوسرے علماء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

(۲۶): شیخ محمد ابوزہرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: علامہ شیخ محمد ابوزہرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجلہ لواء الاسلام میں تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں ظاہری طور پر تصوف تین حقائق پر مشتمل ہے۔

(۱): صوفیاء خواہشاتِ نفسانیہ کی مخالفت اور تزکیۂ نفس پر توجہ دیتے ہیں اس ضمن میں صوفیائے کرام امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہیں۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کرو کیونکہ یہ خواہشات ظاہری طور پر لطف ہیں لیکن ان کا انجام برا ہوتا ہے۔

(۲): اہلِ تصوف کو روحانی تعلق اور وجدانی کیفیت حاصل ہوتی ہے تصوف کی تعلیمات میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تابع اور متبوع پیر اور مرید کا متقاضی ہے۔ اور اس چیز کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہاں کوئی توجہ دینے والی شخصیت اور وہ

مرید باصفا جس پر توجہ دی جائے موجود ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مرید کی طرف سے طلب صادق اور شیخ کی طرف سے روحانی راہنمائی کا متقاضی ہے۔

یہ تینوں ثابت شدہ حقائق قطع نظر اس کے کہ اسلام تائید کرتا ہے یا نہیں اس صورت حال میں کیا یہ ممکن ہے کہ تصوف کو تربیت واصلاح کا ذریعہ بنایا جائے یا اسے محض ضرر رساں سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔

تصوف کو محض ضرر رساں کہنا زیادتی ہو گی۔ کیونکہ یہ بھی دوسری اشیاء کی طرح ایک حقیقت ہے کہ یہ فائدہ مند بھی ہو سکتا ہے اور ضرر رساں بھی ممدوح بھی ہو سکتا ہے اور مذموم بھی ارکانِ اسلام میں سے نماز کو ہی لے لیجئے قرآن کریم میں اس کی مدح بھی بیان کی گئی ہے اور مذمت بھی۔ اللہ تعالیٰ مؤمنین کی مدح وستائش کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ (لقمان:۴)

ترجمہ: وہ جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

اور نماز میں سستی کرنے والوں کو فرماتا ہے:

"فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ۔" (ماعون:۴)

ترجمہ: "پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز کی ادائیگی سے غافل ہیں۔"

اور یہی کیفیت تصوف کی ہے استاد فودی فرماتے ہیں کہ ہمارے دور میں بھی تصوف کی خوبیاں اور آثار وبرکات واضح ہیں۔ مغربی وسطی اور جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کا وجود اہلِ تصوف کا مرہون منت ہے۔

شیخ سنوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جب مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کا ارادہ فرمایا تو آپ نے صوفیائے کرام کے طریقہ کو اختیار کیا۔ آپ کا طریقہ تربیت عجیب تھا آپ نے پہلے کچھ لوگوں کو مرید بنایا اور پھر آپ نے ان مریدوں کو مجاہدانہ زندگی گزارنے اور تربیت دینے کیلئے خانقاہیں تعمیر کیں۔ آپ نے سب سے پہلے خانقاہ مکہ شریف کے پہاڑ میں بنائی پھر آپ نے خانقاہوں کا سلسلہ صحرا کی طرف پھیر دیا مختلف مقامات پر خانقاہیں قائم کیں۔ آپ نے اپنے مجاہدین کی مدد سے پانی نکال کر ان صحراؤں کو گل وگلزار بنا دیا۔ وہاں آپ نے ان مجاہدین کو فنون حرب سکھائے جب سلطنت عثمانی لیبیا والوں کی مدد سے عاجز آ گئے تو ان مجاہدین نے اٹلی کی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا انہی خانقاہوں کے مجاہدین بر سرپیکار رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اٹلی فوجوں کو ذلیل ورسوا کر دیا۔ اس طرح سلسلہ سنوسیہ کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ تم دنیا کی عظمت وشان سے دور بھاگو تو وہ تمہارے پیچھے آئے گی۔ پہلے دور میں مشائخِ عظام اور ان کے مریدین انتہائی مخلص ہوتے تھے بلکہ آج کل بھی بعض مخلص لوگ موجود ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ مخلص لوگ

تصوف کی تعلیم کو عام کریں جس طرح پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج کل کے دور میں اصلاحِ معاشرہ اور اس کی تربیت کیلئے اس کی اشد ضرورت ہے۔

شیخ ابوزہرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے دور میں تصوف کی اتنی ضرورت نہیں تھی لیکن اس دور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایسا شیخِ کامل ہونا چاہئے جو نظامِ تصوف کو دوبارہ زندہ کرے۔ کیونکہ ہمارے نوجوانوں پر نفسانی خواہشات غالب ہیں حتیٰ کہ ہر وقت ان کے دلوں پر یہ چیز چھائی رہتی ہے سینما، ریڈیو، ٹی وی اور گھٹیا قسم کے رسائل ان کی گمراہی کا سبب ہیں۔ ہر نوجوان ان چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ جب کسی قوم پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہو جائے پھر وہاں نہ تو علماء کے وعظ وارشادات فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی مفکرین کی تحریریں۔ حتیٰ کہ ارشاد وہدایت کے تمام وسائل بے فائدہ ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی اصلاح کیلئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں۔ یعنی ہم اپنے نوجوانوں پر غلبہ اور کنٹرول حاصل کریں اور یہ غلبہ شیخِ طریقت اور مریدین کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ان لوگوں کی تربیت کیلئے ایک شیخِ طریقت موجود ہو۔

بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے مروی حدیث ہے جس کو امام دیلمی نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہ شیخ اور مرید کے درمیان تعلق ہی ایسی چیز ہے جو تہذیب وتربیت کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "الموافقات" میں فرماتے ہیں کہ استاد وشاگرد کے درمیان ایک روحانی تعلق ہوتا ہے جس کی وجہ سے استاد کی فکر شاگرد میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح وہ تمام معلومات شاگرد کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں جو اس کا استاد اسے مہیا کرتا ہے۔ ہمیں بھی ایسے شیوخ کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور انہیں ناجائز خواہشات سے روک کر محفوظ کر دیتے ہیں کچھ عرصہ پہلے ایک شخص نوجوان طبقہ کی طرف متوجہ ہوا تھا اور اس نے ان کی تربیت کیلئے وہی طریقہ اختیار کیا تھا جو ایک شیخ اپنے مرید کے ساتھ کرتا ہے اور اسے کافی حد تک کامیابی ہوئی تھی لیکن اس کے سیاست میں مشغول ہونے کی وجہ سے تمام نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو ان برائیوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو میرے نزیک ضروری ہے کہ ہم صوفیائے کرام کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ میری نگاہ میں اس سے موئثر کوئی دوسرا علاج نہیں ہے۔

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ تصوف دوسرے امور کی طرح ہے کچھ برے لوگ اس میں داخل ہو گئے ہیں۔ اگر اس کو ان لوگوں سے پاک کر کے خالصۃً روحانی مقصد کیلئے استعمال کیا جائے تو یہ اسلامی معاشرہ کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے۔ آج کل کا مسلم نوجوان مختلف نفسانی خواہشات کا اسیر ہو گیا ہے جنہوں نے اس کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا ہے اور اس کو دوبارہ صراطِ مستقیم پر لانے کا صرف

ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے اور یہ کام ایک شیخِ کامل ہی کر سکتا ہے۔ اگر نوجوان نسل کو تصوف کی طرف مائل کر دیا جائے اور ان کی اصلاح کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن کیا جائے تو یہ تصوف کی بہت بڑی کامیابی اور افضل ترین عمل ہے۔

(۴) باب نمبر چار: اثباتِ بیعت

اے میرے دل کے قرار! جب تجھے ان صفات کا حامل شیخ مل جائے کہ جس کی علامات بیان کی جا چکی ہیں تو تجھے اُس سے بیعت ہو جانا چاہئے کیونکہ بیعت ہونا سنت ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل میں ایک فصل مفصل دربارۂ استدلال بیعت تحریر فرماتے ہیں کہ جو قرآن و حدیث سے استنباط کیا گیا ہے۔

مولوی ہر گزنہ شد مولائے روم   تا غلام شمس تبریزی نہ شد [1]

اللہ رب العزت نے دنیا کا ایک نظام بنایا ہے اور سارے کام اسی نظام کے تحت طے پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کوئی چیز بھی براہِ راست عطا نہیں کرتا بلکہ اللہ تو حکم دیتا ہے کہ:

وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔ (مائدہ: ۳۵)

اسی لئے انسان کو اپنی اصلاح کے لئے کوشش کرتے رہنا چاہئے اور پیر کامل کی تلاش بھی ہمیشہ رکھنی چاہئے اور جہاں کہیں سے بھی کوئی فیض حاصل ہو، اسے حاصل کرنا چاہیئے۔ اور یہی مقصد کسی مرشد سے بیعت ہونے کا ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی سلسلۂ طریقت سے بیعت ہونا کسی صورت بھی خارج از فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے صالحین اور عارفین کا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی سلسلہ سے منسلک رہ کر عوام الناس کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، انشاء اللہ عزوجل۔ آیئے ہم بیعت کے جواز اور اس کی اہمیت و ضرورت کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

بیعت: لفظ بیعت، باع، بیع کا مصدر ہے، جس کے معنی "بیچنے" کے ہیں۔ [2]

اسی طرح بایع یبایع، مبایعۃ کا معنیٰ "بیعت کرنے" یا "خرید و فروخت کرنے" کے ہیں۔ [3]

مختار الصحاح میں لکھا ہے: بیعۃ: اس نے اُس سے بیعت لی، یا اُس کی بیعت کی اور اس نے اسے فروخت کیا، دونوں معانی مراد ہیں۔ [4]

المنجد میں اس کا معنیٰ "باہم معاہدہ کرنا" مذکور ہیں۔ [5]

---

[1] (مثنوی مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ)

[2] (مقدمہ ابن خلدون، حصہ دوم، فصل: ۲۹، صفحہ: ۲۸۵)

[3] (قاموس الفاظ القرآن الکریم، کتاب الباء صفحہ ۵۸)

[4] (مختار الصحاح، صفحہ ۱۱۰)

[5] (المنجد، ص ۱۱۰)

لغوی معنٰی:

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: بیعت کا لغوی معنی معاہدہ اور معاقدہ ہے۔[1]

ابن خلدون لکھتے ہیں: بیعت مصافحہ کی ایک قسم ہے، بیعت کا فعل لین دین والوں کے فعل کے مثل ہوتا ہے۔ اس لئے بیعت کو بیعت کہتے ہیں۔ (گویا بیعت کرنے والے نے اپنے تمام اختیارات اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے جس سے بیعت کر لی ہے۔) بیعت کے لغوی اور شرعی معنی یہی ہیں۔[2]

علامہ شیخ سلیمان الجمل رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۰۴ھ) تفسیرِ جمل میں لکھتے ہیں:

فھو بیع لغوی و البیع فی اللغۃ مقابلۃ شئ بشئ علی وجہ العوضیۃ وفی شیخ زادہ سمیت المعاھدۃ مبایعۃ تشبیھا لھا بھا فان الامۃ اذا التزموا قبول شرط علیھم من تکالیف الشرع طمعا فی ثواب الرحمن وھربا من عقابہ وضمن علیہ الصلوۃ و السلام ذلک فی مقابلۃ وفائھم بالعھد المذکور فصار کان کل واحد منھم باع ما عندہ بما عند الآخر۔

بیعت لغت میں معاہدہ اور معاقدہ کو کہتے ہیں، یہ بیع لغوی ہے اور لغت میں بیع اسے کہتے ہیں کہ ایک شیء کو دوسری شیء کے عوض میں دینا گویا ایک شیء مقابل ہے عوض کے۔ اور شیخ زادہ نامی کتاب میں ہے کہ "معاہدہ" مبایعت ہے، کیونکہ امت اپنے اوپر جب تکالیف شرع بمع شروط کے قبولیت کا التزام کر لیتی ہے، اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید اور عذابِ الٰہی سے بچنے کیلئے، تو رسول اللہ ﷺ ان کے عہد مذکور کو پورا کرنے کی بناء پر ان کے (دخول جنت کے) ضامن ہو جاتے ہیں، سو تکالیف شرعی اور ان کا پورا کرنا ثواب آخرت کے بدلے، اور حضور ﷺ کا ضامن ہونا، ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی شیء کو دوسرے کے ہاتھوں عوض کے بدلے بیچ ڈالے۔[3]

حضرت علامہ قدوۃ الامۃ وعلم الائمۃ ناصر الشریعۃ ومحیی السنۃ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی الصوفی المعروف بالخازن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و اصل البیعۃ اکعتد الذی یعقد الانسان علی نفسہ من بذل الطاعۃ للامام و الوفا بالعھد الذی التزمہ لہ۔

یعنی امام کی اطاعت و فرمانبرداری اور کیئے ہوئے عہد و پیمان کے پورا کرنے کے سلسلے میں انسان جو کچھ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے یہی اصل بیعت ہے۔

[1] (فتاویٰ عزیزی، باب التصوف ص ۱۰۱)
[2] (مقدمہ ابن خلدون، حصہ دوم، فصل ۲۹، صفحہ ۲۸۵)
[3] (تفسیر جمل، جلد ۴، ممتحنہ ص ۳۳۴)

اصطلاحی مفہوم: شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: متکلمین کی اصطلاح میں بیعت "عہد کرنا" ہے۔ متکلمین کے نزدیک بیعت یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد جو بیعت صحابہ کبارث نے کی تھی وہ بیعت خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے بارے میں ہوئی تھی۔ اس سے یہ مقصد تھا کہ صحابہ کبارث نے یہ عہد کیا کہ ہم لوگ خلافت کے احکام کو جاری و ساری رکھیں گے۔ یہ بیعت آیہ کریمہ **یبایعونک تحت الشجرۃ** سے ثابت ہے۔ اور صوفیاء کرام کی اصطلاح میں بیعت سے یہ مراد ہے کہ مرید اپنا عقیدت کا ہاتھ مرشد کے ارشاد کے ہاتھ کے ساتھ منعقد کرتا ہے۔ اور یہ انعقاد مرشد کے واسطے سے مرشد کے ساتھ ہوتا ہے اور علیٰ ھذا القیاس یکے بعد دیگرے یہ انعقاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو جاتا ہے اور ان کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ بیعت فعلِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔[1]

ضرورت و اہمیت: اس پُر فتن دور میں تو بیعت مرشد کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی ایسی ہستی کا دامن پکڑا جائے جو راہِ طریقت سے واقف ہو اور علومِ شریعت و طریقت کا جامع ہو اور طالبانِ حق کی رہنمائی کا فریضہ احسن طور پر سرانجام دے سکے۔

ہدایت ملی جس کو مرشد ملا نہیں جس کا مرشد بھٹکتا رہا[2]

بیعت کا جواز:

کلامِ پاک میں ارشاد ہے:

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔ (المائدہ: ۳۵)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈو۔"

آقا علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمانِ عالی شان ہے کہ اللہ رب العزت اپنے بندگانِ خاص کے لئے ارشاد فرماتا ہے:

ھم القوم لا یشقی بھم جلیسھم۔[3]

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہتا۔

---

[1](فتاویٰ عزیزی، باب التصوف، صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲)

[2](تحقیق حق، صفحہ: ۳۸)

[3](بیہقی، بحوالہ سنی بہشتی زیور، ص ۸۵۹)

اس آیت کے تحت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس آیت میں "وسیلہ" سے مراد بیعتِ مرشد ہے۔"

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اس کے حاشیہ پر لکھا: "ہم نے اپنے جد امجد شاہ عبد الرحیم علیہ الرحمۃ کے ایک مرید سے سنا کہ ہمارے جد امجد نے واسطے مشروعیت بیعت کے اس مذکورہ بالا آیت سے استدلال کیا اور فرمایا کہ یہ ممکن نہیں کہ وسیلے سے مراد ایمان لیجئے، اس واسطے کہ خطاب اہل ایمان سے ہے، اور اعمالِ صالحہ بھی مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تقویٰ میں داخل ہیں۔ پس متعین ہو گیا کہ وسیلے سے مراد ارادت و بیعتِ مرشد کی ہے۔"[1]

تفسیر ضیاء القرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے: "اعمالِ صالحہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں اور مرشدِ کامل جو اپنی روحانی توجہ سے اپنے مرید کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی اتار دے، دل میں یادِ الٰہی کی تڑپ پیدا کر دے۔ اس کے وسیلہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔"[2]

یہاں تک کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے بھی لکھا: اہل سلوک اس آیت کو سلوک کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور وسیلہ مرشد کو جانتے ہیں۔[3]

حضرت مولانا مفتی احمد یار خان صاحب نے آیت **یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ابتغوا الیہ الوسیلۃ** کے تحت "وسیلہ" کی تفسیر و تشریح بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کی ہے جس میں سے چند مختصر عبارتیں نقل کی جاتی ہیں۔

(و ابتغوا الیہ الوسیلۃ) یہ دوسرا حکم ہے جو ایمان و تقویٰ کے بعد ہے، **ابتغوا** بنا ہے **ابتغا** سے جس کا مادہ **بَغْیٌ** ہے۔ ابتغا کے معنی ہیں تلاش کرنا ڈھونڈنا ہر چیز کی تلاش کے لئے دروازے الگ ہیں۔ ہر سودے کی جستجو کے لئے بازار دوکانیں جداگانہ ہیں اس چیز کی تلاش میں ان دروازوں ان دوکانوں بازاروں میں جانا پڑتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو ڈھونڈو حضور ﷺ کے دروازے پر اور حضور ﷺ کو ڈھونڈو حضرات اولیاء اللہ کے دروازوں پر۔ حضرات اولیاء اللہ کے آستانے تلاش کرو آستانہ کے ذریعے سے۔[4]

خیال رہے کہ وسیلہ کے لغت میں بہت معانی ہیں: قرب، محبت، حاجت، جنت کا خاص مقام۔

---

[1](القول الجمیل، صفحہ ۳۹)

[2](ضیاء القرآن، جلد ۱، تفسیر سورۃ المائدہ ص ۴۶۲)

[3](صراط مستقیم، صفحہ ۵۸)

[4](تفسیر نعیمی جلد ۶، ص ۳۹۳)

ایک شاعر نے کہا ہے:

ان الرجل لهم اليک وسيلته　　　　ان ياخذوک تکحلی و تعضب

(تفسیر روح المعانی و خازن) اصطلاح میں کسی چیز کے ذریعہ کو وسیلہ کہا جاتا ہے یہاں وسیلہ کے تمام معنی بن سکتے ہیں مگر آخری معنی یعنی ذریعہ قوی ہے۔ وسیلہ عام ہے حضرات اولیاء انبیاء نیک اعمال، ان حضرات کے تبرکات سب ہی اس میں شامل ہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں اعمال کے علاوہ دوسرے وسیلے مراد ہیں کیونکہ اعمال تو اتقوا اللہ میں آگئے تقویٰ کے بعد وسیلہ کی تلاش کا حکم دے کر بتایا گیا کہ کوئی متقی تقویٰ کے کسی درجہ پر پہنچ کر خدا کی رسی کے لئے وسیلہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔[1]

وسیلہ: از آدم علیہ السلام تا حضور ﷺ ہر دین ہر امت کا یہ عقیدہ رہا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا بھی عقیدہ رہا اور ہے کہ ربّ تعالیٰ تک رسائی کے لئے حضرات انبیاء اولیاء بلکہ ان کے تبرکات بھی وسیلہ ہیں سب کا اس امر پر اتفاق رہا۔[2]

سارے نیک اعمال تو اتقوا اللہ میں داخل ہیں پھر وسیلہ کیا چیز ہے۔ وہ وسیلہ مقبولین ہی تو ہے اس لئے بزرگانِ دین کی بیعت عہد صحابہ سے آج تک کی جاتی ہے۔ نیک اعمال صفائی قلب کے لئے پانی و صابن کی طرح ہیں، پانی صابن میلے کپڑے کو جب ہی صاف کر سکتے ہیں جب اور کسی کا ہاتھ لگے۔ بغیر دھونے والے کے ہاتھ کے پانی صابن بے کار ہیں۔ بزرگوں کی نگاہ دھونے والا ہاتھ ہے۔

خیال رہے کہ کبھی بغیر صابن و پانی کے صرف ہاتھ پھر جانے سے گرد و غبار دور ہو جاتا ہے، مگر صرف صابن و پانی سے بغیر ہاتھ لگے کبھی صفائی نہیں ہو سکتی، اسی طرح بارہا ایسا ہوا کہ صرف نگاہِ مقبول سے بغیر اعمال بخشش ہو گئی مگر اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی کہ صرف نیک اعمال سے بغیر توسل مقبولین نجات ہو گئی۔ ابلیس کے پاس اعمال تھے توسل نہ تھا مارا گیا۔[3]

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اپنی تفسیر معارف القرآن اس آیہ مبارکہ کے تحت لفظ وسیلہ کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں: "جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے۔ اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہیں اور اسی لئے ان کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست رہا جیسا کہ حضرت عمر

---

[1] (تفسیر نعیمی ص ۳۹۸ ج ٦)

[2] (تفسیر نعیمی، ج ٦، ص ۳۹۹)

[3] (تفسیر نعیمی ج ٦، ص ۴۰۱)

رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ایک روایت میں رسول اکرم ﷺ نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح تلقین فرمائی، **اللھمّ انّی اسئلک و اتوجه الیک بنبیک محمد نبیّ الرحمه۔** (اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بواسطہ تیرے نبی محمد (ﷺ) جو کہ نبیِ رحمت ہیں۔)[1]

مندرجہ بالا ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس آیت سے بیعت مرشد ہی مطلوب ہے اور تمام مکاتب فکر کو قابل قبول ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کا قول بھی ہم اس ضمن میں پیش کر چکے ہیں اور آپ کے والد گرامی شاہ عبد الرحیم علیہ الرحمۃ نے اس کو اور واضح بیان فرمادیا۔ دیکھئے: **القول الجمیل صفحه ۳۹۔**

اس کے علاوہ بیعت کی اہمیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی واضح ہوتی ہے:

من یهد الله فهو المهتد و من یضلل فلم تجد له ولیا مرشدا۔ (الکهف:۱۷)

ترجمہ: ”جس کو وہ (اللہ) گمراہی میں چھوڑ دے تو تم ہر گز اس کے لئے کوئی حمایتی راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔“

اسی طرح دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یوم ندعوا کل اناس بامامهم۔ (الاسراء: ۷۱)

ترجمہ: ”اس دن کو یاد کرو جس دن ہر ایک جماعت ان کے امام اور پیشوا کے ساتھ بلائی جائیں گی۔“

اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: **من لیس له شیخ فشیخه الشیطٰن۔** یعنی جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے۔[2]

اور اسی آیت کے پیش نظر حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ نے یہ بھی فرمایا: **من لا امامه له فالشیطٰن امامه۔** جس کا کوئی پیشوا نہیں تو شیطان اس کا پیشوا ہے۔[3]

تفسیر روح البیان (جلد ۹ صفحہ ۲۲) پر ہے: ”حضرت استاذ ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ اپنے شیخ ابو علی الدقاق قدس سرہ کا قول نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جو درخت خود بخود کسی کے بونے کے بغیر پیدا ہو جائے اس کے پتے تو پیدا ہو جائیں گے لیکن پھل نہ دے گا آزمایا گیا ہے کہ ایسے ہی بار ہا ہوا ہے ایسے درخت وادیوں اور پہاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں اگر ان پر

---

[1] (تفسیر معارف القرآن ج۳ ص ۱۲۸)

[2] (شرح صحیح مسلم، جلد ۴، کتاب الحدود، ص ۸۷۲)

[3] (تحقیق حق، ص ۷۳، اور ۸، تفسیر روح البیان ج ۹، ص ۲۲)

میوے ہوتے بھی ہیں تو ان میں وہ چاشنی نہیں ہوتی جو باغات اور ہاتھوں سے لگائے ہوئے درختوں میں ہوتی ہے، بالخصوص وہ درخت جنہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔

نکتہ و مسئلہ: شریعت مطہرہ اس کتّے کے شکار کو حلال کہتی ہے جو شکار کا تعلیم یافتہ ہو بخلاف غیر تعلیم والے کے، کہ اس کا شکار حرام ہوتا ہے۔

فائدہ: ہم نے مشائخِ کرام سے سنا ہے کہ جسے استاذ کا ہاتھ نصیب نہ ہو وہ ہمیشہ ناکام رہے گا۔

تعلیمِ نبوی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم: ہمیں نبی پاک ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست علوم و آداب حاصل کیے جیسا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ ہر مسئلہ سکھاتے یہاں تک کہ رفع حاجات کے آداب اور طریقے بھی۔

سبق: طالبِ حق کو ضروری ہے کہ وہ ایسے ادیب کامل و استاذ حاذق (شیخ کامل) سے آداب سیکھے جو نفوس کی آفات اور اعمال کے فسادات اور دشمن کی گھاتیں بتائے بلکہ آنکھوں سے مشاہدہ کرائے۔ جب ایسا استاذِ کامل (مرشد و رہبر) مل جائے تو پھر اس کی صحبت کو لازم پکڑے اور اس سے آدابِ شریعت و طریقت حاصل کرے تاکہ اس کے باطن کے اثرات اس کے باطن پر اثر انداز ہوں اور اس کا باطن زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو اور وہ فیض اسے یوں پہنچے گا جیسے ایک دیا دوسرے دیے سے روشن کیا جاتا ہے اور خود بھی اپنے نفسانی خیالات و تصورات و خواہشات سے بالکل خالی ہو جائے کیونکہ شیخ کامل کے سامنے تسلیم و رضا یوں ہو جیسے اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کے لئے ہونا چاہیئے کیونکہ مشائخ کا سلسلہ تسلیم رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے اور وہاں سے اللہ تعالیٰ تک۔

مثنوی شریف میں ہے:

گفت طوبیٰ من رآنی مصطفی ۔۔۔ والذی یبصر لمن وجھی رآی

چوں چراغے نور شمعی را کشید ۔۔۔ ہر کہ دید انرا یقیں آں شمع دید

ہم چنیں تا صد چراغ از نقل شد ۔۔۔ دیدن آخر لقائے اصل شد

خواہ نور از وا پسیں بستان جان ۔۔۔ ہیچ فرقے نیست خواہ از شمع دان

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے دیکھا مجھے اس کی قسم جو دیکھتا ہے واقعی اس نے میرا چہرہ دیکھا۔ جیسے نورِ شمع سے چراغ نور کھینچتا ہے جس نے چراغ کو دیکھا اس نے یقینا شمع کو دیکھا۔ ایسے صد چراغ روشن ہوں تو سب کا دیکھنا گویا اصل کا دیکھنا ہے۔ اب چاہے آخری سے روشنی لوا لے جانِ من خواہ اول سے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

پیر طریقت رہبر شریعت عالم باعمل مرشد اکمل حضرت علامہ اخوندرویزہ بابا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطان۔

جس کا کوئی شیخ نہیں ہو تو شیطان اس کا شیخ بن جاتا ہے۔[1]

امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

من ادعی الطریق بلا شیخ کان شیخہ ابلیس فھو وان وقعت علی یدہ کرامۃ فھی استدراج الدجال الاعور اذا خرج اخر الزمان۔ وکان الامام ابو القاسم الجنید رحمۃ اللہ علیہ یقول من سلک بغیر شیخ ضل واضل ومن حرم احترام الاشیاخ ابتلاہ اللہ بالمقت بین العباد وحرم نور الایمان۔

جس نے بغیر کسی شیخ کے طریقت کا دعویٰ کیا تو اس کا شیخ ابلیس ہو گا تو اس کے ہاتھ اگرچہ کرامتوں کا ظہور ہو گا مگر یہ اس کانے دجال کا استدراج ہو گا جو آخری زمانے میں نکلے گا۔ امام ابو القاسم جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص راہ سلوک پر بغیر شیخ کے قدم رکھتا ہے گمراہ اور گمراہ گر ہو گا۔ اور جو شخص احترام مشائخ سے باز رہا اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت میں مبتلا کر کے نور ایمان سے محروم کر دے گا۔[2]

امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

وکان سیدی علی بن وفار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یقول من لیس لہ استاد فلیس لہ مولی ومن لیس لہ مولی فالشیطان بہ اولی والمراد یکون لا مولیٰ لہ ان الحق تعالیٰ یعاملہ بتعسیر الارزاق ونحو ذلک قال اللہ تعالیٰ وان الکافرین لا مولیٰ لھم۔

پھر لکھتے ہیں کہ میرے شیخ سیدی علی بن وفار رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس کا استاد نہیں اس کا مولیٰ نہیں اور جس کا مولیٰ نہیں شیطان اس پر مسلط ہو گا۔ مطلب یہ کہ پھر اس کا مولی کوئی نہیں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رزق کی سختی کا برتاؤ کرے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ کافرین کا کوئی مولیٰ نہیں۔[3]

علمائے اہل حدیث و دیوبند کے بہت بڑے قائد مولوی اسماعیل دہلوی نے لکھا ہے: اہل سلوک اس آیت کو سلوک کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور وسیلہ مرشد کو جانتے ہیں۔ پس تحقیق نجات کے لئے مجاہدہ سے پہلے مرشد کا ڈھونڈنا ضروری ہے۔

---

[1](ارشاد الطالبین ص ۳۲۴)

[2](انوار قدسیہ ج ۲ ص ۱۷۴)

[3](انوار قدسیہ ج ۱ ص ۱۵)

رہبر کے سوا راستہ پالینا مشکل ہے۔ بے شک مرشد اللہ تعالیٰ کے راستے کا وسیلہ ہے۔ مرشد اس کو بنانا چاہئے جو کسی طرح شریعت کے مخالف نہ ہو قرآن و حدیث کے سیدھے راستے پر ثابت قدم رہے۔[1]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ o (التوبہ)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ۔"

اس آیت میں سچے اور نیک بندوں کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ ادائے حقوق، اجتناب معصیت یعنی گناہ سے بچنا وغیرہ سب اس حکم تقویٰ کے تحت آ گئے۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں مزید حکم ملتا ہے، صادقوں سچوں کی معیت و سنگت اختیار کرو۔ راست بازوں کی صحبت و رفاقت میں رہو۔ صالحین و ذاکرین کی یہ شان ہے:

هُمُ الْقَوْمُ لَا یَشْقٰی بِهِمْ جَلِیْسُهُمْ۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا۔[2]

حضور ﷺ نے فرمایا: آدمی قیامت میں اُس کے ساتھ ہو گا جس کے ساتھ محبت رکھتا ہو۔[3]

اللہ والوں سے محبت ہو گی تو انشاء اللہ انہی کے ساتھ ہوں گے۔

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ (الکھف: ۲۸)

ترجمہ: "اور اپنی جان ان سے مانوس رکھو جو صبح و شام اپنے ربّ کو پکارتے ہیں اس کی رضا چاہتے ہیں اور تمہاری آنکھیں انہیں چھوڑ کر اور پر نہ پڑیں۔"

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ (الانعام: ۵۲)

ترجمہ: "اور دور نہ کرو انہیں جو اپنے ربّ کو پکارتے ہیں صبح اور شام اس کی رضا چاہتے۔"

رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے شوق میں نہایت اخلاص کے ساتھ دائماً عبادت و ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ میرے حبیب! انہی کے ساتھ رہو۔ ان کو جدا نہ کیجئے، اس سے معلوم ہوا کہ اچھے کے ساتھ رہنا اچھا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حدیث ہے، ایک بہت بڑا گنہگار اس ارادہ سے چلا کہ وہ اللہ والوں کے پاس جا کر توبہ کرے۔ ابھی نیک بندوں کے پاس نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں ہی موت آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔[4]

---

[1] (صراط مستقیم ص ۸۸،۸۷)

[2] (صحیح مسلم ۲:۳۴۴)

[3] (سنن ترمذی، التکشف، صفحہ ۴۲۵)

[4] (صحیح بخاری، ۱:۴۹۳)

ابھی وہاں پہنچا نہیں تھا لہٰذا توبہ نہیں کی تھی مگر ربّ کریم نے اپنے نیک بندوں کی برکت اور اس آدمی کے اچھے ارادے کے سبب اتنے بڑے گناہ گار کو بخش دیا، ہم گنہگار بھی اللہ والوں کے پاس جاکر بیعتِ توبہ کرتے ہیں۔ امام مجددالفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مرشد کامل کی صحبت کیمیا ہے۔ اس کی نظر دوا اور اس کی بات شفا ہے۔ مرید محبت کے رابطہ سے اپنے شیخ کا رنگ پکڑتا ہے۔ [1]

اور حضرت مجدّد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ناقص پیر کی صحبت زہر قاتل ہے، پیر کامل ہونا چاہیئے جو آدمی ناقص طبیب کی دوا کھاتا ہے گویا وہ اپنے مرض کو زیادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ [2]

جیسے ناقص طبیب کے علاج سے جسمانی نقصان ہوتا ہے اسی طرح ناقص پیر کی صحبت سے روحانی نقصان ہوتا ہے۔

علامہ امام اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بیعت کا سنت ہونا اور مشائخ سے اکتسابِ فیض کرنا ثابت ہے۔ [3]

عارف مولانا جلال الدین رومی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پر آفت وخوف وخطر

ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد اوز غولاں گمرہ ودر چاہ شد [4]

ترجمہ: پیر کا توسل اختیار کرو کیونکہ بغیر پیر یہ سفر خوف وخطر سے پُر ہے۔ راستہ میں نفس و شیطان کا خطرہ ہے۔ جو شخص بغیر مرشد کے راستے پر چل پڑا وہ شیطانوں کی وجہ سے گمراہ و ہلاک ہو گیا۔

بیعت مرشد کے سلسلہ میں بزرگوں نے ایک مثال کے ذریعے بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں: ایک نادان چھوٹے بچے کی جیب میں اشرفیاں یا موتی ہوں اور وہ میلہ میں تنہا پھر رہا ہو، چور اس کو دیکھے گا اور اس کے پیچھے لگ جائے گا اور اس کا پیچھا اس وقت چھوڑے گا جب اس کی جیب کا صفایا کرلے گا۔ فرماتے ہیں: اگر وہ بچہ کسی دانا کا ہاتھ پکڑ کر پھر رہا ہو اور دانا اس کی حفاظت کر رہا ہو تو چور جیب نہیں کاٹے گا۔ وہ سوچے گا کہ یہ بچہ تو نادان ہے مگر جس کا اس نے ہاتھ پکڑا ہوا ہے وہ دانا ہے، اگر اسے پتہ چل گیا تو مجھے جیل جانا ہو گا!

بزرگ فرماتے ہیں: بس اس سے یہ سمجھنا چاہیئے یہ دنیا ایک میلہ ہے۔ شیطان ایک چور ہے جو تیرے پیچھے لگا ہوا ہے اور تیرے پاس ایمان کے قیمتی موتی ہیں۔ تیری حیثیت نادان بچے کی سی ہے، اگر تو ایمان کی حفاظت چاہتا ہے تو اس دنیا کے میلہ میں

---

[1] (مکتوبات دفتر اول، ص ۲۹۰)
[2] (مکتوبات دفتر اول ص ۲۱)
[3] (تفسیر روح البیان ۹:۲۱)
[4] (مثنوی رومی، دفتر اول، ص ۳۰۸)

تنہا نہ پھر، کسی دانا اللہ والے کا ہاتھ پکڑ کر پھر، تا کہ تیرا ایمان شیطان کے حملوں سے بچ جائے، شیطان کے مکر و فریب کو ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا، وہ ہر موڑ پر ایک نیا دھوکہ دیتا ہے۔ اللہ کے برگزیدہ بندے شیطان کے مکر و فریب کو جانتے ہیں۔

حضرت غوثِ اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ جنگل میں جا رہے تھے۔ آپ کے سر کے اوپر ایک بادل نمودار ہوا اور اس سے آواز آئی: اے عبد القادر! میں تیرا ربّ ہوں، تو نے میری اتنی عبادت کی ہے کہ اب مزید نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ غوث پاک نے لا حول پڑھی اور کہا مردود تو شیطان ہے میرا رب نہیں! شیطان نے کہا: اے عبد القادر! تجھے تیرے علم نے بچا لیا! فرمایا اے مردود! تو دوسرا دھوکہ دینا چاہتا ہے! مجھے علم نے نہیں بچایا خدا کے فضل نے بچایا! علم تو تیرے پاس بھی بہت تھا، مگر تو گمراہ ہوا۔

پڑھی لاحول اور شیطان کے دھوکے کو کیا غارت
علم و فضل سے وہ نور چمکا غوث اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان۔

جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ (القرآن)

ان بندوں پر تیرا کوئی تسلط نہیں چل سکتا۔ وہ تیرے دام فریب میں نہیں آئیں گے۔

اور شیطان نے خود بھی اعتراف کیا تھا:

قال فبعزتک لأغوینھم اجمعین o الا عبادک منھم المخلصین o (سورۃ الحجر)

ترجمہ: "بولا تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔"

حضور غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے رہبر و مرشد کی اہمیت کو اس طرح بیان فرمایا کہ اے راہ آخرت کے مسافر! تو ہر وقت رہبر کے ساتھ رہ تا کہ وہ تجھے منزل پر پہنچا دے۔ رہبر کے ساتھ حسنِ ادب کا برتاؤ رکھ اور اس کی راہ سے باہر مت ہو کہ وہ تجھے واقف کار بنا دے گا۔[1]

---

[1](الفتح الربانی، مجلس نمبر ۵۰)

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگ اپنے عیبوں سے جاہل ہیں دوسروں کے عیب معلوم کرتے ہیں اور اپنے اندر بڑے بڑے عیب ہیں ان کو نہیں جانتے۔ بس جو کوئی اپنے عیب جاننا چاہے تو مرشد کامل کے سامنے بیٹھے، مرشد عیوبِ نفس اور ان کا علاج دونوں بتلا دیتا ہے، جو مجاہدہ مرشد بتلائے اس پر عمل کرو۔[1]

مرشد مریدوں کے نفوس کے معالج ہیں جس طرح طبیب مریض کے مزاج کے مطابق دوا دیتے ہیں، اسی طرح مرشد کو چاہیئے کہ مرید کی حالت و مزاج کے مطابق مجاہدہ و ریاضت سکھائے۔[2]

مولوی اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے: باطنی خرابیاں سمجھ میں کم آتی ہیں اگر کچھ سمجھ میں آ بھی جائیں تو ان کی درستی کا طریقہ کم معلوم ہوتا ہے، اس لئے پیرِ کامل کو تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں سے آگاہ کرتا ہے اور ان باطنی خرابیوں کا علاج و تدبیر بتلاتا ہے اور اذکار و اشغال تعلیم کرتا ہے۔[3]

نیز لکھا ہے: بغیر صحبت کامل اور اس سے تعلق قائم کئے بغیر کام بننا مشکل ہے۔ جسمانی معالج طبیب ہیں اور روحانی معالج کاملین ہیں۔[4]

مولوی رشید گنگوہی نے ایک آدمی کو بیعت کر کے کہا، میں تجھے داخل سلسلہ کرتا ہوں نماز جماعت کے ساتھ ادا کر، ممنوعات شریعہ سے اجتناب کر، یہی خلاصہ بیعت کا ہے اور اسی واسطہ بیعت ہوتے ہیں۔ مراد بیعت سے تحصیل اخلاص ہے۔ مرید ہونا مستحب ہے جس کا کوئی راہ بتلانے والا نہیں وہ شیطان کی کمند میں ہے۔[5]

مفتیٔ دیوبند محمود حسن گنگوہی نے لکھا ہے: "بیعت کے مقاصد متعدد ہوتے ہیں، بزرگ کے ہاتھ پر توبہ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کیا جاتا ہے۔ بزرگ کو توبہ کا گواہ بنایا جاتا ہے اور اس سے دعا و توجہ چاہی جاتی ہے جس کی برکت سے آدمی اپنی توبہ پر قائم رہے۔ کسی کامل ولی سے رابطہ قائم کئے بغیر اخلاص پیدا نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانہ میں بیعت صرف امر خلافت میں اطاعت کے لئے نہیں تھی، بلکہ تزکیہ باطن کے استحکام کے لئے بھی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے اکابر علماء نے باوجود مہارت علمیہ کے بیعت کی ضرورت محسوس کی۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان

---

[1] (احیاء العلوم ۳:۹۵)

[2] (احیاء العلوم، ۳:۹۱)

[3] (التکشف، ص ۷)

[4] (الافاضات الیومیہ، ۱:۴۲)

[5] (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۹۹)

کے خاندان کے علماء کا حال معلوم ہے۔ مولانا رشید گنگوہی، قاسم نانوتوی صاحب و تھانوی صاحب وغیرہ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کی ضرورت سمجھی اور اس بیعت کی بدولت بہت کچھ باطنی منافع حاصل کئے۔"[1]

دیوبندیوں کے بڑے مفتی مولوی کفایت اللہ دہلوی نے کہا: کسی بزرگ کے ہاتھ پر یہ معاہدہ کرنا کہ میں آئندہ معصیت و گناہ نہ کروں گا، تصفیہ قلب یعنی قلب کی صفائی کے لئے آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا، اس کا نام بیعت کرنا یا مرید ہونا ہے، بیعت توبہ مسنون ہے۔ مرشد لوگوں سے اس بات پر بیعت لے کہ وہ گناہوں سے اجتناب کریں گے اور فرائض بجالاتے رہیں گے۔ لازم ہے کہ مرشد خود بھی سنت نبوی ﷺ کا پابند ہو، کوئی امر قصداً سنت کے خلاف نہ کرے۔

نیز لکھا ہے: "میں بھی ایک مرشد سے بیعت رکھتا ہوں۔ گر استاد کی ہر شخص کو ضرورت ہے تو پیر کی بھی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ پیر اخلاق رزیلہ کو دور کرنے اور اخلاق حسنہ کو حاصل کرنے کے طریقے تعلیم کرتا ہے۔ ایسے پیر بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی روحانی قوت سے مرید کی قلبی کثافتیں دور کر دیں۔"[2]

مولوی احمد علی لاہوری نے لکھا ہے: "نیکی کے جس کام پر بھی مرشد بیعت لینا چاہے، جائز ہے۔"[3]

تبلیغی جماعت کے بزرگ مولوی محمد زکریا صاحب نے لکھا ہے: "مرید ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی نفس و شیطان سے ایسا مغلوب ہے کہ اس کی سازشوں سے خود واقف نہیں ہو سکتا۔ جب تک شریعت و سنت کے پابند واقف کار کے حوالے اپنے آپ کو نہ کریں۔ جیسا کہ بچہ بچپن کی وجہ سے اپنے بھلے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا جب تک اس کو بڑے کی تربیت حاصل نہ ہو اس طرح بڑے ہو کر بھی جس کام سے واقفیت نہ ہو اس کام میں آدمی بمنزلہ بچے ہی کے ہوتا ہے۔ شیخ کی تعلیم سے دین پر چلنا اور سنت کا اتباع آسان ہو جائے گا۔"[4]

جو پیر سنت و شریعت پر عمل کرتا ہو وہ کسی بھی سلسلہ کا ہو، اس سے مرید ہونا چاہیئے۔[5]

یہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام اکابرین دیوبند پیری مریدی کرتے تھے، آج بھی پاک وہند کے اندر ان کی کئی خانقاہیں ہیں جہاں باقاعدہ پیری مریدی ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے پیر و مرشد کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کہتے ہیں خود قرآن وحدیث کے پڑھنے کے لئے بھی استاد کی ضرورت ہوتی ہے، خود بخود نہیں آتا۔ پیر و مرشد

---

[1](فتاویٰ محمودیہ، ۱۳۵ : ۱)

[2](کفایت المفتی، ۷۶-۷۵ : ۲)

[3](رسالہ پیر کے فرائض، صفحہ ٦)

[4](مکتوبات تصوف، ۵ : ۲)

[5](فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ۱۴۴ : ۱)

ہی قرآن وحدیث کے اسرار ورموز بتاتا ہے۔ ہر کام اور ہر علم و فن کے لئے استاد کی ضرورت ہے اور وہ مرشد کامل ہے۔ اور کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اذکار و وظائف کتابوں میں موجود ہیں مرشد کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طب کی کتابوں میں ہر قسم کے نسخے اور دوائیں لکھی ہوئی ہیں۔ آپ جب بیمار ہوتے ہیں تو کسی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کے پاس کیوں جاتے ہیں، خود اپنا علاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جان پیاری و عزیز ہے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے علم پر بھروسہ نہ کیا جائے، بلکہ اچھی طرح چھان بین کر کے کسی ماہر طبیب کو تلاش کر کے علاج کرایا جائے۔ اسی طرح معقولیت کا تقاضا یہی ہے کہ کسی معالج روحانی مرشدِ کامل کو تلاش کر کے اپنی باطنی بیماریوں کا علاج کرایا جائے۔[1]

اگر پیر و مرشد کے ساتھ نسبت و بیعت کے بغیر کچھ حاصل ہوتا تو حضرت داتا گنج بخش، شیخ ابو الفضل بن حسن کے، اور خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ عثمان ہرونی کے اور حضرت مجدد الف ثانی، حضرت خواجہ باقی باللہ کے اور حضرت امام رازی، شیخ نجم الدین کبریٰ کے اور مولانا روم، حضرت شمس تبریزی کے مرید نہ ہوتے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلامے شمس تبریزی نہ شد

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اگر کوئی شعیب میسر آئے شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا (الکھف ۱۷)

ترجمہ: "اور جسے وہ گمراہ کر دیتا ہے تو آپ اس کے لئے نہ پائیں گے کوئی مددگار راہ بتانے والا۔"

معلوم ہوا گمراہ کا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ کوئی مرشد و رہبر اور بزرگ فرماتے ہیں کہ بے پیرے بے نورے ہوتے ہیں۔

عارفین فرماتے ہیں:

ایسے پیر و مرشد سے بیعت کرو

(۱) جس کا عقیدہ درست ہو۔

(۲) جو احکام شریعہ جانتا ہو، تصوف و سلوک کی خبر رکھتا ہو۔

(۳) فرائض وواجبات و سنن پر دائمی عمل کرتا ہو، تمام حرام اور مکروہ چیزوں سے بچتا ہو۔

(۴) اس کی نسبت متصل ہو یعنی اس کے مشائخ کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہو۔

---

[1] (دلائل السلوک، ص ۷۰)

جس پیر میں یہ شرائط نہ ہوں، اس کی ہر گز بیعت نہیں کرنی چاہیئے۔

چوں بسے ابلیس وآدم روئے ہست　　　پس بہر دستے نشاید داد دست

بہت سے ابلیس انسانی شکل میں بھی پھرتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیئے۔

اگر اس دنیا میں رہنا ہے تو کچھ پہچان پیدا کر　　　لباسِ خضر میں سیکڑوں رہزن بھی پھرتے ہیں

وقتی جوش میں آکر مرید نہیں بننا چاہیئے۔ جب تک پوری طرح قلبی لگاؤ نہ ہو۔ دنیا کے گندے کاموں اور سیاست کے لئے اپنے پیر کی شخصیت کو ہر گز استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ پیر و مرشد سے دین و معرفت کی تعلیم حاصل کریں۔

تزکیہ

تزکیہ کے معنی نفس و باطن کو صاف کرنا۔ جب تک باطنی صفائی نہ ہو، عبادت کا لطف اور خشوع حاصل نہ ہو گا۔ صفرا کا بخار یا ٹائنفائڈ ہو، عمدہ سے عمدہ غذا اچھی نہیں لگتی کیونکہ معدے میں اعتدال نہیں رہتا۔ اس خرابی سے آدمی کھانے کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ صفرا بڑھنے سے میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح جس کو خواہشات نفسانی و شیطانی کا بخار ہو عبادت چٹی و تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ جو آدمی بیمار ہوتا ہے پھر حکیم طبیب معدے کی صفائی کرتے ہیں تو بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔ معدے کی غلاظت ختم ہو جاتی ہے تو پھر ہر چیز اچھی لگتی ہے۔

اسی طرح روحانی طبیب اللہ والے نفس و باطن کا علاج کرتے ہیں، توجہ فرماتے ہیں۔ ریاضت کے طریقے ارشاد فرماتے ہیں پھر نفس پاک ہو جاتا ہے، پھر نماز معراج ہو جاتی ہے، روزے رکھنے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، تلاوت و ذکر و تسبیح اور درود شریف پڑھنے سے لطف آتا ہے، ایمانی و روحانی ترقی ہوتی ہے، جس کو بد عقیدگی کا کینسر ہو جائے اللہ والے اس کا بھی علاج کر دیتے ہیں۔ یہ مشائخ طریقت جو باطن کی صفائی کے ماہر ہوتے ہیں ان کو یہ فیض و کمال حضور سید مرسلین ﷺ کے وسیلہ سے ملتا ہے۔

حضور ﷺ بھی تزکیہ فرماتے تھے:

وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ: ۱۵۱)

اور یہ رسول تمہیں پاک وصاف کرتے ہیں اور تمہیں کتاب و حکمت سکھاتے ہیں۔

تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ ساتھ سرکار دلوں کی صفائی بھی فرماتے ہیں کیونکہ جب تک باطن صاف نہ ہو تو ظاہری اعمال کا فائدہ نہیں ہوتا۔ مولوی شبیر عثمانی دیوبندی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: قلب کی صفائی حضور ﷺ کی صحبت قلبی توجہ و تصرف سے باذن اللہ حاصل ہوتی تھی۔ [1]

مولوی عبد الماجد دریا آبادی دیوبندے نے لکھا ہے: رسول کا کام محض تبلیغ وپیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ کتاب کی تعلیم شرح وترجمانی اور حکمت ودانائی کی تلقین بھی کرتا ہے اور رسول مرشدِ اعظم بھی ہوتا ہے۔ دلوں کی صفائی کرتا ہے یہاں سے ان کج فہموں، بدبختوں کی بھی تردید ہوگئی جو رسول کو معاذ اللہ صرف ڈاکیا و قاصد سمجھے ہوئے ہیں۔ [2]

رئیس المحدثین امام ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: حضور ﷺ کے دستِ اقدس کی برکت سے غفلت زائل ہوگئی اور مقام حضور ومشاہدہ حاصل ہوگیا۔ [3]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے سینہ پر بھی نبی کریم ﷺ نے تین دفعہ دست مبارک پھیرا اور دعا فرمائی تو سینہ ایمان کے نور سے روشن ومنور ہوگیا۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا، انہوں نے عرض کی مجھے فیصلے کرنے کا تجربہ نہیں۔ سرکار ﷺ نے اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر پھیر کر فیض دیا، دعا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کے بعد کسی معاملے میں فیصلہ کرنے میں مجھے ذرہ بھر بھی شبہ نہ ہوا۔ [4]

نبی پاک ﷺ کی امت کے اولیاء وصالحین اسی طرح اپنے مریدوں کے سینوں میں فیض دیتے ہیں۔ ایک صاف آئینہ آپ سورج کے سامنے رکھیں تو اس میں آفتاب کے انوار و شعاعیں نظر آئیں گی، پھر کئی اور آئینے سمتیں درست کر کے اس آئینہ کے سامنے رکھ دیں جو براہ راست آفتاب سے روشنی لے رہا ہے تو سب آئینوں میں آفتاب کے انوار نظر آئیں گے۔ پس اس مثال سے سمجھ لیجئے کہ مرشد کامل آفتابِ نبوّت سے فیوضات و انوار لیتا ہے، پھر اپنے مریدین کے قلوب تک ان انوار کو پہنچاتا ہے۔ [5]

---

[1] (تفسیر عثمانی صفحہ ۱۲۳)

[2] (تفسیر ماجدی، ۱:۵۱)

[3] (مرقات شرح مشکوٰۃ، ۵:۱۸)

[4] (مستدرک امام حاکم، ۳:۱۳۵)

[5] (بحوالہ رسائل خمسہ ص ۳۱۶ تا ۳۲۶)

بیعت کا ثبوت قرآن، سنت اور کلامِ مشائخ سے

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (الممتحنہ ۱۲ ۲۸)

ترجمہ: ”اے غیب کے جاننے والی نبی (مکرم) جب حاضر ہوں آپ کی خدمت میں مؤمنہ عورتیں تاکہ آپ (ﷺ) سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ بچوں کو قتل کریں گی اور نہیں لگائیں گی جھوٹا الزام جو انہوں نے گھڑ لیا ہو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان اور آپ (ﷺ) کی نافرمانی نہیں کریں گی کسی نیک کام میں، تو (اے محبوب) انہیں بیعت فرمالیا کریں۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کا عورتوں سے بیعت صرف کلاماً تھی، (بیعت کے لئے) کسی عورت کا ہاتھ نہ چھوا۔

ولما فرغ من هجرة المكان ذكر هجرة الافعال فقال (يا ايها النبى) الذى له الاطلاع المبشر لضمان الثواب والمغفرة (اذا جاءک المؤمنات يبايعنک) لضمان الثواب والمغفرة (على) اعمال القلب (لا يشركن بالله شيئا و) اعمال البدن بشهوة البطن (لايسرقن) لشهوة الفرج الحاصلة من شهوة البطن (لايزنين) وللغضبية المتعلقة بماحصل من شهوة الفرج (ولا يقتلن اولادهن ولا يأتين ببهتان يفترينه) اى يختلقنه فى الولد لان تقول لزوجها هذا ولدى منک يستقطنه عليهم من مواقعتهم اياهن لمصيرهم (بين ايديهن وارجلهن ولا يعصينک فى) امرک اياهن بفرض (معروف) عن فريضة (فبايعهن) على ضمان الثواب والمغفرة على استغفارهن عن اضداد ما ذكر (واستغفرلهن الله) فانه تعالىٰ يحقق الضمان ايضا (ان الله غفور) لمن استغفر له (رحيم) بالثواب والمغفرة لمن ضمنه تبصير الرحمن۔ (ممتحنة جلد ۲ ص ۳۳۸)

ترجمہ: ہجرۃ مکان کا تذکرہ کرنے سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہجرت افعال کا ذکر فرمایا اللہ نے فرمایا اے نبی ﷺ! (وہ نبی جسے اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب و مغفرت کی بشارت دینے والا بنایا) جب مؤمن عورتیں ثواب و اجر کے حصول اور اعمال قلبیہ پر آپ (ﷺ) سے بیعت لینے آئیں یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھرائیں گی (اور شہوت بطن کا اعمالِ بدن کے ساتھ) چوری نہیں کریں گی۔ (اور شہوت فرج جو شہوت بطن سے حاصل ہوتی ہے، جیسے) زنا نہیں کریں گی، اور وہ غضب و غصہ جو شہوت فرج سے متعلق ہے جیسے اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور جھوٹا (گھڑا ہوا) الزام نہیں لگائیں گی، یعنی کسی نوزائیدہ بچے کو اچک کر اپنی گود میں ڈال لینا اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ میرا بچہ ہے، اسی طرح بدکاری سے جو حمل قرار پائے، اسے اپنے خاوند کی طرف منسوب کر دینا، ایسا نہیں کریں گی نیز یہ کہ فرائض یعنی اوامر من جانب اللہ میں آپ (ﷺ) کی

نافرمانی نہیں کریں گی، تو اے حبیب ﷺ! آپ (ﷺ) مغفرت و ثواب کے ضمان پر ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں کیونکہ آپ (ﷺ) کے ضمان مغفرت کو محقق کرنا بھی اللہ کا کام ہے، اس لئے کہ جو مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو بے شک میں (اللہ) ان کے گناہوں کو بخشنے والا مہربان ہوں۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (سورۃ الفتح پارہ ۲۶ آیت ۱۰)

ترجمہ: اے پیارے نبی ﷺ) بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا دستِ قدرت ان کے ہاتھوں پر ہے، پس جس نے توڑ لیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہے اور جس نے ایفا کیا عہد کو جو اس نے اللہ تعالیٰ سے کیا تو وہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا (الفتح ۱۸)

ترجمہ: یقیناً اللہ راضی ہو گیا ان مؤمنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی، اس درخت کے نیچے، پس اسے معلوم ہے جو ان کے دلوں میں تھا پس اس نے ان پر اطمینان اتارا اور (بطور انعام) انہیں یہ فتح بخشی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (سورۃ المائدۃ: ۳۵)

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (الاحزاب ۳۶)

ترجمہ: اور نہ کسی مؤمن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مؤمنہ عورت کو کہ جب فیصلہ فرمادے اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) کسی معاملہ میں تو انہیں اپنے معاملہ میں کچھ اختیار رہے، پھر جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبۃ ۱۱۹)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (الانبیاء ۷)

ترجمہ: ”اور اہل ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔“

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (لقمان ۱۵)

ترجمہ: "ان کی راہ چلو جو میری طرف متوجہ ہوئے۔"

ان تمام آیات سے بھی علمائے کرام نے طلبِ مرشد اور مرشد سے وابستگی پر استدلال کیا ہے۔

بیعت ہونا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طریقہ ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے قبولِ اسلام، تجدید ایمان، خلافت اور دیگر امور کے لئے بھی رسول اللہ ﷺ سے بیعت لی جو کہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔

(۱) عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها قالت کان رسول الله ﷺ یبایع النساء بالکلام بهذه الایة (لایشرکن بالله شیئا) قالت و مامست ید رسول الله ﷺ الا امراة یملکها۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ یہ آیت مبارکہ **(لا یشرکن بالله)** پڑھ کر عورتوں سے زبانی بیعت لیتے تھے، نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں نے کبھی کسی عورت (کے ہاتھ) کو نہ چھوا۔ سوائے اپنی مملوکہ کے۔[1]

(۲) عن عائشة رضی الله عنها قالت فمن اقر بهذا (الشرط) من المؤمنات قال لها رسول الله ﷺ قد بایعتک کلاما و لا والله ما مست ید رسول الله ﷺ ید امراة قط فی المبایعة ما یبایعهن الا بقول قد بایعتک علی ذالک (بمعناه)۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مؤمن عورتوں میں سے جو بھی مذکورہ بالا شرائط کا اقرار کر لیتی تو حضور پرنور ﷺ اس سے فرماتے کہ میں نے تجھ سے کلاما بیعت لے لی، اللہ کی قسم! حضور پرنور ﷺ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ نہ چھوا مگر یہ کہ حضور پرنور ﷺ کی بیعت عورتوں سے صرف زبانی ہوتی تھی۔[2]

(۳) عن اسماء بنت یزید بن سکن انما قالت انا من النسوة البیعة التی اخذ علیهن رسول الله ﷺ و کنت جاریة باکرة جریة علی مسئلة فقلت یا رسول الله ﷺ ابسط یدک حتی اصافحک فقال لا اصافح النساء ولکن اخذ علیهن ما اخذ الله علیهن۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ان خواتین میں سے ہوں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بیعت کی تھی، اس وقت عالم شباب تھا اور مسائل پوچھنے میں جرأت سے کام لیتی تھی (جب حضور ﷺ خواتین سے بیعت لے رہے تھے) تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہاتھ آگے لائیں تاکہ میں مصافحہ کر کے آپ ﷺ کی بیعت

---

1 (رواه البخاری ج۲ باب بیعة النساء ص ۱۰۷۱)

2 (مسلم جلد ثانی صفحة ۱۳۱ رواه البخاری جلد ۲ ص ۱۰۷۱)

کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں (عورتوں سے) مصافحہ نہیں کرتا، ہاں جو عہد و پیمان (عورتوں) سے اللہ تعالیٰ نے لیا ہے وہی میں (زبانی) لیتا ہوں۔[1]

(۴) عن محمد بن المنکدر عن امیمة قالت اتیت النبی ﷺ لِأُبایعه فقال انی لست اصافح النساء (ای الا جنبیات)۔۔وروی احمد عن ابن عمر انه ﷺ کان لا یصافح النساء فی البیعة (ای فی بیعة النساء) التی یتضمنها قوله تعالیٰ یایها النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک۔

ترجمہ: محمد بن منکدر رضی اللہ عنہ حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی کہ آپ ﷺ سے ہاتھ ملا کر بیعت کروں مگر حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا کہ میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔[2]

سیدنا احمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور پُر نور ﷺ نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت کبھی ہاتھ نہیں ملایا وہ بیعت جو آیت مذکورہ یعنی یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ إِذَا جَاءَکَ الْمُؤْمِنَاتُ الی اخرہ۔ کو متضمن ہے۔

(۵) عن عروة رضی اللہ تعالیٰ عنه ان عائشة رضی اللہ عنها اخبرته عن بیعة النساء قالت ما مس رسول اللہ ﷺ بیده امراۃ قط الا ان یاخذ علیها فاذا اخذ علیها فاعطته قال اذهبی فقد بایعتک۔

ترجمہ: حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا خواتین سے بیعت لینے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ (بوقت بیعت) نبی کریم ﷺ نے کسی عورت کا ہاتھ نہ چھوا، سوائے اس کے کہ حضور پُر نور ﷺ ان سے عہد و پیمان لیتے جب عہد و پیمان لے لیتے تو فرماتے اب چلی جاؤ میں نے تم سے بیعت لے لی۔[3]

حضرت امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

قال النووی هذا الاستثناء منقطع وتقدیر الکلام ما مس امراۃ قط لکن یاخذ علیها البیعة بالکلام فاذا اخذها بالکلام قال اذهبی فقد بایعتک وهذا التقدیر مصرح به فی الروایة الاولیٰ ولا بدمنه۔

---

[1] (رواہ الطبرانی فی معجم الکبیر والبخاری ج ۲ ص ۷۱)
[2] (شرح القاری للفقه الاکبر: ص ۱۱۰، نسائی جلد ۲ س ۱۶۴)
[3] (رواہ مسلم ج ۲ ص ۱۳۱، احکام القران ج ۳ ص ۵۳۷)

ترجمہ: اس حدیث میں جو استثناء آیا ہے وہ استثناء منقطع ہے، سو اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور پُر نور ﷺ نے کبھی کسی (اجنبی) عورت کو نہ چھوا، بلکہ بیعت لیتے وقت صرف زبانی عہد و پیمان لیا کرتے تھے۔۔۔ پھر فرماتے کہ اب جاؤ میں نے تم سے بیعت لے لی۔[1]

(۶) عن ام عطیۃ قالت بایعنا رسول اللہ ﷺ فقرأ لا یشرکن باللہ شیئا و نہانا عن النیاحۃ فقبضت امرأۃ منا یدھا فقالت فلانۃ اسعدتنی فانا ارید ان اجزیھا فلم یقل شیئا فانطلقت ثم رجعت فبایعھا۔

ترجمہ: ”حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی (بیعت کے وقت) حضور نبی کریم ﷺ نے یہ آیت مبارک پڑھی۔ **لا یشرکن باللہ شیئا۔** اور ہمیں نوحہ کرنے سے منع فرمایا تو ہم میں سے ایک عورت نے یہ کہہ کر ہاتھ واپس کھینچ لیا کہ (زمانہ جاہلیت میں) ایک عورت نے میرے ساتھ اسعاد کیا ہے (اسعاد کا مطلب ہے میت کے گھر والوں کے ساتھ چیخنے چلانے میں مدد دینا) میں چاہتی ہوں کہ اس کا بدلہ اتار دوں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے (یہ کلمات سن کر) خاموشی اختیار فرمائی (مگر یہ خاموشی اسعاد کے جواز کے لئے نہ تھی بلکہ شفقتِ امت کے لئے تھی) اور وہ عورت چلی گئی، حتیٰ کہ پھر لوٹ آئی اور نبی کریم ﷺ سے بیعت کی۔“

(۷) عن انس ان رسول اللہ ﷺ اخذ علی النساء حین بایعھن ان لا ینحن فقلت یا رسول اللہ ﷺ! نساء اسعدتنا فی الجاھلیۃ فنسعدھن فقال رسول اللہ ﷺ لا اسعاد فی الاسلام۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت عورتوں سے بیعت لے رہے تھے، تو یہ عہد و پیمان بھی لیا (کہ تم) نوحہ نہ کروگی، میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ زمانہ جاہلیت میں ایسی خواتین تھیں، جنہوں نے ہمارے میتوں پر ہمارے نوحہ میں ہماری امداد کی تھی (نوحہ، میت پر رونا چیخنا چلانا)، سو ہم چاہتے ہیں کہ ان کا یہ بدلہ اتار دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا (خبردار) اسلام میں اسعاد نہیں۔[2]

(۸) عن اسید ابن ابی اسید عن امرأۃ من المبایعات قالت کان فیما اخذ علینا رسول اللہ ﷺ ان لا نعصیہ فیہ ان لا نخمش وجھا و لا ندعوا ویلا و لا نشق جیبا و لا ننشر شعرا۔

ترجمہ: ”حضرت اسید ابن ابی اسید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک خاتون جس نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی، نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہم سے جو عہد و پیمان لیا تھا، وہ یہ تھا کہ ہم اشیاء معہودہ (جن کا عہد لیا گیا میں سے یہ بھی تھا) کہ ہم

---

[1] (نووی مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۳۱، احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۳۷)

[2] (رواہ نسائی، جلد ۲ صفحہ ۱۶۳)

رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں کریں گے اور (کسی مصیبت کے وقت) واویلا نہیں کریں گی، اور اپنے گریبان چاک نہیں کریں گی اور نہ ہی (مصیبت کے وقت) اپنے بال بکھیریں گی۔"[1]

(۹) عن عبادۃ ابن الصامت یقول قال لنا رسول اللہ ﷺ و نحن فی مجلس تبایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئا و لا تسرقوا و لا تزنوا و لا تقتلوا اولادکم و لا تأتوا ببھتان تفترونہ بین ایدیکم و ارجلکم و لا تعصونی فی معروف فمن وفیٰ منکم فاجرہ علی اللہ و من اصاب من ذلک شیئا فعوقب بہ فی الدنیا فھو کفارۃ لہ و من اصاب من ذالک شیئا فسترہ اللہ فامرہ الی اللہ ان شاء عاقبہ و ان شاء عفیٰ عنہ فبایعناہ علی ذالک۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے اس بات پر بیعت کر لو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ٹھراؤ گے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے، الزام تراشی سے باز رہو گے، نیک کاموں میں میری نافرمانی نہیں کروگے، سو جس نے اس عہد و پیمان کو پورا کیا اس کو اللہ تعالیٰ اجر دے گا اور اگر کسی سے امر بیعت میں خطا ہوگئی اور دنیا میں اسے سزا ملی تو یہی اس کا کفارہ بن جائے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائی تو پس اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، چاہے تو عذاب دے، چاہے تو معاف فرمادے۔ سو ہم نے رسول اللہ ﷺ کی ان شرائط مذکورہ پر بیعت کرلی۔[2]

(۱۰) عن عبادۃ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال بایعنا رسول اللہ ﷺ علی السمع و الطاعۃ فی العسر و الیسر و المنشط و المکرہ و الاثرۃ علینا و ان لا ننازع الامر اھلہ۔

ترجمہ: حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی ان باتوں پر: کہ خوشی ہو یا غم، تنگ دستی ہو یا خوش حالی، ہم آزاد ہوں یا مجبور، ہمیشہ آپ ﷺ کے ارشادات کو سنیں گے اور عمل کریں گے، نیز ہم کسی بھی شخص کو اس کے منصب سے نہیں ہٹائیں گے جو اس منصب کا اہل ہو۔[3]

(۱۱) حضرت شداد بن اوس اور عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال کنا عند رسول اللہ ﷺ فقال ھل فیکم غریب (یعنی اھل الکتاب) قلنا لا یا رسول اللہ ﷺ فامر بغلق الباب فقال ارفعوا ایدیکم فقولوا لا الہ الا اللہ فرفعنا ایدینا ساعۃ ثم وضع رسول اللہ ﷺ یدہ ثم قال الحمد للہ اللھم انک بعثتنی بھذہ الکلمۃ و امرتنی بھا و وعدتنی علیھا الجنۃ انک لا تخلف المیعاد ثم قال ابشروا فان اللہ غفر لکم۔

---

[1] (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۹۱، خازن، جلد ۴ صفحہ ۲۶۱)

[2] (رواہ البخاری: ج ۲ ص ۱۰۷۱، جمل جلد ۴ ص ۳۳۲، نسائی جلد ۲ ص ۱۶۲)

[3] (نسائی ج ۲ ص ۱۶۳، اثبات البیعت ص ۲۰)

ترجمہ: ان دونوں نے کہا کہ ایک روز ہم بار گاہ رسالت ﷺ میں حاضر تھے، کہ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا تم میں کوئی بے گانہ (اہل کتاب) تو نہیں، ہم نے نفی میں جواب دیا۔ ارشاد فرمایا دروازہ بند کر دو اور اپنے ہاتھ بلند کر دو اور کہو **لا الہ الا اللہ** ایک گھڑی ہم نے اپنے ہاتھوں کو بلند رکھا پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک نیچے فرمایا۔ اور گویا ہوئے الحمد للہ اے اللہ تو نے مجھے اس کلمہ کے ساتھ مبعوث فرمایا اور اس کلمہ کا حکم دیا اور میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ جو اس کلمہ پر پکارے گا وہ جنت میں داخل ہو گا اور تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا پھر فرمایا اے فرزندانِ اسلام، تمہیں خوشخبری ہو، اللہ تعالیٰ نے تم سب کو معاف فرمادیا ہے۔[1]

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمۃ نے روایت نقل کی:

عن جریر بن عبداللہ البجلی قال بایعت رسول اللہ ﷺ علی اقامۃ الصلوۃ و ایتاء الزکوۃ و النصح لکل مسلم۔

"حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کا خیر خواہ رہنے پر۔"[2]

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے روایت نقل کی ہے کہ محمد بن قرظی وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ: "حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے **لیلۃ العقبہ** میں بیعت کے وقت رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپ ﷺ جو چاہیں اپنے رب کے لئے اور اپنے لئے شرط عائد کر دیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اپنے رب کے لئے شرط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لئے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میری بھی ایسی حفاظت کرو جس طرح تم اپنے جان ومال کی حفاظت کرتے ہو۔" بیعت کرنے والوں نے عرض کی: "جب ہم اس حکم کو بجالائیں گے تو ہمیں کیا ملے گا؟" تو آقا ﷺ نے فرمایا: "جنت" وہ کہنے لگے کہ "بڑا نفع بخش سودا ہے ہم اس سے انحراف نہیں کریں گے اور نہ ہی عہد شکنی۔"

اس پر یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۱)

یعنی بے شک اللہ نے خرید لی مسلمان کی جان اور مال جنت کے بدلے۔[3]

---

[1] (بحوالہ ضیاء القرآن، تعلیق، مترجم)

[2] (صحیح بخاری، جلد اول کتاب الایمان، باب ۴۲، حدیث ۵۵، ص ۱۲۸)

[3] (تفسیر القرآن العظیم، جلد دوم، سورۃ التوبہ، صفحہ ۲۶۵-۲۶۶)

امام مسلم بن الحجاج القشیری علیہ الرحمۃ نے روایت نقل کی ہے:

عن عبادہ بن الصامت قال کنا مع رسول اللہ ﷺ فی مجلس فقال تبایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً و لا تزنوا و لا تسرقوا و لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق فمن و فی منکم فاجرہ علی اللہ۔

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مجلس میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "تم لوگ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، چوری نہیں کروگے، اور جس شخص کا قتل اللہ نے حرام کر دیا ہے، اس کو بے گناہ قتل نہیں کروگے سو تم میں سے جس نے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے۔"[1]

اس حدیث کے تحت مولوی زکریا مہاجر مدنی نے لکھا ہے: یہ بیعت نہ بیعت اسلام ہے، نہ بیعت جہاد، بلکہ وہی بیعت صوفیاء ہے جو امورِ اسلام پر تاکید کے واسطے کی گئی۔[2]

بیعت کا شرعی مقام

آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت پاک کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیعت کا موجودہ طریقہ سنت رسول ﷺ سے ماخوذ ہے۔ یہ عمل کوئی بدعت یا خلافِ شرع بات نہیں بلکہ سراسر سنت کے مطابق ہے۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے براہ راست رسولِ خدا ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعت کی۔[3]

بیعت ہونا سنتِ صحابہ بھی ہے اور اولیاء اللہ کا طریقہ بھی، جو بیعت ہو کر مقربین الٰہی میں شامل ہوئے، جبکہ بعض صوفیاء کے نزدیک بیعت ہونا واجب ہے۔[4]

شیخ سہروردی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے: "میں نے بہت مشائخ سے سنا ہے کہ جس نے کسی فلاح پانے والے کی زیارت نہیں کی وہ فلاح نہیں پائے گا۔"

ان عبارات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے کسی پیر کی بیعت کرنا نہایت ضروری ہے۔

---

[1] (صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب الحدود، باب ١٠، حدیث ٤٤٣٦، ص ٤٨٨، ٤٨٩)

[2] (شریعت و طریقت کا تلازم، ص ١٢٨)

[3] (تعلیماتِ اسلام (احسان) ص ٦١)

[4] (تحقیق حق، ص ٣٦)

حضور غوث پاک علیہ الرحمہ کا فرمان ہے: "مشائخ کرام ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اور رہنما ہیں، اور یہی وہ دروازہ ہے جس سے داخل ہو کر انسان خدا تک پہنچتا ہے، لہٰذا ہر مرید کے لئے ایک شیخ کا ہونا ضروری ہے۔"[1]

یعنی سلسلۂ طریقت میں بیعت ہونا ضروری ہے۔ ان تمام دلائل و براہین سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ: "بیعت ایک مبارک اور مستحسن فعل ہے، اور اصلاحِ باطن اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، اور اس کو محض تعصب و عناد کی بنیاد پر بدعت و شرک کہنا صریح گمراہی اور جہالت ہے۔"

بیعت کس سے کی جائے:

اب جبکہ ہمیں بیعت کی شرعی حیثیت اور اس کا جواز معلوم ہو گیا تو اس بات کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ بیعت کس سے کی جائے اور پیر و مرشد میں کن خصوصیات کا پایا جانا بہت ضروری ہے، ذیل میں ہم اس موضوع پر بات کرتے ہیں:

امام غزالی علیہ الرحمۃ روایت نقل کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الشیخ فی الجماعۃ کالنبی فی الامۃ۔

یعنی شیخ اپنی جماعت میں ایسا ہے جیسے نبی اپنی امت میں۔[2]

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

مرشد کے لئے چار شرائط ہیں جس شخص میں یہ چار شرائط نہ ہوں اس کی بیعت کرنا جائز نہیں:

۱) مسلمان ہو اور صحیح العقیدہ ہو (بد عقیدہ و بد مذہب نہ ہو)۔

۲) عقائد کے دلائل اور تمام احکام شرعیہ کا عالم ہو حتیٰ کہ ہر پیش آمدہ مسئلہ کا حل بیان کر سکتا ہو۔

۳) علم کے مطابق عمل کرتا ہو، فرائض و واجبات، سنن اور مستحبات پر دائمی عمل کرتا ہو اور تمام مکروہات و ممنوعات سے بچتا ہو۔

۴) رسول اللہ ﷺ تک اس کی نسبت متصل ہو یعنی اس کے مشائخ کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہو۔[3]

---

1 (غنیۃ الطالبین ص ۲۲۷)

2 (احیاء العلوم، بحوالہ امداد السلوک، ص ۲۱)

3 (فتاویٰ افریقہ بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۸۶۹)

مفتی محمد خلیل خان قادری برکاتی علیہ الرحمۃ نے مرشد کی چوتھی شرط زائد یوں بتائی ہے کہ:

"فاسق معلن نہ ہو، یعنی اعلانیہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو اور نہ کسی گناہ صغیرہ پر مصر کہ باوجود علم و تنبیہ اسی گناہ پر اڑا رہے۔"[1]

مفتی صاحب کے اس قول کو باآسانی یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس شرط کا اگرچہ اتصال سے تعلق نہیں کیونکہ مجرو فاسق باعث فسخ نہیں، مگر پیر کی تعظیم لازمی ہے اور فاسق کی توہین واجب، اور دونوں کا ایک جگہ میں پایا جانا باطل ہے۔ اس لئے پیر کا فسق سے بچنا لازم ہے۔

آیہ کریمہ یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصدقین کے تحت حضرت علامہ ابو الفضل اٰلوسی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

وجوز ان یکون لھم ولغیرھم فیکون المراد بالصادقین الذین صدقوا فی الدین نیۃ وقولا وعملا۔

یعنی "اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب عام ہو اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب کو شامل ہو اور صادقین سے مراد وہ لوگ ہوں جو دین میں نیت کے لحاظ سے بھی سچے ہوں اور عمل کے اعتبار سے بھی سچے ہوں اور کلام کے لحاظ سے بھی سچے ہوں۔"[2]

شارح مشکوۃ شریف حضرت علامہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ شیخ المشائخ حضرت تورپشتی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حقیقۃ الفقہ فی الدین ما وقع فی القلب ثم ظھر علی اللسان فافاد العمل وأورث الخشیۃ والتقوی واما الذی یتدارس ابوابا منہ لیتعزز بہ ویتأکل بہ فانہ بمعزل عن الرتبۃ العظمی لان الفقہ تعلق بلسانہ دون قلبہ ولھذا قال علی رضی اللہ عنہ ولٰکنی أخشی علیکم کل منافق علیھم اللسان۔

یعنی "علم وہ ہے جو پہلے دل میں داخل ہو اس کے بعد زبان پر ظاہر ہو پھر اس سے عمل کا فائدہ حاصل ہو خشیۃ خدا پیدا ہو۔ تقویٰ پرہیز گاری پیدا ہو، لیکن جو شخص علم عزت حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے یا ذریعہ معاش بنانے کے لئے پڑھتا ہے وہ اس بلند مرتبہ سے بہت دور ہے کیونکہ فقہ یعنی علم کا تعلق اس کی زبان سے تو رہا لیکن اس کے دل میں علم نہیں آیا، اسی لئے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے لیکن میں بہت ہی ڈرتا ہوں تمہارے لئے ہر اس منافق سے جو زبان کا بڑا علامہ ہو۔"[3]

بلکہ حق تو یہ ہے کہ ایسے آدمی کو عالم اور اس کے علم کو علم دین کہنا ہی درست نہیں ہے۔

---

[1] (سنی بہشتی زیور، ص۱۰۸، ۸۶۲)

[2] (روح المعانی ج ۱۱ ص ۴۱، مطبوعہ مصر)

[3] (مرقات شرح مشکوۃ ص ۲۳۴، ج ۱)

چنانچہ حضرت علامہ ملا علی قاری قدس سرہ نے مرقاۃ شرح مشکوۃ شریف کے کتاب العلم کی ابتداء میں علم کی تعریف ان الفاظ سے بیان فرمائی ہے:

والعلم نور فی قلب المؤمن مقتبس من مصابیح مشکوۃ النبوۃ من الاقوال المحمدیۃ والافعال الاحمدیۃ والاحوال المحمودیۃ یهتدیٰ بہ الی اللہ وصفاتہ۔ وافعالہ واحکامہ فان حصل بواسطۃ البشر فهو کسبی والا فهو العلم اللدنی المنقسم الی الوحی والالهام والفراسۃ۔

”حضور اکرم شفیع محتشم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کے نبوی چراغ سے جلائی ہوئی روشنی کا نام علم ہے، اگر یہ علم انسانی واسطہ سے حاصل ہو تو علمِ کسبی کہلائے گا ورنہ علم لدنی ہے جس کی اقسام ہیں وحی، الہام اور فراست۔“[1]

علم حاصل کرنے کے متعلق نبی کریم رؤف رحیم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ وواضع العلم عند غیر اهله کمقلد الخنازیر الجوهر واللؤلؤ والذهب رواہ المشکوۃ۔

”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان مرد و عورت پر علم کی طلب کرنا فرض ہے اور نااہل کو علم سکھانا خنزیر کو جواہر سونے اور موتیوں کا ہار پہنانے کے برابر ہے۔“ (مشکوٰۃ)

اس حدیث پاک کے ماتحت حضرت ملا علی قاری قدس سرہ نے فریضۃ کی تشریح کرتے ہوئے کئی ایک مرادیں ذکر کی ہیں مثلاً یہاں پر فرضی علم سے مراد علم اخلاص ہے یا آفات نفس کا پہچاننا۔ یا جو امور اعمال کے فساد کا باعث بنیں ان کا جاننا مراد ہے یا اس سے نماز کی فرضیت جاننا مراد ہے، ان کے علاوہ ایک مراد یہ بھی لکھی ہے:

قیل هو طلب علم الباطن وهو مایزداد بہ العبد یقینا وهو الذی یکتسب بصحبۃ الصالحین والزهاد المقربین فهم ورّاث الانبیاء صلوات اللہ وسلام علیهم اجمعین۔

”کہا گیا ہے کہ علم فرضی سے مراد باطن کا علم ہے جس کے ذریعے انسان کا یقین بڑھتا ہے اور یہ وہ علم ہے جو بزرگوں زاہدوں کی صحبت سے حاصل کیا جاتا ہے اور یہی لوگ (صوفیا کرام) انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے حقیقی ورثاء ہیں۔“[2]

اسی آیت (یاایها الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین) کے تحت حضرت علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ثم الصادقون هم المرشدون الی طریق الوصول فاذا کان السالک فی جملۃ احبابهم ومن زمرۃ الخدام فی عتبۃ بابهم فقد بلغ بمحبتهم وتربیتهم وقوۃ ولایتهم الی مراتب فی السیر الی اللہ وترک ماسواہ قال حضرت الشیخ الاکبر

---

[1] (مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱ ص ۲۱۷)

[2] (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح شریف ج ۱ ص ۲۳۳)

قدس سرہ الاظھر ان لم تجد افعالک علی مراد غیرک لم یصح لک انتقال عن وھاک ولو جاھدت نفسک عمرک فاذا وجدت من یحصل فی نفسک حرمتہ فاخدمہ وکن میتا بین یدیہ یصرفک کیف یشاء لاتدبیر لک فی نفسک معہ توش سعیدا مبارزا الامتثال ما یامرک بہ وینھاک عنہ فان امرک بالحرفۃ فاحترف عن امرہ لاعن ھواک فھو اعرف بمصالحک منک فاسع یابنی فی طلب شیخ یرشدک ویعصم خواطرک حتی تکمل ذاتک بالوجود الالھی۔[1]

ترجمہ: صادقین سے مراد راہ حق دکھانے والے بزرگانِ دین ہیں تو جب سالک ان کے احباب میں سے ہو جائے گا، ان کی چوکھٹ پر رہنے والے درباریوں میں سے ہو جائے گا تو اس کے بعد سالک ان بزرگوں کی محبت، ان کی تربیت اور ان کی ولایت کی طاقت کے زور سے سیر الی اللہ کے مراتب کو پہنچے گا اور ماسوا اللہ کو چھوڑ دے گا۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہ فرماتے ہیں جب تک تو اپنے کاموں کو کسی دوسرے (یعنی کسی بزرگ) کے ارادے کے مطابق نہیں پائے گا تب تک تو اپنی خواہشات نفسانیہ سے جدا نہیں ہو سکتا خواہ اپنی پوری زندگی نفس کو مجاہدات میں رکھے لہٰذا جس بزرگ کی عزت تیرے دل میں ہو تو اس کی خدمت کر، اس کے سامنے مردہ کہ طرح بے اختیار ہو جا جس طرح چاہے تجھے پھیرتا رہے اپنے متعلق تیری کوئی بھی رائے نہ ہو تب ہی تو نیک بخت ہو کر زندگی بسر کرے گا اور پیر کے امر و نہی کی جلد تعمیل کرے گا۔ پس اگر پیر تجھے کسی پیشے کا حکم کرے تو وہ کاروبار بھی پیر کے حکم کی وجہ سے کر، اپنی خواہش سے نہیں، کیونکہ وہ تجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے کہ یہ بات تیرے فائدہ کی بات ہے یا نہیں اس لئے اے صاحبزادے ولی کامل کی طلب میں کوشش کر جو کہ تجھے ہدایت کے راستے پر چلائے، تیرے قلبی احوال کی نگرانی کرے یہاں تک کہ تیرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمال تعلق پیدا ہو جائے۔"[2]

حضرت امام ربانی مجدد منور الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ پیر مغان کی طلب، ضرورت اور اطاعت کے متعلق فرماتے ہیں:

بعد از حصول این دو جناح اعتقادی و عملی متوجہ عروج مدارجِ قرب ایزدی گردد جل شانہ وطالب قطع منازل ظلمانی و مسالک نورانی باشد۔ لیکن بداند کہ این قطع منازل وعروج مدارج وابستہ بتوجہ و تصرفِ شیخِ کامل مکمل راہ دان راہ بین راہ نما است کہ نظر او شافی امراض قلبیہ است و توجہ او دافع اخلاق ردیئہ نامرضیہ پس اول طلبِ شیخ نماید اگر بہ محض فضلِ خداوندی جل شانہ شیخ را باو دانانند معرفتِ شیخ را نعمتِ عظمیٰ تصور کردہ خود را ملازم او سازد۔ وتمام منقادِ

---

[1] (روح البیان ج ۱ ص ۹۶۷)

[2] (روح البیان ج ۱ ص ۹۶۷)

تصــرفــاتِ او گردد و شیخ الاسلام میفرماید الٰہی چیست اینکہ دوستانِ خود راکردی کہ ہر کہ ایشانرا شناخت ترا یافت وتاترانیافت ایشانرانہ شناخت اختیار خودرا بالکلیہ دراختیار شیخ گم کند وخودرااز جمیع مرادات تہی ساختہ کمر ہمت را در خدمت او بندو بہ ہر چہ شیخ اورا امر فرماید سرمایۂ سعادتِ خودرادران دانستہ درامتثال آن بجان سعی نماید۔

ترجمہ: اعتقاد اور عمل حاصل کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے قرب کی سیڑھیوں پر چڑھنے کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے، تاریکی اور روشنی کی منزلوں اور راستوں کے طے کرنے کی طلب کرنا چاہیئے۔ لیکن یاد رکھیں کہ ان منزلوں کا طے کرنا، ان درجوں پر فائز ہونا پیر کامل کی توجہ اور تصرف سے وابستہ ہے جو خود بھی کامل ہو دوسروں کو بھی کامل بناتا ہو، راہِ حق کا جاننے والا دیکھنے والا اور دکھانے والا ہو۔ ایسے پیر کی نظر دل کی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ برے اور ناپسندیدہ اخلاق اس کی توجہ مبارک سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے پیر کامل کی معرفت اپنے لئے نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر ہمیشہ اسی کی خدمت میں رہے اور پوری طرح اس کے فرمانوں کا تابع رہے۔ شیخ الاسلام ہروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "یا الٰہی یہ کیا بات ہے تو نے اپنے دوستوں کو کیا بنا دیا ہے کہ جس نے ان کو پہچانا خدا کو پایا اور جب تک تجھے نہ پایا ان کو نہ پہچانا۔" اور اپنے اختیار کو کلی طور شیخ کے اختیار میں گم کر دے، اور اپنے آپ کو تمام مرادوں سے خالی کر کے کمر ہمت باندھ کر اس کی خدمت کر اور جو کچھ شیخ ارشاد فرمادے اس کو اپنی سعادت کا سرمایہ جان کر اس کے بجالانے میں جان سے کوشش کرے۔ غرض یہ کہ ہر ایک انسان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت حاصل کرے اور اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ شیخ کامل کا دامن تھام لے اس کی خدمت و غلامی کو اپنے لئے دنیا و آخرت کی سعادت سمجھے اور اس کے کسی بھی قول و فعل پر اعتراض نہ کرے کیونکہ راہِ حق میں اعتراض کرنا اپنے شیخ کی عیب جوئی کرنا محرومی کی دلیل ہے۔[1]

کار درویشی ورائے کارہاست — دمبدم از حق مرایشانرا عطاست
گرتن خاکی غلیظ وتیرہ است — صیقلے کن زانکہ صیقل گیراست
نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باشی اگر اہل دلی
رو بجو یارِ خدائی را تو زود — چوں چنین کردی خدا یارِ تو بود

یعنی "اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کے کاروبار عام عقل و فہم سے بالاتر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو راز و اسرار ہر وقت ان کو حاصل رہتے ہیں اس سے ظاہر بین لوگ بے خبر ہوتے ہیں، اس لئے اے مخاطب اگر تیرا باطن تاریک میل کچیل سے

[1] (مکتوبات شریف، مکتوب ۲۸۶، دفتر ا، حصہ ۵ ص ۵۱ تا ۵۲)

بھرا ہوا ہے تو تو جلدی اسے قلعی کرالے اس میں قلعی کے اثر قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اور قلعی گر اللہ والے بھی موجود ہیں، اولیاء اللہ کے چہروں سے اللہ تعالیٰ کا نور ٹپکتا ہے یہ نور مخلصوں ہی کو نظر آتا ہے مخالفوں کو نہیں۔ یہ اللہ والے اپنے وجود سے آزاد ہو گئے، ایک ہی ذات سے تعلق جوڑا ہے تو اس ذات بابرکات نے ان کو وہ نور بخشا ہے کہ چاند سورج زمین آسمان بھی ان کے تابع بنا دیئے۔ جاؤ کسی اللہ والے کو ڈھونڈھو جب تم نے اس سے دوستی کر لی تو اس کی غلامی کے صدقے میں خدا بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔"

مشہور و معروف بزرگ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ رات کے وقت گھر کے بالا خانے تشریف لے گئے تو دیکھا سبحان اللہ! چند بارونق نورانی چہروں والے بزرگ بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں اور ان کی نورانیت سے پورا گھر روشن و منور ہے۔ حضرت سلطان علیہ الرحمۃ نے پوچھا: تم کون ہو؟ کیا لکھ رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں اور خداوند عزوجل کے حکم سے اس کے اولیاء کے نام لکھ رہے ہیں۔ سلطان علیہ الرحمۃ نے پوچھا کیا میرے نام کا لکھنے کا بھی حکم ہوا ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا نہیں۔ سلطان علیہ الرحمۃ نے کہا واقعی میں ولی نہیں ہوں بزرگ نہیں ہوں، میں اپنے آپ کو بخوبی جانتا ہوں مگر اتنا ضرور ہے کہ میں اللہ کے اولیاء کو محبوب رکھتا ہوں، میرے دل میں ان کی بڑی عزت، حرمت اور محبت ہے۔ زہے خوش قسمت تھے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کہ جب دوسری رات فرشتوں کے دفتر کو دیکھا تو سر فہرست اپنا نام تحریر پایا، ملائکہ سے سبب پوچھا تو فرشتوں نے کہا اللہ رب العزت نے ہم کو حکم دیا کہ جو شخص میرے اولیاء کے ساتھ محبت و تعلق رکھتا ہے اس کو بھلاؤ مت۔ جو میرے اولیاء سے محبت رکھتا ہے، اس کا نام سب سے پہلے رقم کرو۔

پیرانِ پیر حضرت محبوبِ سبحانی قطب ربانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ نے سہ شنبہ یکم شعبان سنہ ۵۴۵ھ مدرسہ معمورہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

یا مریض الباطن علیک بالدواء وھذا الدواء لا یکون الا عند الصالحین من عباد اللہ عز و جل خذ الدواء منھم و استعملہ وقد جاءتک العافیۃ الدائمۃ و الصحۃ الابدیۃ لمعناک و لصلبک و لسرک و لخلوتک مع ربک عز وجل۔ تنفتح عینا قلبک فتنظر بھا الی ربک عز وجل تصیر من المحبین الوقوف علی بابہ الذین لا ینظرون الی ماسواہ۔

ترجمہ: اے باطن کے مریض دوا حاصل کر اور یہ دوا اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے سوا کہیں نہ ملے گی، تیرے اندرون کو بھی اور تیرے قلب کو بھی اور تیرے باطن کو بھی اور پروردگار کے ساتھ تیری خلوت کو بھی، تیرے قلب کی دونوں آنکھیں

کھل جائیں گی، پس تو ان سے اپنے پروردگار کو دیکھے گا ان محبین میں سے بن جائے گا جو اس کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اس کے سوا کسی کی جانب بھی نظر نہیں کرتے۔[1]

ایک حدیث شریف میں حضور پُر نور شافع یوم النشور ﷺ کی خدمت میں کسی نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟ ان کی علامات کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: **هم الذين اذا رؤو ذكر الله**۔ یعنی وہ حضرات کہ جن کو دیکھتے ہی اللہ یاد آجائے۔[2]

فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: تم علماء ربّانیین کی ہمنشینی اختیار کرو اور داناؤں کی باتیں سنا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حکمت کی روشنی سے مردہ دل کو یوں زندہ کرتا ہے جس طرح خشک زمین کو آبِ رواں سے سرسبز و شاداب بنادیتا ہے۔

علامہ الدہر فرید العصر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان اولياء الله لهم قربة و معية بالله تعالىٰ غير متكيف يقتضى ذالك ان يكون مجالستهم كالمجالسة بالله تعالىٰ ورؤيتهم مذكرا الله تعالىٰ و ذكرهم جالبا الى ذكره تعالىٰ كالمرءة اذا قوبلت بالشمس و امتلأت بنورها حصلت لها حالة اذا قوبل شئ بذالك المرءة يستضئ بها كما يستضىء بمقابلة الشمس بل يتحرق القطنة بمقابلة المرءة دون مقابلة الشمس لقرب القطنة بالمرءة دون الشمس و ايضا ان الله سبحانه اودع فى ذوات اوليائه استعداد تاثر من الله تعالىٰ تقرب و مناسبة خفية غير متكيفة به تعالىٰ و استعداد تاثير فى الناس لاجل مناسبة جنسية و نوعية و شخصية۔

ترجمہ: تحقیق اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسی بے کیفیت معیت اور قرب حاصل ہے جس کی بدولت ان کے ساتھ بیٹھنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھنے کی مانند ہے، ان کے دیکھنے سے خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکات یاد آجاتی ہے۔ اولیاء کا ذکر (بیان) کرنا ذاکر کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف کھینچ کر پہنچاتا ہے، جس طرح آئینہ سورج کے مقابل لایا جاتا ہے تو سورج کے نور سے منور ہو کر اس کی ایسی حالت بن جاتی ہے کہ کوئی بھی چیز اس کے سامنے آجاتی ہے تو منور ہو جاتی ہے یہی نہیں بلکہ اگر روئی آئینہ کے سامنے آجاتی ہے تو جل جاتی ہے جبکہ سورج کے مقابل ہونے سے نہیں جلتی اس لئے کہ آئینہ روئی سے قریب ہے اور سورج دور، اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے قرب اور بلا کیفیت مناسبت خفیہ کی وجہ سے ان میں استعداد تاثیر پیدا کی ہے (جس کے ذریعے معارف و حقائق بارگاہ قدس سے حاصل کرتے ہیں) اور استعداد تاثیر (دوسروں پر اثر کرنے کی لیاقت) بھی اس لئے کہ ان کو لوگوں کے ساتھ مناسبت جنسی نوعی اور فردی حاصل ہے۔ یعنی وصف انسانیت میں یہ بھی

---

[1] (فتح الربانی مترجم ص ۳۲۱،۳۲۰، مطبوعہ کراچی)

[2] (المنبہات، اصح المطابع کراچی)

دوسرے انسانوں کے شریک ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے فیوض و برکات حقائق و معارف حاصل کر کے لوگوں کو عطا فرماتے ہیں۔"[1]

عمدۃ المحققین والمفسرین امام المتکلمین امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ آیتِ شریفہ: وعلم أدم الاسماء کلها (البقرہ) کے ماتحت لکھتے ہیں:

وقال بعض المحققين: العلماء ثلاثة عالم بالله غير عالم بأمر الله وعالم بأمر الله غير عالم بالله، وعالم بالله وبأمر الله۔ أما الأول: فهو عبد قد استولت المعرفة الالهية على قلبه فصار مستغرقا بمشاهدة نور الجلال وصفحات الكبرياء فلا يتفرغ لتعلم علم الأحكام الا ما لا بد منه۔ الثاني: هو الذى يكون عالما بأمر الله وغير عالم بالله وهو الذى عرف الحلال والحرام وحقائق الأحكام لكنه لا يعرف أسرار جلال الله۔ أما العالم بالله وبأحكام الله فهو جالس على الحد المشترك بين عالم المعقولات وعالم المحسوسات فهو تارة مع الله بالحب له، وتارة مع الخلق بالشفقة والرحمة، فاذا رجع من ربه الى الخلق صار معهم كواحد منهم كأنه لا يعرف الله واذا خلا بربه مشتغلا بذكره وخدمته فكأنه لا يعرف الخلق فهذا سبيل المرسلين والصديقين وهذا هو المراد بقوله ن {سائل العلماء وخالط الحكماء وجالس الكبراء} فالمراد من قوله ن: سائل العلماء أى العلماء بأمر الله غير العالمين بالله فأمر بمسألتهم عند الحاجة الى الله استفتاء منهم، وأما الحكماء فهم العالمون بالله وبأحكام الله فأمر بمجالستهم لأن فى تلك المجالسة منافع الدنيا والآخرة۔

ترجمہ: بعض محققین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علماء کی تین اقسام ہیں:

(۱) عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ یعنی وہ عالم جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی صفت جلال کے نور دیکھنے اور صفات کبریاء کے مشاہدہ میں مشغول ہو اور احکام شرع کی تعلیم حاصل کرنے کی اسے فرست نہ ہو فقط اپنی ضرورت کے مطابق احکام جانتا ہو۔

(۲) عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ یعنی وہ عالم جو حلال و حرام و دیگر احکام کی حقیقتیں تو بخوبی جانتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے جلال کے اسرار سے بے خبر ہو۔

(۳) عالم باللہ وبامر اللہ یعنی وہ عالم جو معقولات اور محسوسات کے جہانوں کے درمیان والے حد مشترک پر کھڑا رہے وہ کبھی فقط اللہ کی محبت میں مستغرق ہوتا ہے اور کبھی مخلوقات کی طرف رحمت و شفقت کی نظر فرماتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رجوع کر کے مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی ان ہی میں سے ایک فرد ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی معرفت حاصل نہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے، مقام عبدیت کی طرف لوٹتا ہے تو

---

[1] (تفسیر مظهری ص ۴۰، ج ۵ مطبوعه دهلی)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کے ساتھ تو اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے اور یہی انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام علیہم الرضوان کا راستہ ہے اور حدیث شریف: "علماء سے پوچھو، حکماء کے ساتھ میل جول رکھو اور کبراء کے ساتھ بیٹھو" اس حدیث شریف میں بھی علماء سے بوقتِ ضرورت مسائل دریافت کرنے کا حکم ہے اس سے مراد علماء کی دوسری قسم ہے (جو اوپر بیان ہوئی)، اور حکماء کے ساتھ میل ملاپ کا حکم دیا گیا ہے اس سے علماء کی پہلی قسم مراد ہے اور کبراء کے ساتھ ہمنشینی اور محبت کا حکم دیا ہے اس سے مراد علماء کی تیسری قسم ہے یعنی جو احکامِ شرع بھی پوری طرح جانتے ہوں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہو۔ ان کی مجالس میں بیٹھنے سے دنیا و آخرت کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔[1]

علماء کی مذکورہ بالا تقسیم اور ان کے درمیان فرق اور فائدے بیان کرنے کے بعد امامِ موصوف نے ان کی نشانیاں بھی ذکر کی ہیں۔

تفسیر کی عبارت یہ ہے:

ثم قال شفیق البلخی لکل واحد من ھؤلاء الثلث علامات اما العالم بامر اللہ فلہ ثلاث علامات ان یکون ذاکرا بالسان دون القلب وان یکون خائفا من الخلق دون الرب وان یستحیی من الناس فی الظاھر ولا یستحیی من اللہ فھی السر واما العالم باللہ فأنہ یکون ذاکرا خائفا مستحییا اما الذکر فذکر القلب لا ذکر اللسان واما الخوف فخوف الریاء لا خوف المعصیۃ واما الحیاء فحیاء ماالخطر علی القلب لا حیاء الظاھر واما العالم باللہ وبامر اللہ فلہ ستۃ اشیاء الثلاثۃ التی ذکرناھا للعالم باللہ فقط مع الثلاثۃ اخریٰ کونہ جالسا علی الحد المشترکۃ بین عالم الغیب وعالم الشھادۃ وکونہ معلما للقسمین الاولین وکونہ بحیث یحتاج الفریقان الاولان الیہ وھو یستغنی عنھما ثم قال مثل العالم باللہ بامر اللہ کمثل الشمس لا یزید ولا ینقص ومثل العالم باللہ فقط کمثل القمر یکمل تارۃ وینقص تارۃ ومثل العالم بامر اللہ فقط کمثل السراج یحرق نفسہ ویضئ لغیرہ۔

ترجمہ: پس حضرت شفیق بلخی رحمہ اللہ نے فرمایا ان تینوں قسم کے علماء کی نشانیاں ہیں۔ عالم بامر اللہ کی تین نشانیاں ہیں۔

(۱) زبان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو گا مگر دل سے نہیں۔

(۲) مخلوق کا خوف اس کے دل میں ہو گا مگر خالق کا خوف نہیں

(۳) ظاہر میں انسانوں کے سامنے تو حیادار ہو گا مگر اندرونی طور پر اس میں اللہ تعالیٰ سے حیا نہیں ہو گی۔

عالم باللہ کی یہ تین علامات ہیں:

(۱) نہ صرف زبان کا ذاکر ہو گا بلکہ اسکے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو گا۔

[1] (تفسیر کبیر ج ۱، ص ۱۸۱)

(۲)اس کو گناہ کرنے کا خوف نہیں ہو گا اس کو یہ خوف ہو گا کہ میرے اعمال میں کہیں ریاء تو شامل نہیں ہے

(۳)حیادار ہو گا حیاء سے مراد ظاہری حیاء نہیں بلکہ اس کو ان قلبی خیالات کی وجہ سے حیاء و شرمساری ہوتی ہے جو ماسویٰ اللہ کے خیالات نادانستہ طور پر دل پر واقع ہو جاتے ہیں۔

عالم باللہ بامر اللہ کی چھ علامات ہیں۔ تین وہ جو عالم باللہ کی ہیں یعنی:

(۱)ذکر قلبی

(۲)خوف ریاء کا

(۳)دل میں ماسویٰ اللہ کے خیالات آنے کی وجہ سے شرمساری

(۴)جو عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کے درمیان والی حدّ مشترک پر کھڑا ہو

(۵)علماء کی پہلی دو قسموں کے لئے معلم اور رہبر ہونا

(٦)اس حیثیت سے رہنا کہ علماء کے پہلے ذکر کئے ہوئے دونوں قسم کے علماء اس کے محتاج ہوں اور یہ ان سے بے پرواہو۔

پھر فرمایا: ان تینوں کی مثال سورج، چاند اور دیئے کی سی ہے۔ عالم باللہ بامر اللہ سورج کی مانند ہے کہ جس کی روشنی ہمیشہ کامل رہتی ہے اور اس میں کمی بیشی واقع نہیں ہوتی اور عالم باللہ فقط کی مثال چاند کی طرح ہے جس کی روشنی کبھی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کم، (اسی طرح عالم باللہ فقط پر بھی فیوض و برکات انوار و تجلیات کے نازل ہونے کا مدار بھی عالم باللہ بامر اللہ یعنی ولی کامل باشرع عالم باعمل کے ساتھ تعلق اور صحبت پر ہے) اور عالم بامر اللہ فقط کی مثال دیئے کی سی ہے جو دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے اور خود جلتا ہے۔ (اسی طرح عالم بامر اللہ کے علم سے بھی دوسرے لوگ تو فائدہ حاصل کرتے ہیں مگر یہ خود الآن کما کان معرفتِ خداوندی سے محروم ہے جو کہ انسان کی پیدائش کا غرض و مقصد ہے۔)[1]

علماء حق کے سلسلے میں حضرت علامہ امام شعرانی قدس سرہ کا نظریہ بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

اعلم ان ورثة الا نبیاء هم العلماء و الاولیاء فالاولیاء حفاظ الاحوال و الاحکام الباطنة التی تدق عن الافهام و العلماء حفاظ الاحکام الظاهرة التی تفهم ببادی الرأی و قد یرث هؤلاء ایضا الانبیاء فی الاحوال الباطنة کما کانت علیه السلف الصالح فکانوا اولیاء علماء فلما تخلف الناس عن العمل بکل مایعلمون سموا علماء فقط و سلبوهم اسم الولی و الافا لعلماء حقیقة هم الاولیاء علی ماعلیه الناس الیوم کل ولی عالم عامل بلاشک و لیس کل عالم ولیا لانه قد یتخلف عن مقام العمل بما علم۔

---

[1] (تفسیر کبیر، ج ۱، ص ۲٦۷)

ترجمہ: یقین کر لو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث علماء اور اولیاء ہی ہیں، اولیاء اللہ احکام اور احوالِ باطنی کی نگہبانی کرتے ہیں جن کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے اور علماء احکام ظاہری کی نگہبانی کرتے ہیں جو کہ معمولی غور کرنے سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں کبھی کبھی یہ لوگ (علماء) احوال باطنی میں بھی انبیاء کرام کے وارث ہوتے ہیں جس طرح پہلے زمانے کے صالحین نہ فقط علماء ہوتے تھے بلکہ ساتھ ساتھ اولیاء امت بھی ہوتے تھے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ علماء نے عمل کرنے میں کوتاہی شروع کر دی تو اب لفظ علماء سے تو یاد کئے جاتے ہیں لیکن ان کو ولی کوئی نہیں کہتا۔ در حقیقت اولیاء اللہ ہی علماء ہیں چنانچہ آجکل بھی جو ولی ہیں بلا شک وہ عالم اور عامل بھی ہیں لیکن ہر عالمِ دین ولی نہیں ہے کیونکہ بسا اوقات عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔[1]

نتیجہ: معلوم ہوا کہ علماء کا منتہائے نظر امر اللہ (ظاہری احکام شرع) ہے اور عارف کا منتہائے نظر (جہاں نظر کی انتہا ہو) ذات اللہ ہے۔ عالم کی رسائی علوم تک ہے عارف کی رسائی معلوم تک ہے عالم کو کلام لفظی کا علم ہے عارف کو کلام نفسی کا علم ہے۔ عالم کی نظر قرآن مجید کے ظاہری معانی پر ہے عارف کی نظر قرآن مجید کے باطنی معانی پر ہے۔ عالم قرآن شریف سے علمی نکات اور فائدے حاصل کرتا ہے اور عارف قرآن شریف سے فیوض و برکات حاصل کرتا ہے۔

خلاصہ کلام:

الحاصل بیعت کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور اس کا انکار قطعاً ناممکن اور کھلی گمراہی ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے لے کر اب تک صالحین اور بزرگانِ دین کا یہ معمول ہے کہ وہ بیعت کرتے ہیں اور اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح اور ان کی دینی تربیت کرتے ہیں۔

طریقت، شریعت کا ہی ایک جزو ہے، اس کو شریعت سے الگ بتانا سوائے جہالت اور لاعلمی کے کچھ نہیں۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے: جس نے علم فقہ حاصل کیا اور علم تصوف حاصل نہ کیا تو وہ گمراہ اور فاسق ہے، اور جس نے علمِ تصوف حاصل کیا اور علمِ فقہ حاصل نہ کیا تو وہ زندیق ہے اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ ہدایت یافتہ ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو دین پر چلنے اور اس پر استقامت کی توفیق نصیب کرے، اور انبیاء کرام علیہم السلام، اولیائے عظام اور صالحینِ امت رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی تعظیم اور ان کا ادب کرنے والا بنائے۔ آمین۔

---

[1] (الیواقیت والجواھر ج ۲ ص ۸۸)

حضرت شیخ عبد القادر عیسیٰ شاذلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "تصوف کے روشن حقائق" (اردو ترجمہ حقائق عن التصوف) میں بیعت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (الفتح ۱۰)

ترجمہ: "(اے جانِ عالم) بے شک جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پس جس نے توڑ دیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہو گا۔ اور جس نے ایفا کیا اس عہد کو جو اس نے اللہ تعالیٰ سے کیا تو وہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔"

چونکہ شیخ کے دستِ اقدس پر بیعت کرنا فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت کرنے کے مترادف ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے توڑنے پر تنبیہ فرمائی ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا۔ (النحل: ۹۱)

ترجمہ: "اور پورا کرو اللہ کے عہد کو جب تم نے اس سے عہد کر لیا ہے اور نہ توڑو اپنی قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد حالانکہ تم نے کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ۔"

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (الاسراء: ۳۴)

ترجمہ: "اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو بے شک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا"۔

سنتِ مطہرہ:

بعض لوگ کہتے ہیں: اسلام اور جہاد کی بیعت تو ثابت ہے ان کے علاوہ اور بیعت نہیں، دیگر بیعتیں بدعت ہیں ایسی بات کہنا کم علمی ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اسلام اور جہاد کے علاوہ بھی کئی چیزوں پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج ادا کرنے، مسلمانوں کی خیر خواہی اور اچھائی اختیار کرنے، چوری، بدکاری نہ کرنے، بہتان نہ لگانے وغیرہ پر بیعت لی۔

(۴) باب نمبر چار: اثباتِ بیعت

(۱) حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کا پابند رہنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی تھی۔[1]

(۲) صحابہ نے حضور ﷺ کے ساتھ اچھائی پر بیعت کی یعنی اچھے کام کریں گے۔[2]

(۳) حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کرتے تھے کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔[3]

(۴) حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ ہم آٹھ آدمی تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور عرض کی کہ کس امر پر آپ ﷺ کی بیعت کریں؟ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔ اور پانچ نمازیں پڑھو احکام سنو اور مانو اور آہستہ فرمایا: لوگوں سے کوئی چیز مت مانگو۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے ان حضرات میں سے بعض کی یہ حالت دیکھی کہ اتفاقاً بھی چابک گر پڑا تو وہ بھی کسی سے نہیں مانگا کہ اٹھا کر دو۔[4]

(۵) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے حضور ﷺ سے بیعت کی تھی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری، قتل، زنا و بدکاری، لوٹ اور ڈاکہ نہ ڈالیں گے۔[5]

(۶) ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے محبت پر بیعت کی تھی یعنی اللہ و رسول کو محبوب رکھوں گا۔[6]

(۷) حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیں اس بات پر بیعت کیا تھا کہ میت پر نوحہ نہ کریں گی۔[7]

---

[1] (صحیح بخاری، مسلم، مشکوٰۃ، صفحہ ۴۲۳)

[2] (صحیح مسلم، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰)

[3] (صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۱۳۱)

[4] (احیاء العلوم ۳: ۳۵۱، سنن نسائی، التکشف ۲۶۰)

[5] (حیاۃ الصحابہ، ۲۵۶: ۲)

[6] (کنز العمال ۸۳: ۱)

[7] (صحیح بخاری، ۱۷۵: ۱)

اسلام کی بیعت تو یہ پہلی کر چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

"اے نبی! جب حاضر ہوں آپ کی خدمت میں مؤمن عورتیں تا کہ آپ سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ لگائیں گی جھوٹا الزام جو انہوں نے گھڑ لیا ہو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان اور نہ آپ کی نافرمانی کریں گی کسی نیک کام میں تو اے میرے محبوب! انہیں بیعت فرمالیا کرو اور اللہ سے ان کے لئے مغفرت مانگا کرو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

ان باتوں کی پابندی پر آمادہ ہو جائیں تو آپ ان کو بیعت فرمالیں۔ بیعت کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں۔ بزرگ بھی بیعت کرنے کے بعد دعا مانگتے ہیں۔ ان شرائط پر عورتوں کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام بیعت فرماتے، لیکن کبھی بھی بیعت کے وقت کسی عورت کے ہاتھ کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مس نہیں فرمایا۔

(۸) حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی لوگوں سے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر بیعت لیتے تھے۔[1]

(۹) ابن عفیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کو بیعت فرمارہے تھے کہ تم اللہ کی فرمانبرداری کرو۔[2]

(۱۰) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چوری، بدکاری سے بچنے پر بیعت لی۔

(۱۱) سلیم ابی عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حمراء کا وفد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر آپ سے بیعت کی کہ شرک نہ کریں گے، نماز کو قائم رکھیں گے، زکوۃ دیں گے، رمضان کے روزے رکھیں گے۔[3]

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ صحابہ اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن نے گناہوں سے بچنے، نماز و روزہ ادا کرنے، نیکی اختیار کرنے پر بیعت کی۔ مشائخِ طریقت جو نبی پاک ﷺ کی بارگاہِ اقدس سے فیض یاب ہیں، ان کی بیعت کا مآخذ بھی یہی بیعت ہے۔ یہ بیعت تقویٰ و توبہ اور بیعت ارشاد ہے۔ پیر و مرشد کے ہاتھ پر آدمی بیعت کر کے گناہوں سے بچنے اور نیک کام کرنے کا عہد کرتا ہے اور پیر و مرشد سے شریعت و طریقت کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔[4]

سنتِ مطہرہ میں بیعت و تلقین کی کوئی ایک صورت نہ تھی بلکہ مردوں عورتوں، مختلف گروہوں اور نابالغ بچوں سے بھی بیعت لی جاتی تھی۔

---

1 (الاصابہ ۳:۴۵۸، حیاۃ الصحابہ ۲:۲۷۲)

2 (بیہقی ۸:۴۶، حیاۃ الصحابہ ۲:۲۷۲)

3 (حیاۃ الصحابہ ۲:۲۷۳، کنز العمال ۱:۸۱)

4 (بحوالہ رسائل خمسہ ص ۳۱۴-۳۱۶)

(۱): مردوں کی بیعت: امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بایعونی علیٰ أن لا تشرکوا باللّٰہ شیئاً، ولا تسرقوا، ولاتزنوا، ولا تقتلوا أولادکم، ولا تأتوا ببھتان تفترونہ بین أیدیکم وأرجلکم، ولا تعصوا فی معروف، فمن وفی منکم فأجرہ علی اللّٰہ، ومن أصاب من ذلک شیئاً فعوقب فی الدنیا فھو کفارۃ لہ، ومن أصاب من ذلک شیئاً ثم سترہ اللّٰہ فھو الی اللّٰہ، ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ۔

تم میری بیعت کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ گے۔ اسراف وفضول خرچی سے اجتناب کروگے۔ زنا سے بچو گے اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر بہتان طرازی بھی نہیں کروگے۔ اچھے کام میں نافرمانی نہیں کروگے۔ پس جس نے ان تمام احکام کو پورا کیا تو اس کا اجر وثواب اللہ کے ہاں ہے اور جس نے ان میں کمی کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ہی سزا دے دی۔ تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اور جس نے کسی برائی کا ارتکاب کیا اور دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو معاف کردے اور اگر چاہے تو اسے سزا میں مبتلا کر دے۔ پس راوی (حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ امتص) فرماتے ہیں: **فبایعناہ علیٰ ذلک** (کہ ہم نے حضور ﷺ کی ان تمام امور پر بیعت کرلی۔)[1]

(۲): اجتماعی تلقین: حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ نے فرمایا تم میں کوئی اجنبی (اہل کتاب) تو نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ! آپ نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا اپنے ہاتھوں کو بلند کرو اور کہو "**لا الٰہ الا اللّٰہ**" ہم نے ہاتھوں کو بلند کیا اور کہا "**لا الٰہ الا اللّٰہ**" پھر نبی پاک ﷺ نے فرمایا! **الحمد للّٰہ** اے اللہ تو نے مجھے اس کلمہ کے ساتھ مبعوث فرمایا اور مجھے اس کا حکم فرمایا اور اس پر جنت کا وعدہ فرمایا اور بے شک تو وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ألا أبشروا فإنّ اللّٰہ قد غفر لکم۔** تمہیں خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا۔[2]

(۳): انفرادی تلقین: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں جو اللہ تعالیٰ کے قریب ترین اور اس کے بندوں پر آسان ترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین ہو۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! اے علی! **سرّا او جھرا** (خاموشی سے اور بہ آوازِ بلند) اللہ کے ذکر پر مواظبت اختیار کرو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی تمام لوگ ذکر کرتے ہیں مجھے کوئی خاص ذکر بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے افضل

---

[1] (أخرجہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان۔ وأخرجہ مسلم والترمذی والنسائی کما فی "الترغیب والترھیب" ج ۲ ص ۴۱۵)

[2] (أخرجہ الامام احمد، والطبرانی، والبزار، ورجالہ موثوقون، کمافی مجمع الزوائد: ج: ۱ : ص: ۱۹)

کلمہ جو میں نے اور سابقہ انبیاء نے کہا وہ "لا الہ الا اللہ" ہے۔ اگر زمین و آسمان ایک پلڑے میں ہوں اور "لا الہ الا اللہ" دوسرے پلڑے میں تو یہ پلڑا دوسرے پر بھاری ہو گا۔ زمین پر جب تک "لا الہ الا اللہ" پڑھنے والا ہے۔ قیامت نہیں آئے گی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کہ میں کیسے ذکر کروں؟ تو بنی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا آنکھیں بند کرو اور تین دفعہ مجھ سے "لا الہ الا اللہ" سنو۔ پھر تم تین دفعہ کہو میں سنتا ہوں پھر اسی طرح بلند آواز کے ساتھ ذکر کیا۔[1]

طبرانی، ابو نعیم، حاکم، بیہقی اور ابن عساکر نے بشیر ابن خصاصیہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کس بات پر میری بیعت لیتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ پھیلایا اور فرمایا کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور پانچ نمازوں کو ان کے صحیح اوقات میں پڑھے۔ زکوٰۃ مفروضہ کو ادا کرے۔ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! دو باتوں کے علاوہ میں سب کو ادا کر سکتا ہوں ان دو کی گنجائش نہیں۔

(۱): زکوٰۃ قسم بخدا! میرے پاس دس اونٹوں کے سوا کچھ نہیں۔

(۲): جہاد، میں بزدل آدمی ہوں لوگ کہتے ہیں کہ جو میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگے، وہ غضبِ خداوندی کا مستحق ہوتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ جنگ شروع ہو جائے اور میں ڈر کر بھاگ جاؤں تو اللہ کے غضب کا مستحق ہوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور حرکت دی اور فرمایا! اے بشیر! صدقہ اور نہ جہاد۔ تو پھر جنت میں کیسے داخل ہو گے۔ میں نے عرض کی ہاتھ بڑھایئے میں بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے آپ کے دستِ اقدس پر ان تمام چیزوں پر بیعت کر لی۔[2]

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں۔ کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ! مجھے بیعت کیجئے۔ آپ نے فرمایا! میں تجھے اس شرط پر بیعت کرتا ہوں۔ تو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرے۔ نماز قائم کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ مسلمانوں کو نصیحت کرے اور شرک سے برأت کا اظہار کرے۔[3]

ایضا قال: بایعت رسول اللہ ﷺ علی اقام الصلاۃ و ایتاء الزکاۃ، و النصح لکل مسلم۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جب بھی سمع وطاعت پر بیعت کرتے تو نبی کریم ﷺ ہمیں ارشاد فرماتے کہ میں ان چیزوں پر تم سے بیعت لیتا ہوں۔ جن چیزوں کی تم طاقت رکھتے ہو۔[4]

---

[1] (رواہ الطبرانی و البزار باسناد حسن)

[2] (أخرجہ الامام أحمد، وقال الھیثمی فی "مجمع الزوائد" رجالہ موثوقون، ج ۱ ص ۴۲)

[3] (رواہ أحمد و النسائی فی باب لبیعۃ علی النصح لکل مسلم)

[4] (صحیح البخاری کتاب الأحکام، صحیح مسلم کتاب الأمارۃ)

(۴): **عورتوں کی بیعت:** حضرت سلمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور انصار کی عورتوں کے ساتھ مل کر بیعت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس شرط پر بیعت کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ نہ چوری کریں نہ زنا۔ نہ اپنی اولادوں کو قتل کریں اور نہ ہی کسی پر بہتان باندھیں۔ اور نہ ہی نیکی کے کاموں میں نافرمانی کریں اور فرمایا کہ نہ ہی تم اپنے خاوندوں کو دھوکہ دو۔ فرماتی ہیں کہ ہم نے بیعت کی اور واپس لوٹ آئے۔ تو میں نے ایک عورت سے کہا کہ واپس جاؤ اور حضور ﷺ سے پوچھو کہ ہمارے خاوندوں کے مالوں میں سے کون سی چیز ہمارے لئے حرام ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا آپ نے ارشاد فرمایا خاوند کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو ہدیہ دینا۔[1]

حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں دوسری عورتوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی۔ تو عرض کی یا رسول اللہ! ہم اس شرط پر بیعت کرتی ہیں کہ نہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں، نہ چوری کریں نہ زنا۔ نہ ہی اولادوں کو قتل کریں۔ اور نہ ہی کسی پر بہتان لگائیں۔ اور نہ ہی نیکی کے کام میں نافرمانی کریں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ان میں سے جس چیز پر تم قدرت اور طاقت رکھتی ہو۔ تو ہم نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول ہماری ذاتوں سے زیادہ ہم پر رحم فرمانے والے ہیں۔ تشریف لایئے ہم آپ کے دستِ اقدس پر بیعت کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ایک عورت کے لئے میرا ارشاد سو عورتوں کو مخاطب کرنے کے مترادف ہے۔[2]

حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا نہ ہی چوری کرنا اور نہ ہی زنا کرنا۔ اور نہ ہی اپنے بچوں کو قتل کرنا نہ ہی کسی پر بہتان لگانا نہ ہی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کرنا۔[3]

حضرت عزہ بنت خابل رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ وہ نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور ان امور پر بیعت کی کہ نہ زنا کریں گی اور نہ چوری اور نہ اپنے بچوں کو زندہ درگور کریں گی خواہ اعلانیہ ہو یا خفیہ۔ آپ فرماتی ہیں کہ اعلانیہ طور پر زندہ درگور کرنے کو تو میں جانتی ہوں مگر خفیہ طور پر زندہ درگور کرنے کے بارے میں میں نے نبی کریم ﷺ سے نہیں

---

[1] (مسند احمد، ابویعلیٰ، طبرانی، ورجالہ ثقات کمافی مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۸)

[2] (ترمذی، کتاب السیر باب بیعۃ النساء، نسائی باب بیعۃ النساء، واسنادہ حسن)

[3] (أخرجہ النسائی وصححہ الترمذی، کمافی حیاۃ الصحابۃ ج ۱ ص ۲۳۱)

پوچھا اور نہ ہی آپ نے مجھے خبر دی۔ پھر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے مراد بچہ کو ضائع کرنا ہے۔ قسم بخدا! میں کبھی بھی اپنے بچہ کو ضائع نہیں کروں گی۔[1]

(۵): نابالغ بچوں کی بیعت: طبرانی نے محمد بن علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت لی، حالانکہ وہ ابھی چھوٹے تھے اور ان کی داڑھی بھی ظاہر نہیں ہوئی تھی آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے علاوہ نبی کریم ﷺ نے کسی اور چھوٹے سے بیعت نہیں لی۔[2]

طبرانی نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے سات سال کی عمر میں بیعت کی۔ جب حضور ﷺ نے انہیں دیکھا تو آپ نے تبسم فرماتے ہوئے ہاتھ پھیلایا اور بیعت لی۔[3]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بیعت کی مختلف صورتیں تھیں کبھی تو اسلام پر بیعت کرتے اور کبھی نیک اعمال، ہجرت، نصرتِ دین اور جہاد اور سمع وطاعت پر بیعت کرتے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دستِ مبارک پر بیعت کرنا:

ابنِ شاہین نے ابراہیم بن مستمر سے انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس وقت بیعت لی جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ (الفتح: ۱۰)

بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

اور یہ بیعت اللہ تعالیٰ اور حق کی اطاعت کے لئے تھی۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت یہ تھی کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہوں تم میری بیعت کرنا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بیعت نبی کریم ﷺ کی بیعت کی طرح تھی۔[4]

---

[1] (طبرانی، مجمع الزوائد: ج۴، ص ۳۹)

[2] (مجمع الزوائد ج۹: ص ۱۴۰)

[3] (مجمع الزوائد ج۹، ص ۲۸۵)

[4] (الإصابة ج۳ص ۴۵۸)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی کہ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں حسبِ استطاعت سمع وطاعت پر بیعت کروں جیسا کہ آپ سے پہلے خلیفہ ٔاول کی بیعت کی۔ [1]

حضرت سلیم بن ابی عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ حمراء کا وفد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ قیامِ رمضان کا اہتمام کریں گے۔ اور مجوسیوں کی عید چھوڑ دیں گے۔ جب انہوں نے ہاں کہا تو آپ نے ان سے بیعت لی۔ [2]

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان ﷺ کے اس طریقہ ٔبیعت کو ہر زمانہ میں اپنایا ہے۔ شیخ ندوی اپنی کتاب "رجال الفکر فی الدعوۃ فی الاسلام" میں فرماتے ہیں۔ کہ شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت اور توبہ کے دروازہ کو کھولا جس میں تمام عالمِ اسلام کے کونے کونے سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد ومیثاق کی تجدید کی اور یہ عہد کیا کہ وہ شرک کریں گے نہ ہی فسق وفجور اور بدعات کا ارتکاب کریں گے نہ ظلم کریں گے نہ ہی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھیں گے۔ فرائض کو ترک نہیں کریں گے۔ اور دنیا کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیں گے۔ اور نہ ہی آخرت کو بھولیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر جس دروازہ کو کھولا تھا اس میں بے حد وبے حساب مخلوق داخل ہوئی۔ ان کے اعمال واحوال بہتر ہو گئے۔ اور بہترین مسلمان بن گئے۔ حضور غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تربیت و نگرانی اور محاسبہ کا اہتمام کیا۔ آپ کے روحانی شاگرد بیعت توبہ اور تجدید ایمان کے بعد معاشرہ کے ذمہ دار فرد بن گئے۔ [3]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام کی اس بیعت وعہد کا انفرادی اور اجتماعی تزکیہ ٔنفس اور اصلاح میں انتہائی گہرا اثر ہے۔" [4]

---

[1] (حیاۃ الصحابۃ ج ۱ ص ۲۳۷)

[2] (رواہ الامام احمد کمافی نفس المرجع)

[3] (رجال الفکر والدعوۃ فی الإسلام ص ۲۴۸)

[4] (انتہیٰ حوالہ تصوف کے روشن حقائق، ص ۷۹-۸۶)

بیعت مرشد

جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی فرمانبر دار اور اطاعت گزار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں فنا ہوئے تھے، اس ہی کی شان کے ساتھ خداوند کریم ورحیم نے امّتِ محمّدیہ ﷺ کیلئے ارشاد فرمایا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدة ۳۵)

ترجمہ: اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم اللہ کے عذاب سے نجات پاؤ۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والو کو خطاب فرمایا ہے۔ ایمان والے وہی لوگ ہیں جو اسلام کے احکامات اور قوانین وضوابط پر پوری طرح سے عمل پیرا ہیں۔ جیسا کہ نماز پانچوں وقت ادا کرتے ہیں، ماہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، حج اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے ہیں۔ اوامر ونواہی کو مانتے ہیں۔

جن لوگوں کو اللہ پاک "ایمان والو" سے نوازتا ہے اگر کوئی بھی اپنے دل میں ان کے ایمان میں ذرہ برابر کمی کا خیال کرے گا تو کافر اور مجرم گردانا جائے گا۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نور ایمانی دیکھ کر "ایمان والو" کہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ یعنی میں جانتا ہوں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اس آیت شریف میں اللہ پاک نے ایمان والوں کے حق میں انعامات جنت اور آخرت کی عظیم خوشخبری کے بجائے اِتَّقُوا اللہ فرمایا ہے، یعنی اللہ سے ڈرو۔ در حقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی ظاہری نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، زہد وعبادت، نیک اعمال، حفظ قرآن، مولوی، عالم، فاضل اور ظاہری عہدہ وپوزیشن کو اپنے لئے پورا اور کافی مت سمجھئے کہ گویا تم کامیاب ہوئے ہو اور تم نے حق عبودیت کی تعلیم کا پورا کورس پاس کر لیا ہے، اب تمہیں عہدہ، ڈگری اور اسناد ملیں گی۔ نہیں نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ اب تو آپ تعلیم عبودیت کے ابتدائی حصہ میں شریعت کے طالب العلم ہو۔ اور قاعدہ پڑھتے ہو۔ اس کے علاوہ عبودیت کے تین کورسز اور بھی ہیں۔ طریقت، حقیقت، اور معرفت ان کورسز کو پاس کرنا ہو گا۔ تب جا کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ اور عبودیت کے مقصد تک پہنچ پاؤ گے۔

مقصد عبودیت کے بارے میں اللہ پاک نے بیان فرمایا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

ای لیعرفون! یعنی اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے انس و جن کو اپنی معرفت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔

پس عبودیت کا مقصد "معرفت" میں ظاہر ہوا۔ جس طرح ظاہر علوم کے حصول کیلئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح باطنی علم "معرفت الہٰی" کے حصول کے لئے بھی ایک استاد، شیخ کامل مکمل کی ضرورت لازمی ہے۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ یعنی اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ جس کی بدولت قرب الٰہی، وصل الٰہی اور معرفت الٰہی حاصل ہو جائے گی۔ یعنی وہی بندہ صالح عارف باللہ آپ کو مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کا مصداق اور عملی نمونہ بننے کی ہدایت فرمائیں گے اور وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِه سے مراد نفس کے ساتھ مقابلہ اور جہاد ہے۔ اس لئے رسول اکرم ﷺ نے نفس کے ساتھ جہاد کرنے کو جہاد اکبر فرمایا ہے۔

قول الجمیل میں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں پر "وسیلے" سے مراد ایمان نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب فرمایا ہے۔ نہ اس سے مراد دیگر اعمال صالحہ ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ، اور نہ عبادات مالی اور بدنی مراد ہے۔ اس لئے کہ یہ سب اعمال "تقویٰ" میں شامل ہیں۔ پس وسیلہ سے مراد ارادت، بیعت مرشدِ طریقت ہے۔ آگے چل کر اسی کتاب کے صفحہ ۱۲ پر رقم ہے: ان البیعت سنة یعنی بیعت سنت ہے۔ اور قوم میں پیر طریقت کی مثال ایسی ہے جیسے اپنی امت میں پیغمبر علیہ السلام کی ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے: علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل یہاں علماء سے مراد عالم ظاہری نہیں ہے بلکہ وہ علماء مراد ہیں جنہیں علم ظاہر اور علم باطن کے فیوضات حاصل ہوں۔ جنہوں نے ان دونوں علوم میں کمال حاصل کیا ہو۔ پس وہی نبی علیہ السلام کا وارث بن سکتا ہے۔ اسی طرح مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی مشتاق احمد نے کتاب امداد المشتاق کے صفحہ ۵۴۰ پر تحریر کیا ہے: اَلشَّيْخُ فِيْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ وَمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّجْلِسَ مَعَ اللّٰهِ فَلْيَجْلِسْ مَعَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ۔ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث پاک کا قول ہے۔ یعنی شیخ کامل اپنی قوم میں ایسا ہے جیسے کہ نبی امت میں ہوتا ہے اور جو کوئی اللہ پاک کا ہم مجلس ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اسے چاہیئے کہ وہ اہل تصوف کا ہم مجلس ہو جائے اور صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کرے۔

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی تفسیر عزیزی کے صفحہ ۵۸۷ پر رقمطراز ہیں کہ جب پیر میں بشریت کے اوصاف دیکھ پاؤ تو ان سے مت بھاگو اور ان پر بد اعتقادی نہ کر۔ بلکہ ان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ جان یعنی ان کے طفیل آپ کو معرفت الٰہی حاصل ہو گی۔ اور دستگیر طریقت جان۔

اس آیت کی تشریح میں تفسیر مواہب الرحمان میں لکھا گیا ہے کہ بیعت شرعی امر ہے جو کہ تواتر کے ساتھ نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے اور اجماع امت سے ثابت ہے، اور رسالہ امامت میں مولوی اسماعیل دہلوی نے بھی وسیلہ سے مراد وہ مرد صالح لیا ہے جسے قرب الی اللہ حاصل ہو۔

صراط مستقیم مترجم اردو، صفحہ ۱۲۳ پر مولوی اسماعیل دہلوی لکھتا ہے کہ بیشک پیر و مرشد معرفت الٰہی اور راہ سلوک کا وسیلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللہَ وَ ابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔

اور صفحہ ۱۴۴ پر لکھتے ہیں کہ حقیقی نجات کیلئے مجاہدہ نفس سے پہلے مرشد کامل مکمل کی جستجو ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت بھی اس طریقے سے جاری و ساری ہے۔ اس وجہ سے رہبر کے بغیر راہ معرفت پانا انتہائی کٹھن اور مشکل کام ہے۔ اس شخصیت کو مرشد بنانا چاہیئے جو کسی بھی شان سے شریعت کے مخالف نہیں ہو جسے دیکھ کر فوراً خدا یاد آئے۔

حب مرشد بعینہٖ حبِ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہے

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی مرقومات امدادیہ میں مکتوب نمبر ۳۱ پر رقمطراز ہیں کہ مرشدین سے محبت عین محبت اللہ اور حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس لئے کہ یہ نائبین ہیں۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۶ جلد ۱ میں لکھتے ہیں کہ مرید اپنے عقیدت کے ہاتھ کو مرشد کے ہاتھ سے پیوست کرتا ہے اور یہ اعتقاد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ بیعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہے۔

اور یہ حکم الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللہَ۔ (سورۃ فتح ۱/۲۶)

بیشک جو لوگ تمہاری بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ فرمایا۔ مولانا روم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریف کا ترجمہ اپنی مثنوی میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

دست تو از دست آن بیعت شود ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ید اللہ فوقہم ایدی بود

اسی طرح علامہ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ‏ ‏ ‏ ‏ غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

اس سے ثابت ہوا کہ مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرنا نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے مترادف ہے۔

حدیث قدسی میں ہے:

حُبَّ الفُقَرَآءِ مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ۔

یعنی درویشوں کی محبت جنت کی کنجی ہے۔

اس کا ترجمہ حضرت فرید الدین عطار رحمہ اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کیا ہے:

حب درویشاں کلید جنت است　　　　دشمن ایشاں سزائے لعنت است

حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ضیاء القلوب صفحہ ۳ میں اس طرح تحریر کیا ہے:

کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنا ور وَ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ۔

دونوں آیتوں میں صیغہ امر کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم وجوبی ہے۔یعنی بیعت حکم واجب ہے اور مرشد کے ساتھ محبت اختیار کرنا سنت ہے۔

امداد المشتاق ص ۱۰۶ پر لکھا ہے کہ حاجی امداد اللہ نے فرمایا ہے کہ وجود مطلق لباس مجانس (جنس) میں فیض دیتا ہے اور آگے صفحہ ۱۰۷ پر ہے کہ اپنے پیر و مرشد پر اس طرح (اعتقاد رکھنا چاہیئے) کہ ان سے بہتر کافی کوشش کے باوجود بھی نہیں مل سکے گا۔ اور مولوی رشید گنگوہی نے امداد السلوک ص ۴ میں لکھا ہے کہ جس کا پیر و مرشد نہ ہو اس کا پیر و مرشد شیطان ہوتا ہے۔

مولوی حسین احمد مدنی نے شہاب الثاقب میں لکھا ہے کہ عوارف المعارف میں شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے: من لم یکن لہ استاذ فامامہ الشیطن۔یعنی جس کسی کا پیر و استاد نہیں اس کا پیر و استاذ اور امام شیطان ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل ۱۷:۷۱ (پ۱۵ ع۸) میں فرمایا ہے:

یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِھِمْ۔

”جس دن ہم ہر جماعت کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔“

اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں جس کی جس کسی سے محبت ہوگی اور جس کی پیروی کرتا تھا، قیامت کے دن ان لوگوں کے ساتھ اٹھے گا۔

جس طرح دنیاوی مقاصد اور مراتب کے حصول کے لئے انسان ہر قسم کے وسیلے کے تلاش اور جستجو کرتا ہے اور جس کے وسیلے سے ایک افسر سے استفادہ کرتا ہے اسی طرح لازمی ہے کہ معرفت الٰہی اور قرب الی اللہ کے لئے ایک پیر کامل مکمل کے ہاتھ پر بیعت کی جائے جن کے ذریعے قرب اور معرفت الٰہی حاصل کی جائے۔

ہیچ کس از خود بخود چیزے نہ شد | ہیچ آہن خود بخود تیغے نہ شد
ہیچ حلوائی نہ شد استاد کار | تا شاگرد شکر ریزے نہ شد
مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم | تا غلام شمس تبریزے نہ شد

ان اشعار میں مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی چیز خود بخود نہیں بنتی۔ جس طرح لوہے سے خود بخود تلوار نہیں بنتی اور کوئی شخص خود بخود حلوائی نہیں بن سکتا جب تک اس نے کسی حلوائی کی شاگردی نہ کی ہو، اور ایک مولوی ہر گز خود بخود مولائے روم نہیں بن جاتے جب تک اس کو شمس تبریز جیسے پیر کامل مکمل کے ہاتھ پر بیعت نصیب نہ ہوتی۔

اس سے پہلے مولانا روم رحمہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے پایہ کے عالم تھے اور علامہ دہر تھے۔ لیکن علمی رموز و اسرار اور دین کی سمجھ انہوں نے پیر مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کی۔ باطنی رموز اور اسرار اور تجلیاتِ الٰہی بغیر عالمِ باطن سے نہیں مل سکتے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ سے پہلے وحی میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا "اِقْرَأْ" فرمانا اور نبی ﷺ کا "مَا اَنَا بِقَارِی" فرمانا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضور پاک ﷺ کو پکڑنا اور سینے سے ان کے سینے پر زور دینا ایک پکا مضبوط ثبوت ہے۔

اگر باطنی اسرار و رموز لسانی یعنی زبانی علم ظاہر سے حاصل ہو سکتا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کبھی بھی باطنی اسرار و رموز کے حصول کے لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے سینہ مبارک پر زور نہ کرتے۔ اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام "اِقْرَأْ" کے جواب میں ہی بول پڑتے۔ پس ثابت ہوا کہ باطنی اسرار و رموز پر واقفیت بغیر پیر کامل مکمل سے محال اور ناممکن ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: من مات و لیس فی عنقہ بیعۃٌ مات میتۃ الجاھلیۃ۔ جس کسی نے قصداً مرشد کے طریقت کی بیعت سے انکار کیا اور یہی انکار تکبر حسد اور دشمنی پر مبنی ہو تو یہ شخص جاہلیت کی موت مر گیا۔

حضرت علامہ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بندۂ یک مرد مؤمن دل شوی | بہ کہ بر فوق شہ شاہان شوی

یعنی اگر اپنے آپ کو اہل دل مؤمن کامل مکمل کے غلامی میں دے جاؤ تو یہ دنیاوی بادشاہوں کے سروں پر چلنے سے بہتر ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا | نگاہ مرد مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

علامہ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ کون ہے جو کامل مکمل مرد مومن کے زور بازو کا اندازہ لگا سکے۔ اس کی ایک ہی نظر سے تقدیریں بدل سکتی ہیں۔

پیر کامل مکمل کی توجہ، اس کی ایک نظر مرید اور طالب معرفت الٰہی کے دل اور روح کیلئے ریگمال کی حیثیت اور اثر رکھتی ہے اور گناہوں کے میل کچیل کیلئے صابن ہے۔ پتھر جیسے سخت دل کو نرم کر دیتی ہے اور ایسا اکسیر ہے جو لوہے پر چڑھے ہوئے کالے اور گہرے زنگ کو خالص سونے کی طرح چمکدار بنا دیتا ہے، تو مرید کا دل بازارِ معرفت میں بکنے کے قابل ہو جاتا ہے اور حقیقتِ اخروی کی تجارت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف ۱۸:۶۹، پ ۱۶، ع ۲۱ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کا ارشاد ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے فریق حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ اس مقام پر پہنچے جہاں پر حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات نصیب ہوئی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے صحبت اور فیضِ الٰہی کے حصول کا مطالبہ کیا۔ تو جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اے موسی علیہ السلام میرے ساتھ تم صبر اور قوت برداشت کا مظاہرہ نہیں کر سکو گے۔ تو حضرت موسی علیہ السلام نے فرمایا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا (الکھف ۶۹)

اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو میں آپ علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا، مجھے صابروں میں سے پاؤ گے۔

عرض یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باطنی علوم و معارف کے حصول کے لئے اجازت دیدی۔ جب یہ ایک غریب کی کشتی میں پار ہو رہے تھے تو حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی کا تختہ توڑ دیا۔ اس کے بعد کھیلتا ہوا ایک خوبصورت بچہ مار ڈالا۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ظاہری علمِ شریعت حاصل تھا اور ان اوامر و اسرار پر ابھی تک مولائے کریم نے انہیں واقف نہیں فرمایا تھا، برداشت نہ کر سکے اور حضرت خضر علیہ السلام سے پوچھ ہی لیا۔ حضرت موصوف نے انہیں وہی پرانی شرط یاد دلائی۔ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی۔ اور فرمایا کہ آئندہ پوچھنے پر بیشک انہیں اپنی صحبت سے ہٹا دیا جائے۔ جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان یتیموں کے جن کے والدین نیک اور صالح تھے، کی دیوار بغیر کسی اجرت کے تعمیر کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ یعنی اب میرے ساتھ مزید آپ کی صحبت نہیں ہو سکتی اور ان گزرے ہوئے واقعات کے رموز و اسرار بتائے۔

اور رخصت کر دیا۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ اگر انہوں نے برداشت سے کام لیا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ ان پر بہت سے اسرار منکشف فرماتا۔ جب ان دونوں نے باہم وعدہ کیا تو ایک پرندہ آکر دریا میں چونچ ڈالی اور پھر اڑ گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو علم دیا ہے، وہ اس پرندے کی چونچ میں موجود پانی کے قطرے کے برابر ہے۔ اور اللہ کا علم اس بحر بے پایاں کی مانند ہے۔ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ۔ (روح البیان)

اس سے ثابت ہوا کہ معرفت الٰہی اور باطنی اسرار ورموز کا حصول صرف علم ظاہر سے ممکن نہیں بلکہ ایک شیخ کامل مکمل کے ہاتھ پر بیعت اور ان کی صحبت حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ یہ رضائے الٰہی کے حصول کا ارادہ ہے۔ اور جو یہ ارادہ حاصل کرے تو وہ خلاصی اور نجات پاتا ہے۔ اور خاص طالب المولیٰ اور ذاکر بن جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ رضائے الٰہی اور معرفت کا طالب بننا ایک فرضی مسئلہ ہے۔ اور جس نے اس بیعت کو قبول نہ کیا یا جس نے قبول کیا مگر اس کے آداب کی پاسداری نہ کی تو یہ بھی شیطان کی دوستی میں رہ گیا۔ کیونکہ اس نے نفس وشیطان کے مقابلے میں اپنے پیر کی بات نہ مانی۔ یا ان کے آداب کو ملحوظ نہ رکھا تو یہ بھی نہ ہونے کے برابر ہوا۔ جیسے اس نے بیعت ہی نہیں کی اس لئے شیطان کی تابعداری میں رہ گیا۔

خرپوتی شریف میں لکھا ہے کہ جس کا پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہے۔[1]

"ومن لا شیخ لہ فشیخہ الشیطٰن" کیونکہ جس کا پیر نہیں ہوتا تو وہ ذکرِ خداوندی خصوصی طور پر زیادہ نہیں کر سکتا یا اگر کرتا ہے تو سمجھتا نہیں۔ اور اس ذکر سے اسے ایسا فائدہ بھی نہیں پہنچتا جس سے وہ اللہ تعالیٰ تک واصل ہو جائے تاکہ معرفت کی لذت پائے۔

مرید اور بے پیرے کی مثال

مثال اس کی یہ ہے کہ جب تک دودھ میں دہی میں سے کچھ نہ ڈالا جائے تو وہ دودھ دہی نہیں بن سکتا اور اگر دودھ بغیر دہی کی ملاوٹ کے گاڑھا بھی ہو جائے تو اسے خراب دودھ کہتے ہیں دہی نہیں کہتے۔ نہ وہ دہی ہوتا ہے نہ اس سے مکھن نکلتا ہے۔ اور ذائقہ بھی خراب ہوتا ہے اس لئے لوگ اسے گرا دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص بغیر شیخِ طریقت کی بیعت کے ساری زندگی ذکر واذکار میں گزار دے تو یہ ذکر کرنا ایسا ہے جیسے بغیر لسی ملایا ہوا دودھ کا خراب ہونا جس میں نہ ذوق ہوتا ہے نہ لذت۔ اور اس سے کوئی فائدہ اسے حاصل نہ ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہی عبادت ایسے ہی رد کی جائے جس طرح وہ خراب دودھ رد کر دیا جاتا ہے

[1] (شان حبیب الرحمن: صفحہ: ۱۷۱: مفتی احمد یار خان قدس سرہ)

جو بغیر دہی ملائے گاڑھا ہو گیا ہو۔ اور وہ گرانے کے قابل ہوا ہو۔ اور کوئی فائدہ اس سے حاصل نہ ہوا۔ اسی طرح جو شخص ،طریقت در کنار، ذکر ہی نہیں کرتا وہ تو ہے ہی برباد وہلاک۔ اور جو لوگ ذکر واذکار تو کرتے ہیں مگر بغیر طریقت کے کرتے ہیں تو اس کی مثال خراب دودھ کی سی ہے۔ جو کسی کام کا نہیں۔ اسی طرح جس نے بیعت تو کی ہے مگر اپنے پیر کی مخالفت میں خواہشات نفسانی کی متابعت میں چال چلن اور ذکر واذکار کرتا ہے اور عقل کا پجاری بن جاتا ہے۔ تو وہ پھر پہاڑ سے گرے گا۔ کیونکہ کچھ عرصہ تک مرید کے ارد گرد ایسے حجابات اور پردے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ حق وباطل میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور یہ باطنی راستہ ہے اس لئے نادیدہ راستہ پر مرید اپنے پیر کے پیچھے اس کے نقشِ قدم پر جائے گا۔ اور پیر کی متابعت، تعلق، خلوص اور صداقت ہو گی تو تب منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور شیطان کے مکر وفریب سے بچ جائے گا۔ اس لئے حدیث شریف میں ہے کہ انسان کے دل پر شیطان بیٹھا ہوتا ہے جب یہ انسان ظاہر وباطن میں ذکر شروع کر دیتا ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اور جب غافل ہو جاتا ہے تو شیطان دوبارہ اس کے دل پر بیٹھتا ہے۔ اور اس کے دل میں اپنا زہریلہ مادہ، مکر وفریب ڈالتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کے دل سے نورِ ایمانی کو اپنے وسوسوں سے غائب کر دیتا ہے۔

”قال علیہ الصلٰوۃ والسلام الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنث واذا غفل وسوس۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: جو میرے ذکر سے غافل ہو جائے تو ہم اس پر شیطان مسلط کر دیں گے جو اس کے راستے کا ساتھی ہو گا یعنی اس کا پیشوا اور امام ہو گا اور اس کی اطاعت ومتابعت اس شیطان کے نقشِ قدم پر ہو گی۔ اور یہ ہلاک ہونے والوں میں ہو جائے گا۔ اگرچہ ایسے غافل اپنی اس ہلاکت کو نہیں جانتے اور اس کے باوجود ان کو اپنا آپ بہت بہتر اور صحیح نظر آتا ہے اور خود کو عابد اور متشرع جانتے ہیں لیکن اصلی شیطانی اخلاق جو تکبر اور غرور ہے یہی ہلاکت کی علامت ہے۔ اور دوسرے ان کی نظر میں اپنے آپ سے بہتر نہیں ہوتے کہ ان سے بیعت کریں اور ان کو اپنا رہبر ورہنما اور پیشوا بنائیں۔ اور ان کی صداقت واخلاص سے اقتدا کریں اور عشقِ خداوندی اور قربت کا سبق ان سے سیکھ لیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی جماعت میں شامل کر لیں۔

کقولہ تعالیٰ: ”من اراد ان یجلس مع اللہ تعالیٰ فلیجلس مع اھل التصوف“۔[1]

جہاں میرا ذکر ہوتا ہے میں وہاں ہوتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ طریقت وذکر کی صحبت اللہ تعالیٰ کی صحبت ہے۔ اور اس سے محروم ومغرور جماعت شیطان کی ہے۔ اور اسی شیطان کی متابعت کی وجہ سے یہ شخص دنیا سے ناکام ونامراد اور تباہ وبرباد

---

[1] (شمائم امدادیہ: صفحہ: ۴۹: انا جلیس من ذکرنی)

جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اسی بات پر یہ آیت ”من یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانًا فھو لہ قرین“ دلالت کر رہی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ کسی درخت کا میوہ صرف میوہ ہی کہلاتا ہے۔ اور مالک اس کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ اور وہ شخص صرف اسے ہی میٹھا جانتا ہے کیونکہ اس نے اس سے بڑھ کر ذائقہ نہیں چکھا۔ لیکن جو شخص ہوشیار و عاقل ہوتا ہے۔ اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر میں نے یہ ہمت کی اور اس درخت میں قلم لگالئے تو ہو سکتا ہے کہ اس درخت کا پھل اور بھی میٹھا ہو جائے تو جب یہ شخص اس یقین سے اس بغیر قلم کے درخت میں قلم لگالیتا ہے۔ اور اس کے موافق کوشش اور محنت کرتا ہے تو اسے یہ پھل ایسا عمدہ اور مزید ار نظر آتا ہے کہ پھر خود ظاہر میں دیگر پھلوں کے بجائے اس پھل کے ساتھ تعلق اور محبت رکھتا ہے۔ اور سمجھ جاتا ہے کہ لذت و ذائقہ کسی اور میں نہیں ہے۔ اور یہ جان لیتا ہے کہ پہلے تو اس پھل سے صرف پیٹ بھرتا تھا۔ اسی طرح سلسلہ بیعت کی شان ہے۔ کیونکہ انسان تو انسانیت میں سب ایک جیسے ہیں۔ اور اکثر مسلمان عبادت بھی کرتے ہیں تو ان میں سے اگر ایک مسلمان شیطان کی نہ مان کر بیعت کے بیج کو اپنے جسم کے درخت میں لگادے یعنی بیعت کرے اور وہ روحانی قلم اس کے وجود میں لگ جائے اور پھر اس کے مناسب وہ رنگ جو اسے عارفانِ طریقت نے بتائے ہوں مثلاً اخلاص، صداقت، متابعت وغیرہ کی حق داری اور پاسداری کرے تو آخر کار اپنی روحانیت، عبادت کی مٹھاس اور اس پھل کی لذت روح و دل سے ایسی حاصل کرلے گا کہ اس کے علاوہ کوئی شے اسے لذیذ اور پیاری نہ ہو گی۔ نہ اسے لذت حاصل ہو گی۔ تو یہ شخص سمجھ جائے گا کہ اس سے پہلے کی زندگی میری فضول اور ضائع گزری ہے تو بیعت کے ذائقے کو تب ہی محسوس کرے گا۔

تیسری مثال اس کی بجلی گھر کی ہے، جہاں بجلی بنتی ہے جہاں سے دوسرے علاقوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ بجلی گھر سے تار کے ذریعے ایک ٹرانسفارمر سے دوسرے کو اور اس سے تیسرے کو الغرض ہزاروں سینکڑوں ٹرانسفارمروں کو بجلی تار کے ذریعے پہنچتی ہے۔ پھر ہر ٹرانسفارمر سے اپنے اپنے علاقوں میں تاروں کے ذریعے بجلی پھیلتی ہے۔ اور اس میں مختلف اقسام کے رنگ برنگ بلب لگائے جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے لال پیلے بلب ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں کارخانے لگے ہوتے جن میں مختلف اشیاء بنتی ہیں۔ حالانکہ بجلی یہی ایک ہے اور یہی ایک طاقت ہے۔ لیکن آلات و اسباب کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہی ایک بجلی مختلف اشیاء بناتی ہے۔ اور بلب کے چھوٹے بڑے لال پیلے اور رنگ برنگ ہونے کی وجہ سے اسی طرح روشنی ہوتی ہے۔ یہ روشنی حقیقت میں ایک ہے مگر ان بلبوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس کی روشنی مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی جگہ لوہا، شیشہ پگھلایا جاتا ہے کہیں اناج پیس کر آٹا تیار کیا جاتا ہے۔ کہیں کپڑے گاڑیاں، ہوائی جہاز بنتے ہیں۔ کہیں کہیں انڈوں سے چوزے نکالتے ہیں۔ ہر مشینری میں اس آلے کے مناسب کام ہوتا ہے۔ بعض مقامات ریڈیو، اسپیکر کے ذریعے باتیں، یا ٹی وی کے شیشے میں دور

دراز کے لوگوں کو اپنے سامنے حاضر وناظر دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر حضرات اس بجلی کے ذریعے انسان کے اندرونی حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں میں فکر کرنی چاہیئے کہ آج کل تمام مخلوق اس کی قائل ہے کہ یہ تمام عقلیات ہیں۔ اور اسے سائنس کہا جاتا ہے۔ اور یہی سائنسدان اپنی عقل سے آلات کے ذریعے آگے پیچھے کے حالات، زمین کے حالات، دور دراز علاقوں کے حالات معلوم کر کے ان کے اعلانات اور اشاعت کرتے ہیں۔ یہ تمام عقلیات ہیں جنہیں سائنس کہا جاتا ہے کہ ہوا میں لوہا اڑتا ہے جسے جہاز کہتے ہیں۔ تو بہت افسوس کی بات ہے کہ مسلمان تو کفار، فساق وفجار کی عقلیات وکمال کو مانتے ہیں اس لئے کہ وہ ظاہر ہو چکی ہے حالانکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی دوستی کی علامات میں سے کسی علامت کا پایا جانا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان ان کی عقلیات، غیبی باتیں، معلومات اور حکمتیں سب مانتے ہیں۔ لیکن انسان یہ نہیں سوچتا کہ یہ سائنسدان کس کی مخلوق ہیں؟ اور انہیں اس فانی زندگی میں عیش وعشرت کرنے کیلیئے یہ عقل کس نے دی ہے؟ اگر صحیح سوچ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سائنسدانوں اور ان کی عقلیات، اسباب ان تمام کا مالک وخالق تو صرف وہی ایک ذات پروردگارِ عالم کی ہے۔ اور یہ تمام اس کی جانب سے ہے۔ اس لئے اگر اس میں ذرہ برابر بھی کسی دوسرے کی ملکیت، خالقیت حقیقتاً مان لی جائے یعنی کسی دوسرے کو حقیقی مالک مانا جائے تو مشرک ہو جائے گا۔ اور جب تک مسلمان اس ذرہ ذرہ کا جس کا ذکر ہو چکا اس کا خالق ومالک حقیقی ایک ذات خداوندی کو نہ مانے تو ایسے شخص کو مسلمان کہنا بھی کفر ہے۔ کیونکہ اس کا یہ عقیدہ اس کے کفر وشرک پر کامل دلیل ہے اور اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

آمدم برسر مطلب کہ اس بجلی کی طاقت بغیر آلات واسباب کے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی لیکن آلات واسباب کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں اپنی شان کے مناسب بجلی کی طاقت معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ بجلی کی طاقت ہے۔ اور ہر شخص مانتا ہے کہ یہ بجلی کی طاقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بجلی کے نام سے مشہور نہیں بلکہ ان آلات واسباب کے نام مشہور ہے۔ اور ان ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ بجلی کا نام ہر جگہ ذکر نہیں کیا جاتا لیکن ہر آلہ ومشینری کی صفت یہ اصل میں بجلی کی صفت ہے۔ اسی طرح ذاتِ خداوندی سے وہ حقیقی انوار وطاقت اور صفات ذاتِ محمدی ﷺ کی طرف منتقل ہو گئی جو حقیقت میں ذاتِ پاک کا ظہور ہے بلکہ حضور ﷺ کی ذات بابرکات خود ذاتِ خداوندی سے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: ''انا من نور اللہ و المؤمنون منی'' تو ٹرانسفارمر کی مثالوں پر نظر کیجیئے۔ ایک نے دوسرے سے خفیہ طور پر کیا حاصل کیا ہے اور دوسری مخلوق کو وہ علامات باطنی طاقت کی اقسام میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کو باطنی طور پر جو صفات وکمالات اور جملہ شرافتیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی شان سے حاصل ہوئی ہیں تو وہ ہر کسی کو ظاہراً نظر نہیں آتی تھیں اس لئے تو کفار کہتے تھے آپ ﷺ ہماری طرح بشر ہیں۔ لیکن

جو لوگ نیک بخت تھے اور انہوں نے ٹرانسفارمر کی طرح اپنا رابطہ و تعلق محبت کی حقیقی روشنی اور کمالات و شرافت کے حصول کیلئے اپنے نبی کریم ﷺ سے اس محبت ورابطہ کے تار سے قائم کیا اور اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور مکمل رابطہ و تعلق استوار کیا کہ ان کے باطنی راز بھی کفار کو معلوم نہیں تھے۔ تو وہ کمالات حقیقی جو رب العزت کی ذات سے آپ ﷺ کی ذات میں موجود تھے وہ صحابہ کرام کو ٹرانسفارمر کی مثل منتقل ہو گئے اور حاصل ہو گئے حالانکہ یہی کمالات حقیقی ان کفار کو نظر نہیں آتے تھے جو ان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں موجود تھے۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا: "اصحابی کالنجوم" تو یہی طاقت مانند ٹرانسفارمر سلسلہ تا قیامت ولی کامل اور تابعدار و مخلص کو ایک کو دوسرے سے اور اس سے تیسرے کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے اگرچہ ٹرانسفارمر الگ الگ قسم کا ہوتا ہے مگر بجلی کی اصل وذات سب میں ایک جیسی ہے۔ اسی طرح اولیائے کرام کے اجسام مبارک ظاہر میں الگ الگ ہیں لیکن اصلی حقیقت ذاتی وصفاتی اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات سے سب میں ایک ہی ہے۔

اور مختلف اوقات و مقامات میں یہ اولیائے کرام مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ان اولیاء کے ساتھ محبت کے تار کے ذریعے رابطہ اور تعلق استوار کیا ہوتا ہے۔ تو ان میں بھی اپنی شان کے مناسب وہی صفات حقیقی موجود ہوتی ہیں۔ جس طرح بلب و دیگر مشینریوں کے تار کا رابطہ ٹرانسفارمر کے ساتھ تھا اور ان آلات میں الگ الگ علامات اور کام نظر آتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں کی محبت کے تار ان اولیاء کے ساتھ محکم اور حقیقی طور پر پیوست ہو جائیں تو پھر اپنی ذات وشان کے مناسب کام کرتے ہیں۔ اور ان سے وہ اقوال وافعال صادر ہوتے ہیں جو باقی لوگوں میں نہیں ہوتے جن کو کرامات وخرقِ عادت کہتے ہیں۔

اور ان کو اولیاء اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے دوست اور خاص بندے ہیں کقولہ تعالیٰ۔ "من کان للہ کان اللہ لہ" جو خدا کا ہوتا ہے تو خدا اس کا ہو جاتا ہے۔ جس طرح بلب کا تار ٹرانسفارمر کے ساتھ بجلی کے تار سے پیوست ہوا تو روشنی حاصل کر کے مخلوق کو روشنی دی۔ اسی طرح جس مشینری کی تار اس بجلی کے تار سے پیوست ہو جائے تو وہ مخلوق کو ہر قسم کے فائدے دیتی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اپنی محبت کا رابطہ اور تعلق اولیاء اللہ یعنی پیرِ طریقت سے پیوست کیا تو ہر انسان کو اپنی شان کے مناسب وہ کمالات حقیقی حاصل ہوئے۔ اور باقی مخلوق خدا کو بھی اپنی شان کے مناسب فائدہ پہنچے۔ اور یہی بجلی ہے کہ جب کسی کو پکڑ کر مار دے تو کہتے ہیں کہ بجلی نے مار دیا۔ فلاں کام بجلی نے کیا فلاں چیز بجلی سے چلتی ہے۔ اور انڈے سے بچہ نکالا۔ جیسے کہ "یحی الارض بعد موتھا" یہ لوگ ہر وقت یہ نہیں کہتے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے کیا بلکہ بجلی اور مشنری کا ذکر کرتے ہیں۔ عقل وحکمت اور سائنس کا ذکر کرتے ہیں۔ تو یہ ایک مجازی قول ہے جس سے کوئی کافر مشرک نہیں ہوتا۔ کیونکہ مسلمان کا خاص

یقین یہ ہوتا ہے کہ حقیقی فاعل، خالق، ظاہر کرنے والا ان تمام چیزوں کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انہیں ظاہری کاموں اور ایجادات سے اللہ تعالیٰ کو جانا جاتا ہے۔ لیکن ایسے ظالم بھی ہیں جو اولیائے کرام کی صفات سے مطلق منکر ہیں۔ جو کرامت و خرق عادت ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ ہے۔ جو ایک وسیلے اور سبب سے یعنی آپ ﷺ کی متابعت کی وجہ سے سلسلہ وار اولیاء اللہ کی یہ حقیقت ایک دوسرے کو حاصل ہوئی ہے۔ اور ہر ایک ولی سے اپنی شان کے مناسب کرامات و خرق عادت کشف ظاہر ہوتے ہیں اور ہر قسم کے فائدے ان سے پہنچتے ہیں۔ اور یہ کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء مردہ کو زندہ یا زندہ کو مردہ کر سکیں یا غیبی معلومات یا دور دراز کے مقامات دیکھ یا سن سکیں۔ بلکہ یہ تمام کام کر سکتے ہیں اس طاقت و اجازت سے جو انہیں اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اور اس طریقے پر انہیں حاصل ہوئی ہے جس کے حصول کے وسیلے کا بیان ہو چکا ہے۔ تو یہ بھی اس بجلی کی طرح کی بات ہے کہ بظاہر اولیائے کرام کی طرف منسوب ہوتی ہے کہ فلاں ولی نے یہ کام کیا فلاں نے یہ کام کیا۔ تو یہ بھی ایک مجازی نسبت ہے۔ حقیقی فاعل خالق۔ مارنے والا، زندہ کرنے والا یہ صرف پروردگارِ عالم کی ذات بابرکات ہے۔ اور مسلمان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حقیقت میں یہ کام اور یہ اولیاء اللہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اور ان اولیاء اللہ کا یہ کام کرنا اور ان سے صادر ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اقوال و افعال، صفت و حکمت اور قدرت مانتے ہیں۔ اور یہ ظاہر مجازی بھی اللہ تعالیٰ سے غیر اور کفر و شرک نہیں مانتا بلکہ اس کا مالک اور خالق صرف اسی ذات حقیقی کو مانتا ہے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں ایک کامل مؤمن کو ذاتِ خداوندی پر دلیل نظر آتی ہیں۔ اور یہ اس کامل مؤمن کو اپنے عقیدے کے موافق اللہ تعالیٰ کی حکمت، قدرت اور طاقت نظر آتی ہے۔ اور ان اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور انوارات کا مظہر مانتا ہے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کا ایک راز جانتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پوشیدہ راز ان اولیاء اللہ میں رکھے ہیں اور اس کے بعد ان کے ذریعے ظاہر فرماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کے معجزات، راز و قدرت کو مخلوق پر ظاہر فرماتا ہے۔ اور اپنی قدرت اور محبوب ﷺ کے معجزات پر دلیل دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا: "الانسان سر اللہ فی الارض" یعنی انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ "الانسان سرّی و انا سرّہ" انسان میرا اور میں اس کا پوشیدہ راز ہوں۔

اس لئے اس مقام پر مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

میان عاشق و معشوق رمزیست — کراما کاتبین را ہم خبر نیست

یعنی اللہ تعالیٰ اور اولیاء اللہ کے درمیان ایسا راز ہے کہ کراما کاتبین کو بھی خبر نہیں۔

اس لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: "علم صوفی علم خدا است" یہ عقل میں آنے والی بات تو نہیں لیکن کامل ایمان والے اس کو عقیدت سے مانتے ہیں کہ صوفی کا علم خدا کا علم ہے۔ اور صوفی کا کچھ کرنا، سننا، پہنچنا، مارنا، زندہ کرنا، ذلیل کرنا،

اٹھانا وغیرہ ان کا علم حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ہے اور اگر کوئی اس طرح نہ مانے تو کافر ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اولیاء کی نظر سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی　　　بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

کیونکہ ولی کی نظر خدا کی نظر ہے۔

اقبال مرحوم فرماتے ہیں:

بندۂ یک مردِ مؤمن دل شوی　　　بہ کہ بر فوقِ شہِ شاہاں روی

اگر تو ایک مردِ مؤمن کا غلام بن جائے تو یہ تیرے لئے بادشاہوں کے سروں پر چڑھنے سے بہتر ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک باشی اگر اہل دلی

اللہ تعالیٰ کا نور ولی کے باطن میں ظاہر ہوتا ہے، جب تو اہلِ دل ہو جائے تو تب دیکھے گا۔

مطلب یہ کہ اولیاء اللہ بے شک اللہ تعالیٰ کے صفات وانوارات کے مظہر ہیں مگر ایک شخص اگر یہ کہے کہ نور تو ایک روشنی ہے۔ تو یہ اتنے نادیدہ کام اس سے کیسے ہوتے ہیں؟ روح بھی تو ایک نورانی اور لطیف چیز ہے جو نظر نہیں آتی۔ اور یہ بات تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ جب تک روح اس دنیا میں انسان سے جدا نہ ہو تو اس روح کی نسبت کی وجہ سے یہ دنیاوی ہر قسم کے کام کرتا ہے۔ اور یہ روح ہر کسی میں ہے اور یہ عام ہے۔ اور اولیاء کا نور خاص ہے۔ روح بھی اس کے ذریعے اور ترقی حاصل کرتی ہے۔ نور کے روح پر غلبہ سے روح کی طاقت ڈبل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ وہ کام کرتی ہے کہ عام ذی روح نہیں کر سکتی۔ اور یہ اس طرح آسانی سے کر جاتی ہے کہ جیسا کہ عام ذی روح دنیا کے مختلف کام اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ گزشتہ صفحات میں بجلی کی مثال گزر چکی ہے۔ کہ بجلی کے اسباب تو مجازی طور پر انسان نے بنائے ہیں۔ لیکن ان اسباب کے ذریعے بھی تو اسی بجلی میں آگ پانی سے مجاز میں آئی ہے۔ یعنی یہ بجلی پانی کی طاقت سے ظاہر ہو چکی ہے کیونکہ اس کی حقیقت پانی ہے۔ اور یہی آگ (بجلی) بھی تو کوئی جسم ووجود نہیں رکھتی بلکہ ایک روشنی ہے لیکن ان مشینریوں میں تاروں کے ذریعے مخفی طور پر حاصل ہوئی ہے تو آیا یہ بے شمار ہر قسم کے کام مجاز میں بجلی نہیں کرتی اور ہر شخص بجلی سے اس کام کو سنتا ہے۔ یہ تو عقلیات ہیں۔ اور اس کی حقیقت الگ شے ہے۔ جو انسان کی عقلیات سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اور کئی کام کرتی ہے۔ اور بغیر اسباب کے اس کی حقیقت نظر نہیں آتی۔ اور ہر شخص کا یہ عقیدہ مضبوط ہے کہ یہ فلاں کام کرتی ہے۔ تو اے نادان انسان! دیکھئے اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ کی صفت اور مشینری ہے اور پھر بعض خواص کو یہ حقیقی نور آپ ﷺ سے ملا ہے۔ اگرچہ وہ نظر نہیں آتا ان اولیاء اللہ

میں ظاہری طور پر لیکن یہ ایمانی عقیدے سے مانا گیا کہ یہ نور جب بھی کسی شے یا کام کی طرف جس خیال ونیت سے متوجہ ہو جائے یعنی یہ روح اسی نور کی طاقت سے سب کچھ کر سکتی ہے اور ہر جگہ جا سکتی ہے۔ اور ہر حال معلوم کر سکتی ہے۔ اور اس روح کو امرِ خداوندی کہتے ہیں۔ "قل الروح من امر ربی" کقولہ علیہ السلام "انا من نور اللہ والمؤمنون منی" تو ان سے مراد یہی کامل خواص ہیں جنہوں نے وہ خصوصی نور آپ ﷺ سے حاصل کیا ہے بوجہ اطاعتِ رسول ﷺ اور یہ نور من جانب اللہ ہے۔ ایک طرف روح ہے جو اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ اور دوسری طرف آپ ﷺ کا نور ہے جو خود بھی اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے یعنی نورانی روح اور نور روحِ نوری دونوں نور علی نور۔

حضور ﷺ کا نور جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ اور اپنی روح ونور کو یک جا کیا اور بشریت کے پردے میں دنیا میں ظاہر فرمایا تو اس بشریت کے ساتھ اس روح ونور سے ہر قسم کے معجزات ظاہر ہو گئے۔ اور آپ ﷺ کی اطاعت کو اپنی خوشنودی کا سبب بنایا۔ اسی طرح آپ ﷺ کو تمام صفات، اقوال، افعال الٰہیہ سے متصف فرمایا۔ اور آپ کی اطاعت کو مخلوق کیلئے عبادت بنایا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب اپنی روح (من امر ربی) کے ساتھ انسان پر آپ ﷺ کی اطاعت کی وجہ سے اپنی مہربانی سے تجلی نور کو شامل فرمایا اور اسی نور کے ذریعے انسان کے بدن میں روح کو ترقی عطا فرمائی تو ظاہر میں اس انسان کو انسان کہتے ہیں۔ لیکن باطن میں حق ہے: "ظاہر انسان باطن میں حق ہے" (شمائم امدادیہ: صفحہ: ۵۳)

اور یہ انسان پھر صفات وانوارِ الٰہیہ کا مظہر ہے اور ان کی متابعت گفتار ورفتار اٹھنا بیٹھنا، محبت واخلاص یہ سب اللہ تعالیٰ کی مقبول عبادت ہے اس لئے فرمایا: "واتبع سبیل من اناب الیّ" ان لوگوں کے راستے پر چلو جنہوں نے میری طرف رجوع کیا۔ کقولہ تعالیٰ "فمن اتّبع ھدی فلا یضلّ ولا یشقی" جو ہدایت کے تابع ہیں وہ نہ گمراہ ہوں گے اور نہ بدبخت ہوں گے ان انعاماتِ خداوندی سے جو جنت ہے۔

بجلی کی مثال ایسی ہے کہ ظاہر میں بجلی کی یہ آگ ان ظاہری اسباب سے کام کرتی ہے لیکن اگر اس بجلی گھر سے پانی ختم ہو جائے یا اس سے تار کٹ جائے تو یہ اسباب وآلات جو کام کرنے کے تھے اب بجلی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تو جس انسان کے جسم سے وہ روح کٹ جائے تو یہ جسم بے کار نہیں بلکہ یہ ایک کام ومقصود کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ تو روح پھر اس کیلئے ضرور پیدا ہوئی ہے۔ مقصود سے مراد نور کا بیان ہے۔

آپ ﷺ کا یہی نور جب انسان کی روح سے کٹ جائے تو خدانخواستہ یہ روح مردے کی مانند ہے۔ جس طرح کفار، گمراہ، منافقوں کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے مردوں سے تشبیہہ دی ہے۔ کقولہ تعالیٰ "فانک لا تسمع الموتیٰ" یعنی اے محبوب ﷺ یہ کافر مردوں کی طرح نصیحت قبول نہیں کرتے۔ ان کی مثال مُردوں کی سی ہے جو بذات خود فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی

طرح اس طریقے کے حصول سے غافل لوگ بھی مردوں کی مانند ہیں۔ اور کمالِ زندگی سے زندہ وہ مؤمن ہیں جنہیں تجلیٔ نورِ رسول ﷺ سے فیض پہنچا ہو۔ انہی کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ جن کی روح کی ترقی اس نور سے ہے۔ اور ان کی کرامات بھی اسی نور کے سبب سے ہیں جو نور حقیقت میں آپ ﷺ کے معجزے کا ہے۔ اس لئے اولیائے کرام کی کرامت یہ نبی ﷺ کے معجزے کی دلیل ہے۔

یہ توفیض نورانی کی ایک جھلک ہے جو ان اللہ والوں کو نورِ رسول ﷺ سے حاصل ہوا ہے۔ تو آپ اندازہ لگایئے کہ اس نور رسول ﷺ سے کیا علامات ظاہر ہوتی ہوں گی جو پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے اقوال وافعال قدرت وطاقت کا ظہور تھا۔ جن کو حضور ﷺ کے ہاتھوں ظاہر فرمایا۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ یہی ظہور اولیاء اللہ سے بھی کرتا ہے۔

اے عزیز! اس کو بھی دیکھئے کہ ایک طرف نور ہے اور دوسری طرف آگ ہے جو بجلی ہے۔ جو مجازاً پانی سے بنی ہے۔ جس طرح پانی کی شرافت کم ہے اسی طرح بجلی کی بھی کم ہے۔ اور جس طرح آپ ﷺ کی شرافت وعزت تمام مخلوق میں زیادہ ہے اسی طرح اس نور کی شرافت بھی آگ یعنی بجلی پر زیادہ ہے۔

حقیقت یہ کہ آگ جلال کی تجلی ہے۔ اور نورِ رسول ﷺ تجلیٔ جمال ہے۔ اور تجلی جمال تجلیٔ جلال پر غالب ہے۔ جیسا کہ رحمتِ خدا قہرِ خدا پر غالب ہے۔

ماشاءاللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

بجلی کی یہ صفت فانی ہے اور اولیاء کی یہ صفت باقی ہے۔ آگ دوزخ سے ہے اور نور حضور ﷺ سے ہے۔ اس لئے دنیا پرست لوگ دنیا کی ان چیزوں کے قائل، مصروف اور مشغول ہیں۔ اور نورِ رسول ﷺ سے غافل ہیں۔ تو یہ لوگ آگ کے اہل ہیں۔ کیونکہ "کل شیٔ یرجع الی اصلہ" تو ان کی اصل بھی آگ ہے اس لئے اس کو مانتے ہیں اور اس کی طرف راجع ہے۔ اور نورِ رسول ﷺ اور نورِ اولیاء اللہ سے منکر ہیں۔ اس لئے یہ لوگ ہمیشہ کیلئے محروم رہ گئے۔

جو مؤمن اولیاء اللہ کی طرف راجع ہیں اور صداقت سے ان کے تابع ہیں تو یہ حضرات بھی اپنی اصل کی طرف راجع ہیں۔

جو جنت ہے اور جنت نورِ رسول ﷺ سے ہے اور ان کا نور بھی اسی نور سے ہے۔ اس لئے فرمایا: **"والمؤمنون من نوری"** اور عرش عظیم بھی نورِ محمدی ﷺ سے ہے۔ اور آپ ﷺ نے اپنی حقیقی نورانی ذات کے ساتھ اس عرشِ عظیم کی سیر بھی کی ہے۔ اور نعلین مبارک سمیت عرش پر گزرے ہیں۔ تو اولیاء اللہ ومؤمنینِ کاملین جو اس نور سے ہیں وہ بھی عرشِ معلی کی سیر کرتے ہیں۔

ایک سالک فرماتے ہیں:

چہ سپہ یو قدم ترعرشہ پورے رسی　　　　مالیدلے دے رفتار د درویشانو

ترجمہ: "ایک قدم سے عرش تک پہنچتے ہیں میں نے درویشوں کی رفتار دیکھی ہے۔"

بہت سے اولیائے کرام نے دنیا میں بھی جنت کی سیر کی۔ تو معلوم ہوا کہ ہر شخص اور ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ دنیا و آخرت دونوں میں مؤمن اپنی اصل جنت میں جائیں گے اور منکر گمراہ یہ اپنے اصل مقام یعنی جہنم میں جائیں گے۔ اس لئے فرمایا:

"فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر۔" (سورۃ الشوریٰ آیت ۷)

یعنی ایک گرہو جنت میں اور دوسرا جہنم میں ہو گا۔ اور یہ دونوں گروہ اپنے اپنے مقام کی طرف دنیا میں انہی دو راستوں پر گامزن اور رواں دواں ہیں۔ کوئی دوزخ کوئی جنت کی طرف جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف راجع ہو گی۔

اس لئے مولوی شبیر احمد عثمانی "واتبع سبیل من اناب الیّ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "پیغمبروں اور مرشدِ ہادی کا حق حق اللہ کے ذیل میں سمجھو" مشتاق احمد تھانوی صاحب نے لکھا ہے کہ اس آیت و حدیث کے ذیل میں "پیروں کی محبت عین اللہ و رسول کی محبت ہے"

پیارے جان لو! بیعت کی وجہ سے تمہیں اپنے پیر سے ایسی دولت و عزت ملی ہے کہ جب تو صرف یہی وظیفہ کرے گا تو غازیوں اور تمام نیک لوگوں سے تمہارا درجہ بلند ہو گا۔ اور تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے محبوب ہو گا۔ اور اگر تم نے مجاہدہ کیا تو پھر ان لوگوں سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے کہ جنہوں نے اپنے مالوں اور سروں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کیا۔ یعنی پھر تمہارا درجہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد ہو گا۔ جیسے کہ اولیاء اللہ جو تمام لوگوں سے درجہ بدرجہ اپنے درجے کے مناسب عزت مند، مقرب، دوست اور محبوبانِ خدا ہیں۔ جن کا درجہ شہیدوں، غازیوں اور تمام لوگوں سے افضل و بلند ہے۔

اس کے بعد دوبارہ نماز کے مسئلے کی طرف آتا ہوں کہ اپنے پیر کی اقتداء میں نماز پڑھنا ایسا ہے جیسے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنا۔

امام ابو یوسف قدس سرہ سے روایت ہے:

کقولہ علیہ السلام: "من صلّی خلف عالم متقی فکانّما صلی خلف النبی علیہ السلام۔"

یعنی متقی عالم کے پیچھے نماز گویا کہ حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنا ہے۔ (کنز العمال)

پیارے! یہ مسئلہ تو پہلے گزر چکا ہے اور مسلم شریف کی حدیث بھی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عمداً مرشد و پیرِ طریقت کی بیعت کا انکار کیا تو وہ تکبر، حسد و تعصب کی وجہ سے جاہلیت کی موت مرا۔ تو جان لو کہ جب ایک عالم بیعت نہ کرے تو وہ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق متکبر، حسد کرنے والا، تعصب کرنے والا اور جاہل مرا۔ تو وہ اس شرافت و فضیلت میں سرے سے حساب ہی نہیں اگرچہ وہ بہت متقی و پرہیز گار ہو۔ کیونکہ اصل تقویٰ وہ ہے کہ جو شخص حضور ﷺ و صحابہ ؓ کرام کے قول و فعل اور حال پر کامل اعتقاد رکھے اور یہ تو عین اہلِ شریعت وطریقت کو حاصل ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ”شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرا حال ہے۔

الحمد للہ یہ شرافت اہلِ طریقت کو حاصل ہے جو فرض، واجب، حرام و حلال جانتے ہیں۔ اور صحیح معتقد اور اہلِ شریعت وطریقت ہوتے ہیں۔ تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا عین حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنا ہے۔

قولہ: ”الشیخ کالنبی“ شیخ (پیر) نبی ﷺ کی طرح ہیں۔ اور ان اہلِ طریقت کے علم کی فضیلت بھی ثابت ہوئی ہے جس کا بیان ہو چکا ہے کہ اصل مقصودی علم صرف اہلِ طریقت واہلِ ذکر کا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم کسی مسئلے کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں تو اہلِ ذکر سے پوچھو۔

کقولہ تعالیٰ: ”فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔“ (النحل:۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ کامل اور مقبول علم بھی اہلِ طریقت کا ہے۔ جو معرفتِ خداوندی، رضا اور دوستی کا ایک حقیقی نورانی علم ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ہم نے ان کے لئے نور بنایا یعنی علمِ نورانی کہ اس کے ذریعے مخلوق کے درمیان چلتے ہیں۔ اور ان کو ہر قسم کی معلومات ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نور سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اسی طرح صوفی اہلِ طریقت کا نورانی علم اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ کہ اس کے مقابل کسی کا بھی علم نہیں ہے۔

جیسا کہ فرمایا: ”علمِ صوفی علمِ خدا است“ صوفی کا علم خدا کا علم ہے۔

وقولہ تعالیٰ: وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس یسعی نورھم بین ایدیھم وبایمانھم“

ہم نے ان کیلئے نور بنا دیا جو اس نور کے ذریعے لوگوں میں چلتے ہیں اور ان کا نور ان کے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہے۔

پیارے! نور اور بلند درجہ اہلِ طریقت کیلئے ثابت ہوا ہے۔ تو ایک اہلِ طریقت کے پیچھے نماز پڑھنا تمہارے لئے ایک بڑے عالم، بلند وبالا درجے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا ہے۔ اور یہ بہت مقبول ہے۔ جیسا کہ حبیب عجمی قدس سرہ کا واقعہ گزر چکا ہے۔ اس میں غور کیجئے۔ اور اگر تو اپنے ایسے پیر بھائی کہ جس سے پیر صاحب راضی ہوں اور خود وفادار، تابعدار اور حرام کا مرتکب نہ ہو کے پیچھے نماز پڑھے تو ضرور اس کے سینے میں وہ نورِ حقیقی اپنے پیر کے آئینہ حقیقی سے منتقل ہو گیا ہو گا۔ یعنی اس

کی روح نے اپنے پیر کی روح سے فیض حاصل کیا ہو گا۔ اور اسی فائدے کا اثر اس کے باطن میں بھی ہو گیا ہو گا۔ اور اس کے ظاہر میں بھی اپنے پیر کی تابعداری، اقوال وافعال پر عمل، عبادت، ذکرواذکار کے فائدے کا فیض جو ان کو اپنے پیر کے سینے سے منتقل ہوا ہو گا۔ یعنی وہ فوائد بھی اس مرید نے اپنے پیر سے حاصل کئے ہوں گے۔ اس مرید کا ظاہری بدن تو الگ ہے لیکن اس کے بدن کے ظاہری حقیقی، روحانی تمام فیض وفوائد، شرافت وغیرہ مرید کی محبت وتابعداری کی وجہ سے اس اندازے کے مطابق اپنے پیر سے ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آئینے اگرچہ جدا جدا ہوتے ہیں لیکن جو آئینہ کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حقیقت نور کی تجلّی ظاہر ہوئی ہے۔ اور پھر یہی عکس نورانی جب پیرِ طریقت کے اقوال، افعال کے آئینے سے مرید کے آئینہ حقیقی پر پڑتا ہے تو مرید کو بھی ان اقوال، افعال کی وہ مجازی صفت اور نورِ حقیقی نصیب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا۔ اور جب مرید مخلص، صادق اور محبت کرنے والا ہو گا تو ضرور اسے یہ شرافت حاصل ہو گی۔ یہ علم کتابوں سے متعلق نہیں ہے۔ صاحبانِ طریقت فرماتے ہیں کہ ولایت اور کرامت یعنی اللہ تعالیٰ کی دوستی اور عزت یہ شریعت کی اخلاص سے تابعداری صداقت اور اپنے پیر کی محبت میں ہے۔ تو جب پیر بھائی اپنے ایسے پیر بھائی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے تو حقیقت میں ایسا ہے کہ جیسے ایک عزت مند ولی، اپنے پیر بلکہ حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ خیال فرمایئے کہ صرف اپنے پیر بھائی کے پیچھے نماز پڑھنے سے آپ ﷺ کے اتنے قریب ہو گئے کہ صرف ایک واسطہ درمیان میں آیا آپ کے اور حضور ﷺ کے درمیان جب آپ نے اپنے پیر بھائی کے پیچھے نماز پڑھ لی اور ان سے آگے یعنی پیر صاحب آپ کیلئے مثل نبی ﷺ کے ہیں۔ **"الشیخ کالنبی"** یعنی پیر نبی ﷺ کی طرح ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر آپ کا امام وہ ہے جو آپ کے دوسرے واسطے پر ہے۔ جو تمہارا پیر بھائی ہے۔ اندازہ لگایئے۔ کہ پیر کا قرب تو قربِ خداوندی ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ جس طرح قربِ نبوی قربِ خداوندی ہے تو اسی طرح قربِ مرشد قربِ خداوندی ہے۔ تو جب تم اپنے پیر بھائی کے قریب ہو گئے تو گویا پیر کے قریب ہو گئے۔ اور پیر کا قرب تو قربِ خداوندی ہے۔ اس لئے مشائخِ عظام نے فرمایا کہ اگر کسی کا پیر دور دراز علاقہ میں ہو۔ اور اس کی ملاقات تیس چالیس روز میں نہیں ہو سکتی اور اس کا کوئی پیر بھائی اس کے قریب ہو تو یہ مرید خلوص دل اور محبت سے فائدے کے حصول کی نیت سے مثل پیر کے پیر بھائی کے ساتھ ملاقات کرے۔ اس سے اپنی اور اپنے پیر بھائی کی شرافت جان کر بد اعتقاد، بد ظن اور بد نیت نہ ہو۔ اور اسی طرح یہ نیت بھی صحیح کرو کہ جس جگہ آپ اپنے پیر بھائی کے پیچھے نماز پا سکتے ہو اور پہنچ سکتے ہو تو اس کے مقابلے میں کسی اور اہلِ طریقت کے پیچھے نماز پڑھنے کی خواہش دل میں نہ لانا۔ بلکہ اپنے اس پیر بھائی کے پیچھے نماز پڑھنا تمہارے لئے کسی دوسرے اہلِ طریقت کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ اپنا اور پرایا جان لو۔ حقیقت میں تم لوگ ایک دوسرے کے دوست، رشتہ دار اور اپنے ہو اور پیر کے واسطے سے تم لوگ ایک ہو۔ اور دیگر لوگ دوسرے طریقے کے یا دوسرے پیر کے مریدین، عوام وعلماء وہ سب آپ

لوگوں سے غیر اور الگ ہیں۔ وہ آپس میں شریک ہیں۔ اور ایک دوسرے کے حقدار ہیں اور آپ لوگ نہ ان پر حق رکھتے ہو اور نہ وہ لوگ آپ پر حق رکھتے ہیں۔ تو جب آپ کو اپنا حقدار پیر بھائی ملتا ہے تو دیگر لوگوں کو اپنا حقدار نہ بناؤ۔ بلکہ غیر حقدار لوگ اس وقت حقدار بنا دیئے جائیں گے جب تمہارا پیر بھائی تم سے کافی دور ہو اور تم وہاں تک نہ پہنچ سکتے ہو۔

پیارے دوستو! یہ بھی جان لو کہ امام ظاہری اور باطنی ہے۔ اسی طرح قبلہ ظاہری و باطنی ہے۔ جیسے کہ فرمایا کہ پانچ قبلے اور پانچ امام ہیں۔

کقوله: ”القبلة خمسة الامام خمسة امام الجسد المحراب۔ امام الروح القرآن۔ امام القلب محمدنالمصطفیٰ۔ و امام الفهم جبرئیل علیه السلام و امام العقل میکائیل علیه السلام۔ و قبلة الجسد المحراب و قبلة الروح بیت المعمور و قبلة القلب العرش و قبلة الفهم الکرسی و قبلة العقل الکعبة و من حفظ هٰذه المسائل بلا شبهة یجوز امامته من الرجال و النساء و من لم یحفظ هٰذه المسائل لا یجوز امامته عالما کان او جاهلا فقیها کان او غیر فقیه سواء کان حفظ القرآن او لم یحفظ بالاتفاق من جامع الفقه و کذٰلک فی الفردوس الفتوی الهدی و کذٰلک فی الفتاوی الدلائل فی بحث الامام فی فصل العاشر“۔

جان لو کہ قبلے بھی پانچ اور امام بھی پانچ ہیں۔ بدن کا امام محراب، روح کا امام قرآن، دل کا امام محمد مصطفی ﷺ، فہم کا امام جبرائیل علیہ السلام، عقل کا امام میکائیل علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح بدن کا قبلہ محراب، روح کا قبلہ بیت المعمور، دل کا قبلہ عرش، فہم کا قبلہ کرسی، عقل کا قبلہ کعبہ شریف ہے۔ جس نے ان مسائل کو سمجھ لیا تو اس کے پیچھے نماز بالکل صحیح ہے۔ یعنی اس کی امامت کے قوی ہونے میں کوئی شک نہیں اس کی امامت مرد وزن دونوں کیلئے صحیح ہے۔ اور جس نے ان مسائل کو یاد نہ کیا تو اس کی امامت صحیح نہیں۔ خواہ عالم ہو یا جاہل، فقیہہ عالم یا غیر فقیہہ لیکن ان کی امامت جائز نہیں۔ خواہ حافظ قرآن ہو یا غیر حافظ قرآن۔ یہ مسئلہ محققین علماء کا اجماعی ہے۔ اسی طرح اس مسئلہ کو فردوس الفتویٰ الھدیٰ، دلائل الفتویٰ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

فائدہ: (۱): ظاہر بدن کا امام محراب ہے۔ جس طرح مقتدی امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن امام جس طرح ارکانِ نماز، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ادا کرتا ہے تو مقتدی بھی اس کے قول و فعل کے مطابق تابعداری کرتے ہیں۔ اور امام کی نماز مقتدی کی نماز ہے۔ یہاں جو محراب کو امام کہا گیا ہے یہ صرف یکسوئی اور حضوری ملتی ہے تو نماز ادا کرتا رہے۔ لیکن اگر محراب نہ ہو یا کسی تکلیف، گرمی، سردی کی وجہ سے نمازی کو نماز میں یکسوئی و حضوری نہ ملے یا کمی محسوس ہو رہی ہو تو اس نمازی کو وہاں نماز ادا کرنی چاہئے کہ جہاں یکسوئی اور حضوری ہو۔ کیونکہ اگر صرف ظاہری محراب کو حقیقتاً امام اور قبلہ مان لیا جائے تو پھر کسی کی بھی نماز بغیر محراب کے نہ ہوگی چاہے گھر ہو یا بیابان۔ لیکن اصل حقیقت اس کی وہ حضوری اور یکسوئی ہے۔ اس لئے فرمایا آپ ﷺ نے ”لا صلوٰۃ الا بحضور القلب“ بغیر حضور دل کے نماز نہیں۔

(۲) روح کا امام قرآن مجید ہے۔ یعنی قرآن مجید کلام اللہ ہے۔ اور روح کلام اللہ کی تابع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح انسان سے فرمایا تھا۔ "الست بربکم" کیا میں تمہارا رب نہیں ؟ تو تمام ارواح نے کہا "بلیٰ" کیوں نہیں بے شک تو ہمارا رب ہے۔ اور جان لو کہ روح بھی اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے۔ "قل الروح من امر ربی" غور کیجئے کہ اپنے کلام کو اپنی روح کا امام بنا دیا۔ کیونکہ کلام اللہ مخلوق نہیں۔ اور روح جو خدا کا امر ہے اس کو بوجہ پیدا کرنے کے مخلوق کہا جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ روح امرِ خداوندی سے اور کلام اللہ تعالیٰ سے ہے۔ تو یہ روح بھی پہلے کلام اللہ کے تابع تھی۔ اور قبولیت کا اقرار کیا تھا۔ اور اب بھی کلام اللہ کے تابع ہو گی۔ اور اسی کلام اللہ کی تابعداری سے ترقی پائے گی۔ اور پھر اپنے پاک مقام تک رسائی ہو گی۔ بلکہ روح کی اس تابعداری سے بدن بھی اس اعلیٰ مقام، اللہ کی دوستی کو حاصل کر لے گا۔ اس لئے جب بھی دنیا میں کلام اللہ سنتا ہے تو روح کو وہی جذبات حاصل ہو جاتے ہیں۔ کہ اس جذبے کے نور سے بھی اسی مقام تک پہنچتا ہے۔ اور حضور کا صحیح مقام حاصل ہو جاتا ہے جس طرح روح نے اللہ تعالیٰ کا روبرو مشاہدہ کیا تھا اور اس درمیان میں کوئی اور چیز نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ امر فرماتا اور یہ قبول کرتی۔ اور بہت خوشی اور جذبات سے اللہ تعالیٰ کے نور میں مستغرق اور فنا ہو جاتی بوجہ انتہائی محبت قبولیت کے۔ اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے۔ "ان تعبد اللہ کانک تراہ" مطلب یہ ہوا کہ امام کو بھی قرآن کی تلاوت سے وہی عشق و محبت، لذت اور حضوری حاصل ہو گی۔ جیسے کہ پہلے حال روح بیان ہوا تو یہی امام کی روح کا معنی ہے۔ اس لئے فرمایا: "کل شئ یرجع الی اصلہ" ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ تو روح جس طرح امرِ خداوندی سے تھی تو اطاعت و محبت کلامِ خداوندی سے اسی طرف رجوع کیا۔

روح نہ امر سے جدا ہے اور نہ کلام اللہ سے۔ کلام بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور روح بھی امرِ خداوندی کی صفت ہے۔ پھر اپنے کلام سے اپنے امر کی صفت کو اپنا عابد بنایا۔ تو حقیقت میں عابد اور کلام امر سے ہے۔ اور کلام رب سے ہے۔ تو عابد اور کلام دونوں اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ اللہ تو اللہ ہے جو ذات ہے۔ اور عابد اور کلام ایک ہوا جیسے کہ امر یا کلام اللہ اور اللہ کی روح حقیقت میں امر سے ایک بات ہوئی۔ تو جس طرح امر اور کلام اللہ تعالیٰ سے ہے اور اللہ کی صفت ہے۔ تو اسی طرح روح اللہ کے امر کی صفت ہے۔ تو عابد اور اسکی تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ معبود ہے اور صفت اس کی عابد ہے۔ یعنی اللہ عابد بھی اور معبود بھی ہے۔ خود معبود اور خود عابد ہے۔

کقولہ: "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہی امام اور روح کے معنی ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ میں تو اور تو میں ہوں۔ "انا انت و انت انا" تو پیارے دوست ! جس طرح صفاتِ خداوندی ذاتِ خداوندی میں فنا ہیں اور عابد صفتِ خداوندی ہے یعنی جب یہ صفت یعنی عابد پھر اس میں فنا ہو جائے تو اس کے

بعد واصل ہو گا۔ یعنی عابد ایسی عبادت کرے یہاں تک واصل ہو جائے۔ اور جب واصل ہوا یعنی ذات کی صفات ذات میں فنا ہو گئیں تو پھر عابد نہ رہا جو صفت ہے بلکہ صرف ایک ذات رہ گئی۔ اور ذات تو عبادت نہیں کرتی بلکہ عبادت تو صفات کا کام ہے۔ اور صفات باقی نہ رہیں تو یہ مقام فنا ہے۔ جب تک عابد کی ایسی حالت ہوتی ہے تو کوئی عبادت نہیں ہوتی کیونکہ حقیقت میں عابد نہیں ہوتا تو عبادت کیا کرے گا۔ اور نہ اس بدن پر کوئی حق عبادت ہوتا ہے۔ لیکن جب فارغ ہو جاتا ہے اس حال سے تو پھر عابد معبود میں فنا ہو جاتا ہے۔ اور یہی حقیقت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ "کہ حقیقت میرا حال ہے" یہ حال طریقت کے بعد ہوتا ہے۔ جو طریقت کی خبر ہے۔ تو عابد اور معبود کا یہ حال ہے کہ بظاہر عابد اور باطن معبود ہے۔ ظاہر میں انسان اور باطن میں حق ہے۔ صرف اس کے ظاہر کو انسان عابد اور مخلوق کہا جاتا ہے۔ اور اس کا باطن حق اور معبود اللہ ہے۔ اس لئے فرمایا: "الانسان مرأۃاللّٰہ" انسان اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہے۔ اگر مجھے دیکھنا ہو تو مؤمن کے دل میں دیکھو۔ یعنی مؤمن کے حقیقی آئینہ میں مجھے دیکھو جو مؤمن کا باطن اور حقیقت ہے۔

وقولہ: "قلب المؤمن عرش اللّٰہ"۔

مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔

جان لو کہ ظاہر بدن ایک آلہ اور آئینہ خداوندی ہے۔ اور باطن اور حقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسری شے نہیں۔

جیسے کہ ایک عاشق صادق حضرت باباجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں (ترجمہ):

یہ سننا، بولنا، مانگنا رب سے جملہ تو ہے   تیرے بغیر کوئی نہیں بس تو ہی مولیٰ جملہ تو ہے

مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

ہر کہ آواز ہم زبانی شد جدا   بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

معنی یہ ہوا کہ جو کوئی زبان کی آواز سے جدا اور الگ ہوا تو وہ بے نوا ہوا اگرچہ سو جگہ نوا کی اور رکھتا ہو۔ یعنی انسان کا تصور جب اپنے کہنے کے ساتھ نہ ہو تو اس کے بعد اگرچہ وہ سو مرتبہ اپنے وجود میں تصور لائے تو وہ فضول بے نوا ہے۔ یعنی جب تو ذکرِ خداوندی کرے یا نماز میں کلام اللہ کی تلاوت کرے تو تمہاری روح زبان کے کلام کی طرف متوجہ ہو گی۔ اور اس کلام کے تصور میں تیری روح کو اس طرح مستغرق ہونا چاہئے کہ یہ تو کلام اللہ ہے۔ یعنی میری زبان پر تو اللہ کا فرمان ہے۔ تو تم اللہ تعالیٰ کے تصور میں مستغرق ہو گے دوسری طرف تمہاری فکر نہ ہو گی اور جب تمہاری روح تمہاری زبان سے جو کچھ بھی سنے چاہے کلام اللہ ہو یا ذکرِ خداوندی تو تمہاری روح خاص اسی طرف متوجہ ہو گی اور مستغرق ہو گی۔ جس طرح پہلے کلام "الست بربکم قالوا بلی" میں اس کی طرف متوجہ اور قبول کرنے والی ہو گئی تھی اور خاص کر امر کی تابعداری اور اطاعت قبول کی تھی۔ تو اسی طرح

اب بھی کلام اللہ کی قبولیت اور اطاعت کی طرف متوجہ اور خاص قبول کرنے والی ہو گی۔ اور اس سے بڑھ کر کوئی اور مقصد نہ ہو گا۔ اور اپنی زبان سے آواز سننا اللہ تعالیٰ کی آواز سمجھے گا۔ اور روح اس کی تابعداری اور اقتداء کامل حضور کے ساتھ کامل طور پر کرے گی۔ کہ اس ذکرِ خداوندی اور تلاوت کلام کی طرف متوجہ ہونا عین رب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ کیونکہ یہ سننا رب کی ذات کی صفت ہے۔ تو جب ذاتِ خداوندی کی صفت کی طرف متوجہ ہو جائے تو عین ذات کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ کیونکہ یہ صفت بھی ذات کی ہے۔ اور یہ صفت روح بھی ذات کی صفت ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں فرمایا ہے: کہ ایسی عبادت کرو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ تو جب روح کی صفت ذات کی اس سننے کی صفت کی طرف متوجہ ہو جائے تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ "ان تعبد اللہ کانک تراہ" یہ روح اور امام کے درمیان تفصیل ہو گئی۔ باقی صفاتِ خداوندی نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے عین ہیں اور نہ غیر۔ اس کی مثال یوں ہے کہ گیس کی روشنی جو نہ عین گیس ہے اور نہ غیر گیس۔ مطلب یہ کہ عابد ذاکر اپنے باطنی آئینے میں اللہ تعالیٰ کے نور کی وہ صفت تجلی جو دیکھنے اور سننے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھے گا جیسے کہ شیشے میں اپنا چہرہ۔ کہ نہ تو عین چہرہ ہے اور نہ چہرے کا غیر۔ بلکہ اس کا عکس ہے۔ تو اسی طرح عکس صفتی تجلی نورِ خداوندی عابد ذاکر اپنے باطنی آئینے میں ایسا ہی دیکھے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ تو وہ نہ عین خدا ہے اور نہ غیر بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کا عکس عارف مؤمن کے آئینۂ قلب میں دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بین باشی اگر اہلِ دلی

مولای صل وسلم دائما ابدا — علی حبیبک خیر الخلق کلھم

اللّٰھم ارزقنا بوجہ النبی الکریم ﷺ۔ وما توفیقی الا باللہ

الحمد للہ منشی الخلق من عدم — ثم الصلوٰۃ علی المختار فی القدم

(۳) قلب کے امام محمد مصطفی ﷺ ہیں۔ یعنی قلب کا نور محمد ﷺ ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: "انا من نور اللہ والمؤمنون من نوری" تو دل کی اقتداء اسی نورِ محمد ﷺ کے پیچھے ہے جو اس کے امام ہیں۔ جب نمازی عابد اس نور کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے جو نور اس میں محمد ﷺ کے نور سے ہے۔ تو یہ نورِ محمدی ﷺ کی عشق و محبت میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ اس کو فنا فی الرسول کہتے ہیں۔ پھر اس کا ظاہر وجود تو بدن دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باطن میں نبی کریم ﷺ کے نور مبارک کی جو تجلیٔ نور ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے۔ جو اس کو باطنی حقیقی نظر سے دیکھے تو اس کا باطن ایسا منور کر دے گا کہ جس طرح وہ خلق عظیم، اخلاق کی شرافت، آداب، عاجزی، اطاعت حضوری کے ساتھ حضور ﷺ کے تھے وہ تمام فضائل، فوائد و کمالات اس نور کے اس کے باطن میں پیدا ہو جائیں گے اور ظاہر میں بھی تمام افعال و اقوال، حرکات و سکنات اسی باطن کی طرح صحیح، پاک

اور درست ہو جائیں گے۔ تو ظاہر میں بھی اطاعت رسول کی صفت آجائے گی۔ تو ایسے بزرگ کے ظاہر وباطن کی اقتداء حقیقت میں حضور ﷺ کے پیچھے ہو گئی۔ اور جب اسے یہ شرافت نصیب ہوئی کہ اسے اپنے ظاہری وباطنی وجود کے بجائے اپنے باطن میں حضور ﷺ کا نور نظر آگیا۔ تو وہ اس کا حقیقی طور پر امام ہو گیا۔ اور جب آپ ﷺ کا عشق ومحبت اس پر غالب آجائے تو ذات بابرکات حضور ﷺ کے ساتھ اس کا ایسا وصل وتقرب آجاتا ہے کہ پھر اسے اپناوجود نظر نہیں آتا بلکہ فنا ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اور بجائے خود اسے عین محمد رسول اللہ ﷺ نظر آتے ہیں تو جب نورِ محمدی ﷺ اس کے ظاہر وباطن میں اسے نصیب ہو جاتا ہے تو اسے فنافی الرسول کہتے ہیں۔ اور اسے نبی ﷺ کا نائب کہتے ہیں۔

کقولہ۔ "الشیخ کالنبی" تو اس کے امام نبی ﷺ ہوئے اور اس کی اقتداء حضور ﷺ کے پیچھے ہو گئی۔ تو یہ اس بات کے لائق ہو گئے کہ جو بھی ان کی اقتداء کرتے ہیں تو یہ حق اور صحیح ہے۔

ان کی امامت اور اطاعت حقیقت میں حضور ﷺ کی اطاعت ہے۔ اور حضور ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور یہ عبادت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے ہی شخص کے پیچھے مقبول ومحبوب ہے۔ اس کا مطلب یعنی قلب کے امام حضور ﷺ ہیں۔ یہ ہے کہ عابد، مؤمن کا قلب متوجہ ہو گا حضور ﷺ کی طرف۔ اور حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں۔ اور رحمتِ خداوندی حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہے۔ اور حضور ﷺ خود بھی رحمتِ خداوندی ہیں۔ تو جو بھی اپنادل وروح حضور ﷺ کی طرف متوجہ کرے اور اپنی روح کی اقتداء حضور ﷺ کے پیچھے کرے تو یہ شخص عین رحمتِ خداوندی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور رحمتِ خداوندی اس شخص کی طرف خود بخود متوجہ ہو گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رحمت فرمایا ہے۔ اور اپناذکر اور آپ ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت فرمایا ہے۔ ان کی یاد کو اپنی یاد فرمایا ہے۔ تو جب عابد حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اور اس کی رحمت کی طرف متوجہ ہوا۔ تو ایسی اقتداء کرنا آپ ﷺ کے پیچھے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اقتداء ہے۔ کہ اس مقام میں عابد ومعبود کے درمیان کچھ حجاب نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر آئینہ محمدی ﷺ کی طرف توجہ کی تو اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا اور یہ توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی۔ اور بہت جلد ہی واصل الی اللہ ہو گا۔ اور دوست ومحبوب ہو جائے گا۔ باقی تفصیل گزر چکی ہے۔ یہ حقیقت قلب کے امام کی ہے۔ "اللّٰھم ارزقنابوجہ النبی الکریم"

(۴) فہم کے امام جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ وہ اخبار جو منجانب اللہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپناراز سمجھانے کیلئے اور اپنی طرف سے اظہار کرنے کیلئے اور مخلوق کو دعوت دینے کیلئے اور ڈرانے کیلئے آپ ﷺ کے دل مبارک میں اپنے احکام واوامر ڈالتے۔ اور اس کی وحی فرماتے۔ "ان ھو الا وحی یوحی" اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کو ارسال فرماتا۔ ان کے آنے سے وہ وحی رسول اللہ ﷺ کے دل مبارک میں ہو جاتی۔ اور رازِ خداوندی آپ ﷺ کے منہ مبارک

سے ظاہر ہو جاتا۔ اور یہ فہم اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں ڈال دیتا۔ اسی طرح جب ایک عابد مقام مذکور یعنی فنا فی الرسول کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے دل کو یہی فہم اور القائے خیر جبرئیل علیہ السلام سے دیا جاتا ہے۔ اور یہ عابد اس فہم کے مطابق عمل کر کے روحانی منزل طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ اپنے ظاہر و باطن میں یہ نہیں دیکھتا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ لیکن اس کی سمجھ ایسی صحیح و مقبول ہوتی ہے۔ جس طرح سمجھ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی منجانب اللہ صحیح ہوتی ہے۔ تو اس عابد کی سمجھ کی اقتداء حضرت جبرئیل علیہ السلام کی فہم کے پیچھے ہوتی ہے۔ گویا کہ وہ اس عابد کے امام ہیں۔ تو اس عابد کا فہم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اوامرِ خداوندی کا مخالف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا فہم حقیقت میں منجانب اللہ ہے۔ اور یہ خود بھی ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ خواہ نماز میں ہو یا دیگر عبادات میں۔ تو یہی امام کے فہم کا معنی ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے فہم جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے۔ اور تمام مخلوق یعنی مؤمن و مسلمان اس فہم سے سمجھ گئے ہیں۔ تو تمام کے فہم کے امام وہ ہیں۔

(۵) عقل کے امام میکائیل علیہ السلام ہیں اس لحاظ سے کہ اولین و آخرین تمام مؤمنوں مسلمانوں کی عقل کی اقتداء ابتداء سے ان کے پیچھے ہے۔ اس لئے وہ امام عقل ہیں۔ کیونکہ ان کے واسطے سے عقل دی گئی۔ اس لئے ظاہری بدن کا امام محراب، امام روح قرآن ہوا کہ روح کی اقتداء قرآن کے پیچھے ہے۔ قلب کے امام محمد مصطفی ﷺ اور فہم کے امام حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اس کی اقتداء ان کے پیچھے ہے اور عقل کے امام میکائیل علیہ السلام ہیں عقل کی اقتداء ان کے پیچھے ہے مطلب یہ ہوا کہ جب مؤمن کے قلب کی اقتداء یعنی کہ اصل میں روح اور قلب ایک ہیں۔ یعنی اصل میں روح ہے۔ تو جب روح مؤمن کی اقتداء حقیقت میں حضرت محمد ﷺ کے پیچھے ہو جائے تو کلام اللہ جس کو ہم قرآن کہتے ہیں یہ کلام ازل میں روح کے ساتھ اپنے رب کا ہوا تھا۔ جیسے **"الست بربکم قالوا بلی"** تو اسی طرح یہ کلام ربی جو قرآن ہے تو یہ باتیں محمد مصطفی ﷺ کے ساتھ اللہ کی طرف سے ہوئی ہیں۔ تو جب عابد مؤمن فنا فی الرسول ہو جاتا ہے یعنی آپ ﷺ کے عشق و محبت کے جذبے میں فنا ہو جاتا ہے تو اس نورِ محمدی ﷺ کا غلبہ اس سے اپنا ظاہر و باطن چھپا دیتا ہے۔ اور نورِ محمدی ﷺ کے ساتھ ایک نور بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ نور اللہ تعالیٰ کا روبرو مشاہدہ یعنی دیدار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بغیر درمیانی حجاب کے کلام فرماتا ہے۔ اور راز و نیاز کرتا ہے۔ اسی کو مشاہدہ کہتے ہیں۔ اور یہی وہ معراج ہے۔ **"الصلوٰۃ معراج المؤمنین"** نماز مؤمن کی معراج ہے۔

اس مقام میں مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

میانِ عاشق و معشوق رمزیست ‏ ‏ ‏ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

پیارے دوست! تو پھر اس مقام میں فرشتے بھی نہیں سما سکتے کیونکہ پھر وہاں عقل و سمجھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب انوارِ خداوندی کے غلبے کا حال نورِ محمدی ﷺ کے تصور اور استغراق میں عابد پر غالب آجاتا ہے۔ تو پھر فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے کہ یہاں عابد کی عقل، سمجھ، علم، دانائی و بینائی اور بشریت کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہ حال ہمیشہ نہیں رہتا۔ یہ بعض اوقات عابد زاہد پر آتا ہے۔

"اللّٰھم ارزقنا بوجہ النبی الکریم ﷺ۔ اللّٰھم آمین یا رب العٰلمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ"

(۱) ظاہر بدن کا قبلہ ظاہر محراب ہے۔ ایک امام ظاہر صورت میں محراب کی طرف ایسا کھڑا ہے جیسے کہ قبلے کی طرف۔ اس کو صرف اس کھڑے ہونے کے لحاظ سے قبلہ کہا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ محراب قیامت کے دن خصوصی طور پر امام کی عبادت کی گواہی دے گا۔ کہ آیا اس نے پنج وقتہ متابعت کی ہے یا نہیں؟ امام کے بارے میں بالکل صحیح گواہی پیش کرے گا۔ اور یہ گواہی امام کی نجات کا سبب ہے۔ اس وجہ سے اس کو بدن کا قبلہ بھی کہتے ہیں۔

(۲) روح کا قبلہ بیت المعمور ہے۔ جو ساتویں آسمان میں فرشتوں کا قبلہ ہے۔ نمبر وار ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں وعلیٰ ھٰذا القیاس۔ تا قیامت یہ سلسلہ جاری ہے۔ کہ ستر ہزار فرشتے آکر جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کی زیارت کیلئے بھی ستر ہزار فرشتے آتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ جن فرشتوں کا نمبر ایک مرتبہ آچکا ہے تو پھر دوبارہ ان کو نمبر نہیں ملتا۔ یعنی مزار نبوی ﷺ بھی زیارت گاہ فرشتگان ہے۔ اسی طرح مزارات اولیاء بھی زیارت گاہِ ملائکہ ہیں اس مسئلے کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اصل بات اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ بیت المعمور ساتویں آسمان میں فرشتوں کا قبلہ ہے۔ جو بیت اللہ شریف (کعبہ شریف) کے برابر ہے۔ کہ روح کی اقتداء اللہ تعالیٰ کی جانب اسی بیت المعمور کی طرف ہے۔ اور وہ روح کا قبلہ ہے اس مقام کو قبلہ عالم ملکوت کہتے ہیں۔

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ اہلِ طریقت، مخلص، صادق، محب، باحیا اور مؤدب اس مقام تک اپنے پیر کی تعلیم وارشاد اور دوسرے سبق نفی واثبات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ جو یہ سبق ہے: "لا الٰہ الا اللّٰہ" یعنی جب بھی طالبِ طریقت یہ سبق پڑھتا ہے تو اس کی روح عالمِ ملکوت میں اللہ تعالیٰ کی جانب بیت المعمور کی طرف منہ کر کے متوجہ ہو جاتی ہے۔ اور اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی طرف معراج کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف قیام اور اقتداء کے ذریعے بیت المعمور کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور ظاہری بدن سے روحانی تصور اٹھ جاتا ہے۔ اس مقام میں اپنے آپ پر یعنی عرش معلّٰی سے نور کا برسنا دیکھتا ہے۔ اور انوار عرش معلّٰی کا مشاہدہ کرتا ہے اور عرش معلّٰی کے یہی انوار بھی نورِ محمدی ﷺ سے ہیں۔ تو ان انوار کے ذریعے حقیقت میں روح کو ترقی، لذت، عشق و محبت اور جذبات حاصل کرنا ہے۔ یہ مختصر سے مطالب روح کے قبلے کے ہیں۔ یہ بیت المعمور وہ مقام ہے۔ کہ شبِ معراج آپ

ﷺ یہاں یعنی اس قبلے کی طرف تمام آسمانی فرشتوں کے امام تھے۔ اور ملائکہ نے آپ ﷺ کی اقتداء کی تھی۔ اس لئے یہ کامل مؤمن امتی کی روح کا قبلہ ہوا۔

(۳) دل (قلب) کا قبلہ عرش ہے۔ یہ قلب وہی روح ہے کہ جس کا قبلہ بیت المعمور تھا۔ لیکن جب ان انوار سے ترقی اور فیض حاصل کیا تو مقامِ عرش تک پہنچا۔ اس مقام کا سبق اسم ذات ہے۔ یعنی اللہ صحیح صادق، مخلص محب طالب طریقت کی روح جب بھی اسم ذات کے ذکر کی زیارت سے منور ہوتی ہے۔ اور بلندی کی طرف ترقی حاصل کرتی ہے۔ تو عرش اس کا قبلہ ہو جاتا ہے۔ یعنی عرش معلی میں نورِ عرش کی طرف قلب یعنی روح کی اقتداء ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اس کا قبلہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا ہے۔

کقولہ: "قلب المؤمن عرش اللہ" اس وقت روح یعنی جس کو قلب کہا جاتا ہے۔ عین اللہ تعالیٰ کا عرش ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہو جاتا ہے۔ پھر اس مقام قلب (عرش اللہ) میں انوارِ الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اسی طرح ترقی کے حصول کیلئے انوار کا فیض حاصل کرتا ہے۔ تاکہ روح اور بلند ہو کر واصل الی اللہ ہو جائے۔ یہ مختصر حال قلب کے قبلے کا ذکر ہوا۔

(۴) فہم کا قبلہ کرسی ہے۔ کرسی وہ مقام ہے کہ سونے سے بنا ہے اور عرش کے نیچے ہے۔ اور یہ ان ملائکہ کا قبلہ ہے کہ جو ہمیشہ عشق و محبتِ خداوندی میں اس مقام میں حالتِ جذب میں ہیں۔ یعنی عشقِ خداوندی کی وجہ سے اس مقام میں چھلانگیں مارتے ہیں۔ تفسیر معدن الاسرار میں نسیم الارواح کے حوالے سے منقول ہے۔ کہ شبِ معراج آپ ﷺ نے فرشتوں کی ایک جماعت دیکھی کہ عرش و کرسی کے درمیان جذبہ عشق میں اوپر نیچے جاتے تھے۔ جس طرح ایک مست اور بے خبر پریشان عاشق کا حال ہوتا ہے کہ ادھر ادھر جاتا ہے۔ یہی حال ان فرشتوں کا تھا۔ کہ عشق و محبت کے جذبے سے کبھی کرسی سے عرش تک چھلانگ لگاتے اور کبھی حالتِ مستی میں عرش سے کرسی پر بے اختیار گرتے۔ حضرت محترم محبوب مدنی ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ان فرشتوں کا حال پوچھا۔ آپ ﷺ کو ان کا علم تھا مگر پھر بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا۔ "یا سید الانبیاء" مجھے ان کے پورے حالات کا علم نہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ فرشتے سرمستان بادۂ جمال یعنی خداوندی کے مست عاشق ہیں۔ اور دیدارِ خداوندی کے عشق و شوق اور برتری کی وجہ سے اس حالت میں مستغرق ہیں۔

پیارے دوست یہی کرسی ان ملائکہ کا قبلہ ہے اور ان فرشتوں کو کروبیان کہتے ہیں۔ یہ ان کے نام ہیں۔ اور یہ کرسی بیت المعمور سے اوپر اور عرش کے نیچے ہے۔ اور یہ اس مقام کے فرشتوں کا قبلہ ہے۔

فائدہ: جب مخلص صادق اثبات کے ذکر "الا اللہ" کے جذبۂ عشق میں آتا ہے۔ تو اس کی روح عرش کے نیچے مقام کرسی میں اسی طرح مستی کے حال میں آتی ہے کہ جس طرح حال اس مقام کے فرشتوں کا ہے۔ اس سبق کی ابتداء کا مقام وہی بیت

المعمور ہوتا ہے۔ لیکن جب عشق و مستی کے جذبے کے حال میں آتی ہے تو کرسی کے انوار کے عشق و جذبے میں اس کی نورانی روح اوپر نیچے عروج اور نزول کرتی ہے یعنی اوپر نیچے جاتی ہے۔ اور جب اسم ذات کا سبق "اللہ" شروع کرتا ہے تو اس کی روح کو اس سبق اسم ذات سے ایسی ترقی حاصل ہو جاتی ہے کہ مقام عرش میں اس کا گھر ہو جاتا ہے۔ اور اس مقام میں اس کو ایسا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ جیسا مسافر تھکا ماندہ سفر سے اپنے گھر آ جاتا ہے۔ اور پھر اپنے گھر کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس روح کو اس مقام میں قلب اس لئے کہتے ہیں کہ اس مقام میں اس کی مثال گھر کی ہو جاتی ہے۔ اور ایسا گھر کہ جو عرش ہے اور نور سے ہے۔ تو اس کی روح اللہ تعالیٰ کیلئے مانند گھر کی ہے۔

کقولہ: "قلب المؤمن بیت اللّٰہ" مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ جان لو کہ اس مقام میں مؤمن کی روح اللہ تعالیٰ کا مکان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس گھر کا مکین ہوتا ہے۔ لیکن یہ مکان ایسا ہوتا ہے کہ۔ المؤمن مرآۃ یعنی اس وقت اس کی روح اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال جیسے کہ سورج پانی میں نظر آتا ہے۔ لیکن ذاتِ سورج عین پانی میں نہیں ہوتی لیکن پانی بھی ذاتِ سورج کا غیر نہیں ہوتا۔ یا چہرہ جیسا کہ آئینہ میں نظر آتا ہے تو آئینہ نہ عین چہرہ ہے۔ اور نہ چہرے سے جدا اور غیر ہوتا ہے۔ اس کا ظاہر ذات کا آئینہ کہلاتا ہے۔ لیکن باطن میں ظاہر ذات کا چہرہ نظر آتا ہے اور دیکھا جاتا ہے۔ یہ آئینہ کی صفت ہے کہ اس میں چہرہ نظر آتا ہے۔ اور ایسا کہ جس طرح چہرہ ہوتا ہے لیکن عین چہرہ نہیں ہوتا لیکن چہرے کا غیر بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح عابد وزاہد کی روح کے آئینہ میں اسے اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی نورانی قدرت کا جمال اس طرح نظر آتا ہے کہ وہ ایک لا تعداد، بے ابتداء اور بے انتہا نظر آتی ہے۔ یعنی نہ اول و آخر اور نہ اس کی کوئی حد اور مقدار و اندازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی اپنا جمال و جلال مؤمن کی روح کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ یعنی اپنے جمال و جلال کا تماشہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے روح کو اس مقام میں قلب کہا جاتا ہے۔ اور اصل میں روح ہے۔ کہ اس مقام میں اس کا قبلہ عرش ہے۔ یہ ایک حصہ روح کا جو قلب کے نام سے موسوم ہے اور اس کا قبلہ عرش ہے کہ ساتھ بیان ہوا۔ اس مسئلہ میں کہ فہم کا قبلہ کرسی ہے۔ کہ اس مقام میں عاشق کو صرف اتنی فہم ہوتی ہے کہ یہ عشق کے جذبے کی مستی ہے۔ اور اسی کے مناسب کچھ سمجھ ہے۔ اس مقام میں فہم کے قبلے کے بارے میں یہ مختصر سی تفصیل بیان کی گئی۔

(۵) کعبہ عقل کا قبلہ ہے۔ یعنی بیت اللہ شریف کہ دنیا بھر کے تمام عبادانِ خدا اللہ تعالیٰ کی طرف اس کعبہ کی جہت سے متوجہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ان کا کعبہ ہے۔ لیکن اس کو عقل کا کعبہ اس لئے کہا گیا کہ اس کعبہ کی متابعت ان صاحبانِ عقل نے کی ہے کہ تمام عقلوں کی اقتداء انہی کے پیچھے ہے۔ اور یہ صاحبانِ عقل اور آئمہ عقل انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور ان کی عقل کی بناء پر تمام مسلمانوں کی عقلوں نے ان کی اقتداء کی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اور ان کی عقلوں نے یہ مانا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے انوار

ورحمتوں کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کو عقل کا کعبہ اس بناء پر بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف نماز پڑھنا یا اس کا ادب وعزت کرنا ان لوگوں کا کام ہے کہ جن میں عقل وشعور ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں میں عقل وہوش نہیں ہوتا تو ان کی عبادت کو عبادت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ نہ تو آدابِ عبادت جانتے اور سمجھتے ہیں اور نہ ہی خیر وشر کی تمیز کر سکتے ہیں اور قبلہ وغیر قبلہ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بے عقل لوگوں کے بارے میں فرمایا: "ولا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰری" اس لئے کعبہ کو عقل کا قبلہ کہا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عقلمند وہ لوگ ہیں جو اس کعبہ کے مؤدب وتابعدار ہوں۔ کیونکہ جو اس کعبہ کی تعظیم وادب نہ کرے تو اس کو کافر کہا جاتا ہے۔ اور کافروں کی عقل نہیں اس لئے ان کا یہ کعبہ نہیں ہے۔ کافر عقل سے محروم ہیں۔ اور یہ کعبہ عقل والوں کا ہے اور ان کا ہے جو صاحبانِ عقل اور اللہ رب العزت کے دوست ہیں۔ یہ پانچ قبلوں کی تفصیل تھی کہ عرش قلب مؤمن کا قبلہ ہے۔ اور جسے یہ مقام نصیب ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اور یہ عرش نور سے ہے۔ اور کرسی فہم مؤمن کا قبلہ ہے۔ جو خاص عاشق ملائکہ کا قبلہ ہے۔ بیت المعمور مؤمن کی روح کا قبلہ ہے۔ جو تمام فرشتوں کا قبلہ ہے۔ بیت المقدس یہ تمام رسولوں کا قبلہ ہے۔ پانچواں قبلہ کعبہ شریف ہے۔ جو تمام مؤمنوں کے ظاہری بدن کا قبلہ ہے۔ عرش اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے۔ کرسی سونے کی ہے۔ بیت المعمور یاقوت سے بنا ہے۔ بیت المقدس مروارید سے بنا ہے۔ کعبہ شریف پتھر سے بنا ہے۔

یہ مختصر سی تفصیل پانچ قبلوں کی ہو گئی۔ اور یہ اس گزشتہ عبادت کی تشریح تھی جس کا بیان پانچ امام وپانچ قبلوں کے متعلق لکھا گیا تھا۔ یعنی فرمایا کہ جس نے ان مسائل کی حفاظت کی۔ یعنی ان کو سمجھ لیا تو بے شک اس کے پیچھے نماز صحیح اور جائز ہے۔ خواہ امّی ہو یا عالم اس کے پیچھے تمام مسلمانوں کی نماز درست ہے۔ اور اگر ان مسائل کو نہ جانا اور عمل نہ کیا تو اس شخص کی امامت جائز نہیں خواہ عالم بھی ہو لیکن اس کی مثال جاہل کی ہے۔ خواہ فقیہہ عالم ہو یا غیر فقیہہ لیکن اس بات میں برابر ہے کہ ان کی امامت صحیح نہیں۔ خواہ حافظ قرآن ہو یا غیر حافظ قرآن ہو۔ اور یہ مسئلہ تمام علماء کے نزدیک متفقہ ہے۔

اس مسئلہ کو فردوس الفتاویٰ الھدیٰ، فتاویٰ دلائل میں باب الامام میں لکھا گیا ہے۔ یہ مسئلہ جو ظاہری عبادت ہے اور اس نے پانچ امام اور پانچ قبلے بتائے ہیں۔ تو صرف اس کا ظاہر یہ ہے کہ پانچ امام فلاں فلاں ہیں۔ اور پانچ قبلے فلاں فلاں ہیں۔ تو یہ ظاہر علماء کے نزدیک ہے۔ لیکن اس کی ظاہری معرفت بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ لیکن اس کی جو تفصیل بیان ہوئی کہ جس میں اس کی حقیقت باطن کا بیان ہوا تو وہ تو دنیا میں بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں۔ اور جن کو معلوم ہے تو وہ وہ لوگ ہوں گے کہ جو انتہائی زیرک، باریک بین، اہلِ شریعت وطریقت، اہلِ حقیقت ومعرفت ہوں گے۔ باقی یہ جو حقیقت بیان ہوئی ہے تو اس حقیقت کی اصل حقیقت یہاں مختصر الفاظ میں بیان کی جاتی ہے۔ جو خود بھی بہت کم اور خواص محققین طریقت کو نصیب ہوتی

ہے۔ جس کو نماز طریقت کہتے ہیں اور طریقت کی نماز حقیقت ہے اور معرفت اس حقیقت میں ہے۔ یہ نماز طریقت ہمیشہ یعنی ساری زندگی ہے اور اہلِ طریقت کیلئے اس نماز کی جگہ (مسجد) دل ہے۔ اس نماز کی جماعت باطنی قوت کا توحید کو باطنی زبان سے سننے کا شغل ہے۔ اس کا امام شوقِ دل ہے۔ اس کا قبلہ حضرت الاحدیت ہے۔ اس کا جمال صمدیت ہے۔ پس روح و قلب اس نماز میں ہمیشہ مشغول ہوں گے۔ کیونکہ دل نہ سوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ ''القلب لاینام ولا یموت'' اور نمازِ دل توحیاتِ دل سے متعلق ہے۔ بغیر قیام وآواز کے، بغیر قعود وسجود کے۔ خطابِ دل اللہ کے ساتھ باطن کی زبان سے یہ ہوگا۔ ''ایاک نعبد وایاک نستعین''

فائدہ: مختصر مطلب یہ ہے کہ اہلِ طریقت کا دل مسجد حقیقی ہے۔ اور یہ ہمیشہ کیلئے پوری زندگی کیلئے اپنی باطنی مسجد میں نمازی ہے۔ اور اس کا جمعۃ المبارک باطنی زبان سے ''اللہ'' کہنا جو کلمۂ توحید ہے اور مکمل باطنی طور سے سننے کا شغل ہے۔ اس نے اپنا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا ہوتا ہے۔ یعنی باطنی زبان سے ''اللہ'' کہتا ہے۔ اور کلی طور پر سننے میں مستغرق ہوتا ہے۔ اور اس کا باطنی شوق و جذبہ اس کا امام ہے۔ جو شوق و عشق کی زبان سے ''اللہ'' کہتا ہے اور ''اللہ'' سنتا ہے یعنی شوق اس کا امام ہے۔ ''اللہ'' کہنا اور ''اللہ'' سننا ہے۔ بس یہی اس کا کام ہے اور یہی اس کی قرآت ہے دل کی مسجد میں۔ اور اس کا قبلہ واحد لا شریک ہے۔ یعنی ایک ذاتِ احد اس کا قبلہ ہے۔ یعنی وہ ذات جس کی طاقت واحاطہ تمام موجودات پر ہے۔ یہی معنیٰ احدیت کا ہے۔ اور یہ حقیقت میں قبلہ ہے۔ اور صمدیت اس کی زینتِ نورانی، حسن اور جمال ہے۔ یعنی بے مثل ہے۔ یعنی وہ احد جو بے مثل ہے وہ اس کا قبلہ ہے اور یہی قبلہ کی حقیقت ہے۔ پس دل وروح ہمیشہ مشغول ہوں گے اس نماز میں کیونکہ دل اصل میں روح ہے۔ اور روح مرتی نہیں اور نہ سوتی ہے۔ اور دل کی نماز دل کی حیات کے ساتھ ہے یعنی جب تک دل کا زندہ ہونا ثابت ہو جائے تو یہ نماز بھی ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ مؤمن تو دنیا میں فرض نماز ونوافل وغیرہ حسبِ طاقت سونے کے وقت تک اور آخرکار مرنے کے وقت تک دنیا میں ظاہری طور پر ادا کرتے ہیں۔ لیکن مؤمن کی روح دونوں حالتوں میں نماز پڑھتی ہے۔ یعنی دنیا میں سوتے جاگتے میں۔ خواہ ظاہری بدن سے ہو یا ظاہری بدن کے مرنے کے بعد ہو تو پھر وہ ایسی نماز ادا کرتے ہیں جو شوق ومحبت کی نماز ہے۔ جس کا بیان گزر چکا ہے۔ کہ شوق اس کا امام ہے اور نماز دل بغیر قیام وارکان وغیرہ کے ہے۔ اور باطنی زبان سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خطاب ہوگا۔ ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' الغرض سالک طالب اپنے باطن میں عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوگا۔ اور اس عبادت کی مدد بھی اللہ تعالیٰ سے مانگے گا۔ اور باطنی شوق اس کا امام ہوگا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ''اللہ'' اس کے شوق کی زبان کا ذکر ہوگا۔ اور ان تمام کی طرف تصور کرنا جماعت کی طرح ہوگا۔ اور باطنی کانوں سے سنے گا یعنی دل کے کانوں سے۔ اللہ اور قبلہ اس کا بے مثل احدیت ہوگا یعنی پروردگار عالم کی ذات کے شوق میں اس کی روح اس کے باطن میں کلی

طور پر متوجہ ہو گی۔ اور روح کے جذبہ اور شوق سے ''اللہ'' کہے گا۔ ''اللہ'' سنے گا۔ اس کی مثال بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ بس یہی حقیقی نمازِ طریقت ہے۔

مختصر سے الفاظ میں اس مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے۔

انوار کے دیکھنے سے روح اس ذات کی طرف متوجہ ہوتی ہے کہ جس کا احاطہ تمام موجودات پر ہے۔ اوپر نیچے اور ہر طرف۔ نہ اس کی ابتداء اور نہ اس کی انتہاء ہے۔ ہر جگہ اوپر نیچے، ظاہر، باطن موجود ہے۔ تو روح نور کی آنکھوں اور غلبے سے دیدارِ حق اور اس ذات کو دیکھتی ہے۔ اور اپنی روح کے باطنی آئینے میں ذاتِ خداوندی کے انوارات کا چہرۂ قدرت ایسے دیکھتا ہے جیسا کہ اپنا چہرہ آئینے میں۔ یا سورج پانی میں۔ بوجہ شغل ذکر خداوندی یعنی اسم ذات ''اللہ'' کا کہنا، سننا اپنے باطن میں اور اس کا ظاہر بھی اس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یعنی باطن میں اس کا دیکھنا، سننا اور بولنا ''اللہ'' ہے۔ اس طریقے سے جس کا بیان ہو چکا ہے۔ اور اس کے بدن میں اس کی روح عشق کے جذبے سے بہت مست ہوتی ہے۔ بس اسی طرح نماز عاشق ذاکروں کی ہوتی ہے۔ ہر حال میں جب ان پر ذات خداوندی کی صفات سے سننے کی تجلی وارد ہوتی ہے۔ تو اس کے ظاہری کان تمام دنیا و آخرت کا سنتے ہیں۔ اور ذاتی صفات میں سے تجلی کن (کرنے کی) وارد ہوتی ہے تو پھر ظاہر منہ سے جو کہا تو وہ ہوتا ہے۔ خواہ زندہ کرنا یا مارنا ہو جو کچھ بھی ہو۔ لیکن اس طرح خلافِ عادت کام اولیاء اللہ حتی الامکان و حسبِ طاقت نہیں کرتے جو ظاہر سے مخالف ہوں۔ لیکن یہ شاذ و نادر ان سے جذبات کے غلبہ کے وقت بے اختیار صادر ہو جاتے ہیں۔ باقی اسم ذات کے ذکر کے مقام پر اکثر عاشق انتہائی جذبہ کی وجہ سے فنا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نور کے غلبے کے انوارات میں۔ فنا یہ ہے کہ فنا اور ذات قائم ہوتی ہیں۔ یعنی بشریت کی صفت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ عاشق کے بدن کے ساتھ ذات کی صفات قائم ہو جاتی ہیں۔ اور جب نفی اثبات کا ذکر کرتے ہیں تو لا الہ سے تمام موجودات کو فنا کرتے ہیں یعنی تمام موجودات کی نفی کرتے ہیں۔ اور الا اللہ کے ساتھ تمام موجودات کی جگہ ایک موجود حقیقی ان کی نظر باطن و ظاہر میں قائم ہوتی ہے۔ یہ ان کا ذکر ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ ظاہر ایک پردہ حجاب ہے۔ انسان کیلئے جب نفی اثبات سے یہ ظاہری پردہ دور ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کو دیکھ لے گا۔ جو نہ عین ہو گا نہ غیر یعنی یہ صرف ایک نقطہ ہے جو غیر کے غ پر ہے۔ غین پر ایک نقطہ ہے اگر یہ نقطہ دور کیا جائے تو عین ہو جائے گا۔ عین اور غین حقیقت میں ایک ہے۔ جب نقطہ کا اعتبار کیا جائے تو غیریت ہو جاتی ہے۔ صرف یہی ایک نقطہ عین پر غین کا ہے۔ یعنی انسان کا یہ ظاہر وجود اللہ و انسان کے درمیان انسان کیلئے ایک حجاب و پردہ ہے۔ اور انسان کے وجود کا ظاہری لباس اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اگر یہی پردہ انسان نے اپنے تصور سے پسِ پشت گرا دیا جس طرح گھونگھٹ کو چہرہ سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور دوسروں کو دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح اگر یہی پردہ انسان اپنے بدن سے مانند گھونگھٹ کے دور کرے تو

اپنے بدن میں بلکہ اپنی جگہ پر بھی اللہ کو دیکھ لے گا۔ دور نہیں ہے نزدیک ہے اپنے بدن میں پایا جاتا ہے۔ "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ "ھم وراء السوراء" وہ نزدیکیت ہماری روح کی طرف ہے۔ جب جسم نہ تھا اور روح کو اپنے امر سے پیدا فرمایا۔ جو صفتِ خداوندی ہے یعنی صفت سے پیدا فرمایا۔ تو یہ ایسا قرب ہے اللہ تعالیٰ کا ہماری طرف۔ یعنی ہماری روح فنا تھی ذاتِ خداوندی میں۔ پھر یہ روح اس مقام تک پہنچتی ہے۔ یعنی عاشق پر وہی حال واقع ہو جاتا ہے کہ صفات ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک ذات باقی رہتی ہے باطنی نظر کی حقیقت میں۔ جس طرح کہ دودھ کی حقیقت کہ وہ گھی ہے یعنی مکھن۔ جب بھی گھی کا یہ پردہ مکھن سے دور کیا جائے جو دودھ کا پردہ ہے۔ تو مکھن ظاہر ہو جاتا ہے جو حقیقت ہے۔ تو اب وہ حقیقت ظاہر ہو گئی اور وہ ظاہری دودھ فنا ہو گیا۔ اور اس کی جگہ دوسری شے ظاہر ہو گئی۔ یعنی ایک تو دودھ سے حقیقت ظاہر ہو گئی اور وہ ظاہری دودھ فنا ہو گیا۔ اور اس کی جگہ دوسری شے ظاہر ہو گئی۔ یعنی ایک تو دودھ سے حقیقت ظاہر ہو گئی جو مکھن ہے اور دوسرا یہ کہ دودھ کا ظاہر ظاہر نہ رہا۔ یعنی اس کا ظاہر فنا ہو گیا۔ اور اس سے دوسری چیز بن گئی۔ تو اس کی ظاہر بھی حقیقت ہو گئی جب وہ فنا ہو گئی اور دوسری شے اس کی جگہ قائم ہو گئی یعنی اب اس دودھ سے الگ ہوا تو دودھ دودھ نہ رہا اور اس کا ظاہر اور نام بھی اس طرح بدل گیا کہ اب اس کو دوسری چیز کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہی حال عاشق مستغرق کا ہے۔ جس کو ولی فنا فی اللہ، واصل الی اللہ کہتے ہیں۔ اس کی مثال دودھ کی سی ہے۔ یعنی جس طرح دودھ جس چیز سے بنا ہے جس کی حقیقت گھی ہے یعنی روغن چکناہٹ۔ جب ظاہر ہوا تو اسے دودھ کہتے ہیں۔ اور جب کچھ مشقت کرے اور کچھ وسائل بھی تلاش کرے مثلاً دہی کا کچھ حصہ پانی جس کو دودھ میں دہی بنانے کیلئے ڈالا جاتا ہے تو پھر اس کا حال بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑا پکایا جائے تو اس کی حقیقت باہر آ جاتی ہے۔ جو اس کی شروع کی اصل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی حقیقت اصل میں اللہ ہے اور انسان اس ذاتِ حقیقی سے ایک صفت ظاہر ہوئی ہے اس ذات کے ارادے سے۔ اس کو انسان کہا جاتا ہے۔

حقیقت کو اصل ذات نہیں کہا جاتا۔ لیکن جب بھی یہ انسان بیعت کرے جیسا کہ دودھ میں دہی کا کچھ تھوڑا حصہ ڈالے پھر اس بیعت کے مناسب مشقت کرے۔ یعنی ذکر خداوندی کا اہتمام کرے تو پھر اس شخص کا وہی حال ہو جاتا کہ دودھ سے گھی نکل آتا ہے۔ اور دودھ ظاہر میں دودھ بھی نہیں رہتا۔ اسی طرح بیعت و مشقت کے بعد صادق عاشق پر یہ حال واقع ہوتا ہے۔ پھر اس کی پہلی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حقیقت قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں اور اس کی نظر میں جس کو فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ اور اس کا ظاہر وہ ظاہر نہیں ہوتا صرف ان لوگوں کو وہ ظاہر نظر آتا ہے جنہوں نے پہلے دیکھا ہو لیکن وہ ظاہر بھی اور لوگوں کی طرح نہیں ہوتا جیسا کہ دودھ جب مشقت سے بدل گیا اور اس کی حقیقت ظاہر ہو گئی اور دودھ کا ظاہر بدل گیا بوجہ مارنے کے اسی طرح طریقت کی مشقت ذکر کی وجہ سے یعنی غلبہ ذکر سے حقیقت بھی ظاہر ہوئی جو

عاشق کا اکثر حال ہوتا ہے۔ اور ظاہر میں اسے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور پھر اس کا ظاہر بھی اور لوگوں کی طرح نہیں ہوتا یعنی اس کے ظاہر میں بھی اسی طرح صفات حقیقی کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پہلے والی ظاہری صفات بدل جاتی ہیں۔ جیسے کہ اس کے ظاہری ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حقیقی صفت کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ اسی طرح پاؤں، کان، آنکھ اور باتیں (کلام) وغیرہ کہ ان اعضاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہوں۔ اس لحاظ سے ظاہر بھی اللہ تعالیٰ کا ہے جو دیگر لوگوں سے الگ ہے جیسا کہ ان کی سماعت، بصارت، کہنا، کرنا، جانا، باتیں زبان وغیرہ تمام اقوال، افعال اور اعتقاد دوسری طرح کام کرتے ہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست کہا ہے۔ بوجہ اور بسبب اس بیعت برائے نفلی عبادت کے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: "علمِ صوفی علمِ خدا است"

یعنی صوفی کا علم خدا کا علم ہے۔ فرماتے ہیں ظاہر انسان باطن میں حق ہے انسان کا ظاہر عبد باطن حق ہے۔ انسان حق نہیں باطن حق ہے۔

مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

اللہ اللہ گو کہ اللہ مے شوی — این سخن حق است واللہ مے شوی
گفتہ او گفتہ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

پیارے دوست! صرف اولیاء اللہ کے ان ظاہری گوشت پوست کے بدن کو نہ دیکھو اور ظاہر پر دھوکہ نہ کھاؤ اس کی حقیقت پر بھی تھوڑی سی نظر ڈالو۔ ظاہر کا یہ پردہ اپنی نظر سے دور کرو تاکہ حقیقت کا نور دیکھ لو یعنی جس طرح گرد وغبار سورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو سورج ظاہراً دیکھا جاتا ہے۔ اور پھر ہر شخص سورج کی اس دھوپ کو اپنے جسم پر دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح نفس پرستی کے وہ گرد وغبار اور دنیا پرستی، انانیت اور غرور کی وہ دھول اپنے باطن سے دور کی جائے اخلاص دل سے ذکرِ خداوندی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا وہ نور ولی اور دوست کے آئینے پر تجھے ظاہر ہو جائے گا۔ اور تمہارے بدن پر بھی اس نور کی روشنی کا اثر پڑئے گا کہ تمہارا بدن بھی اس نور سے منور ہو جائے گا۔

جیسا کہ مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بین باشی اگر اہلِ دلی

ولی کے اندر اللہ تعالیٰ کا نور ظاہر ہے۔ مگر جب تو اہلِ دل ہو جائے گا تو دیکھ لے گا۔

لیکن تمہاری چمگادڑ کی طرح سورج سے دشمنی ہے۔ اور کمرے کے اندر اندھیرے میں بیٹھے ہو۔ تو تم خاک سورج دیکھو گے۔ سورج تو تب نظر آئے گا کہ جب تم حسد، انانیت، تکبر اور بدگمانی کے پردے کو ذکرِ خداوندی کی تلوار سے چیر دو گے۔ اور

صحیح عقیدہ، اخلاص و محبت سے اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو دیکھو۔ اور ان کی طرف رجوع کرو تو اس کے بعد جا کر نورِ حق کو ظاہر میں دیکھ لوگے۔ اور وہ انوار حق کی تجلی تمہارا باطن و ظاہر بھی روشن و منور کرے گی۔ حسد کرنے والوں، بے، محبت و بدگمان لوگوں کے بارے میں ایک سالک نے فرمایا۔ کہ یہ حق نہیں دیکھتے اور اس سے اپنی انانیت، ضلالت کے پردوں میں چھپے ہوتے ہیں اور چمگادڑ کی طرح یہ لوگ بھی منکر ہیں۔ حالانکہ سورج موجود ہے اور تمام جہاں اس کا قائل ہے۔ لیکن یہ اپنے کمرے کے اندھیرے میں چھپتا ہے اور ملامت سورج کو کرتا ہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ جو اولیاء اللہ کے آئینہ میں نورِ حق کا انکار کرتے ہیں اور ملامت ان کو کرتے ہیں۔

اس لئے ایک سالک فرماتے ہیں:

یعنی سورج کی روشنی اگر چمگادڑ کو نظر نہ آئے تو یہ خود نابینا ہے سورج کو کیوں ملامت کرتا ہے۔

یعنی عارفانِ طریقت اللہ تعالیٰ کو اپنے وجود کے آئینے میں دیکھتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کا گھر بھی کہا گیا ہے۔ اس لئے سالک نے بھی اس کو گھر کہا۔ جو اس کے وجود کا گھر ہے۔ اس لئے فرمایا: ''قلب المؤمن بیت اللّٰہ'' مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔

پیارے محبوب! جان لو پہلے مؤمن کے دل کے آئینے کے گھر میں اللہ تعالیٰ کو دیکھو۔ اس کے بعد نورِ حق کا عکس تمہارے وجود کے ظاہر و باطن میں جلوہ فرما ہو جائے گا۔ پھر اپنے باطن میں بھی نورِ حق کو دیکھ لوگے۔ کیونکہ اس مؤمن کامل کے دیکھنے سے تمہارے باطن حقیقی کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اور تمہارے دل کا آئینہ اس عقیدت کی روشنی سے روشن ہو جائے گا تو پھر اپنے آئینے میں نورِ حق کو دیکھ لوگے۔ یعنی دیدار و معراج حق کروگے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو اس طرح دیکھ لے گا۔ جیسا کہ سورج پانی میں یا چہرہ آئینہ میں کہ نہ آئینہ۔ عین چہرہ ہے۔ اور نہ چہرہ عین شیشہ ہے۔ اور نہ آئینہ چہرے کا غیر ہے۔ جان لو کہ کاملانِ طریقت کا یہ ظاہر بھی اللہ تعالیٰ کی حقیقت باطنی سے الگ وجدا نہیں ہے۔ اور نہ حق اس سے الگ وجدا ہے۔ (لقول السالک)

اگر حقیقت کو مجاز سے الگ جانتے ہو تو کیا قرآن مجید میں یہ نہیں ہے؟

جان لو کہ عارفوں کا مجازی ظاہر حق سے الگ نہیں ہے۔ اور نہ حق ان کے مجاز سے الگ وجدا ہے۔ بلکہ ان کا یہ مجاز بھی حقیقت سے ہے۔ اگر ان کا مجاز ان لوگوں نے جان لیا تو پھر حق کو بھی جان لیں گے۔ کیونکہ ان کا مجاز اور حق اللہ تعالیٰ کا ایسا قرب ہے۔ جیسا کہ یہ دو لفظ ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ جیسا کہ قرآن سے مجید الگ نہیں۔ بلکہ مجید قرآن سے ہے۔ یہی حال اہل اللہ اور اللہ کا ہے۔ اور ان کا حال ایسا ہے کہ چقماق میں آگ۔ چقماق (پتھر) کی کوئی جگہ بھی آگ سے خالی نہیں۔ لیکن اس آگ کو ظاہر کرنے کا تجربہ سیکھنا چاہئے۔ جیسا کہ اہل اللہ سے اللہ کا ذکر سیکھنا تمام آداب، اخلاق، پیروی، صدق و اخلاص کے

ساتھ۔ تو اس سے ذاکر کے دل میں وہ نور پیدا ہو جاتا ہے۔ بوجہ کلی آداب ذکر کے جس طرح جب آگ نکالنے کا طریقہ سیکھ لیا جائے۔ دوسرا اللہ تعالیٰ اور کامل مؤمن کا ایسا حال ہے۔ جیسا کہ درخت کا بیج ہے اور وہ درخت میں چھپا تھا اور پھر ظاہر ہو گیا لیکن درخت بھی بیج میں چھپا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بیج درخت سے الگ اور غیر نہیں۔ اور درخت بیج سے جدا اور غیر نہیں۔ بلکہ حقیقت میں درخت اور بیج ایک ہیں۔ لیکن صرف بیج کا درخت سے مجازاً ظاہر ہونے کی وجہ سے ظاہری نظر میں جدائی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درخت پھر بھی بیج میں ہوتا ہے۔ یعنی یہ ظاہر جو کچھ بھی ہے۔ یہ مجازاً ظاہر ہونے کی وجہ سے بظاہر الگ نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ حق سے ظاہر میں آئے ہیں۔ پھر بھی وہی حق اس ظاہر میں ہے۔ جیسا کہ درخت پھر بھی بیج میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں پوشیدہ خزانہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو اپنی ذات سے مخلوق کو پیدا فرمایا اپنے ارادے سے۔ اس لئے فرمایا کہ عاشق صادق کی نظروں میں شرکت نہیں ہوتی بلکہ ایک حقیقت ان کو نظر آتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ درخت پھل ہے اور پھل درخت۔ حقیقت ایک ہے شرکت معدوم ہے۔ یعنی پھل درخت میں تھا اور اس سے ظاہر ہوا۔ اب درخت بھی پھل میں باطن ہوا جب پھل ظاہر ہوا تو حقیقت سب ایک ہوئی۔ جدائی باقی نہ رہی۔ یہی حال حقیقی عاشق اور حق کا ہے۔ عاشق کی نظر میں تو شرکت باقی نہ رہی۔ ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر ہے۔

دوئی ختم اور شرکت معدوم۔ ترجمہ:

نہ حلول نہ اتحاد ہے ایک دوسرے میں   عقل اس لئے حیرت میں رہ جاتی ہے

یعنی نہ ذات خداوندی عین بندہ میں ہے۔ اور نہ بندہ غیر از اللہ ہے یعنی اللہ سے غیر نہیں۔ اور نہ اللہ تعالیٰ بندوں میں تقسیم ہے۔ اور نہ جزئیت ہے۔ یعنی نہ اس میں جزء خداوندی ہے۔ اور نہ یہ ظاہر عین کل اللہ تعالیٰ ہے۔ اور نہ یہ ظاہر اللہ تعالیٰ سے جدا ہے۔ اس لئے فرمایا:

ترجمہ:

جیسا کہ چہرہ آئینہ میں سورج پانی میں   نہ عین عینیت ہے نہ غیریت

یعنی انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسا حال ہے جیسا آئینہ میں چہرہ یا پانی میں سورج۔ اس لئے انسان کو مرآۃ کہا گیا۔ یعنی انسان کامل اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہے۔ کہ جس میں اللہ تعالیٰ اپنے جلال وجمال کا تماشہ بھی فرماتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے آئینے میں دیکھتا ہے۔ اور دوسرے لوگ بھی اس انسان کامل کے آئینے میں صفات اور انوارِ الٰہی دیکھتے ہیں۔ اور اس کے آئینہ میں معرفتِ خداوندی حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی کامل انسان کے آئینے کے سبب اپنے آئینے میں بھی نورِ حق دیکھتے ہیں۔

اس لئے فرمایا: "المؤمن مرأة المؤمن" یعنی ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے۔ بلکہ عارفان وصادقانِ طریقت کی نظر میں جہاں کا ذرہ ذرہ معرفتِ خداوندی کا آئینہ ہے۔ اور ہر ذرے میں جمال و جلالِ خداوندی کی تجلی دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ صادق عاشق حضرت باباجی قدس سرہ فرماتے ہیں:

یعنی رَبِّ اَرِنِیْ کا جلوہ کوہِ طور پر موقوف نہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ کوہِ طور ہے مگر کوئی موسیٰ نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ عاشق صادق کی نظر میں بوقت مراقبۂ استغراقی یہ حجاب مجازی کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں ایک ہے، وہی حال عاشق کی نظر میں قائم ہو کر ماسوی اللہ معدوم یعنی فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ جان ہوتی ہے نہ جہان۔

اللّٰھم ارزقنا بوجھک الکریم۔

اسی طرح سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکھف: ۲۸)

ترجمہ: اس کا کہانہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔

مولانا شائستہ گل صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اثبات الاغراض و المقاصد السنیة میں تحریر فرمایا ہے:

اِعلم انّ البیعة من سنن الانبیاء علیھم الصلوة و السلام و من سنن خلفاء الرّاشدین رضی اللہ عنھم الی یوم القیمة باقٍ بلا نکیرٍ و لٰکن لا یجوز لاحدٍ من العلماء و الصّلحاء و السادات فی الخلافة و البیعة باختیارہ الّا ان یکون له رخصة من الشیخ الذی ھو ماذون و مرخص به للتحقیق کابر عن کابر الی نبیّنا علیه الصلوة و السلام و من لم یبلغه الرخصة من مثل ھٰذا الشیخ الذی ذکرنا فھو ضالّ و مضلّ و کان عاقبة امرہ بالکفر لانّه مدّعی کذّابٌ و مفتر له علیٰ صاحب الشّریعة بالحقیقة و الافتراء علی اللہ تعالیٰ من محض الکفر انتھیٰ کلام السید الجلال ثم تذکرة الابرار۔

"یہ بات جان لینا چاہیئے کہ بیعت انبیاء اور خلفائے راشدین کی سنت ہے اور روزِ قیامت تک یہی سلسلہ جاری وساری رہے گا اور بغیر انکار کے باقی ہے۔ علماء، صلحاء اور سادات میں سے کسی فردِ بشر کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ خلیفہ یا پیر بنے جب تک انہیں اپنے پیر و مرشد کامل مکمل سے اذنِ خلافت نہ ملا ہو اور پیر و مرشد کامل و مکمل وہ ہستیاں ہیں جنہیں اپنے پیران عظام سے لے کر حضور پر نور ﷺ تک نسبت بیعت حاصل ہو۔ جن لوگوں کی نسبت بیعت آپ ﷺ تک نہ پہنچتی ہو وہ خود بھی گمراہ ہیں اور

دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اس فعل کا نتیجہ کفر پر منتج ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایسا ناقص پیر جو کامل مکمل نہیں ہو وہ جھوٹا ہے۔ اکابرینِ طریقت و شریعت کی رو سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر افتراء دراصل اللہ اور رسول سے انکار ہے۔"[1]

عوارف المعارف کے صفحہ ۲۱ پر مرقوم ہے کہ کسی پیر کی مریدی قبول کرنا بعینہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل ہے۔ اور سنتِ رسول ﷺ کو زندہ کرانے کے مترادف ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جو کوئی مجھ سے مصافحہ کرے یا ان سے مصافحہ کیا جنہوں نے مجھ سے قیامت تک مصافحہ کیا ہوا ہو۔ تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔

قطب الارشاد میں ص ۱۳۵ پر ہے کہ مرید کو چاہیئے کہ وہ اپنے پیر کامل مکمل و اکمل کی صحبت میں ممکنہ آداب کا لحاظ رکھے اور اسی طرح رہے جس طرح حضور اکرم ﷺ کے حضور میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رہا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے پیر کامل کی صحبت مرید کے لئے بمنزلہ صحبت رسول ﷺ ہے۔ اور مرید اپنے پیر کا اس حد تک خیال رکھے جس طرح صحبتِ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے آداب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس مقصد قرب الٰہی کا حصول ہے۔ اور فیضِ الٰہی سے مستفید ہونا ہے۔

لیکن فیضِ الٰہی پیر و مرشد کے آداب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ فیضِ الٰہی کا نزول اللہ تعالیٰ ہی سے ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے دل پر خبردار ہے۔

"آداب المخلص" کے ص ۱۵ پر مرید کیلئے درج ذیل آداب مرقوم ہیں:

☆ اپنے پیر کامل مکمل پر نیک اعتماد رکھے۔ اس لئے کہ جملہ اولیائے کرام اپنے پیر و مرشد ہی کو اپنے لئے نفع اور اپنے مطلوب کے حصول (یعنی معرفتِ الٰہی) کیلئے نافع اور کافی سمجھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو کامل وجود کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کو تفویض کرتے ہیں۔

☆ مرید کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ کبھی بھی پیر و مرشد سے خلافت اور تعلیمِ طریقت کے اذن ملنے کا طمع نہ رکھے۔ اور نہ کبھی اس قسم کے خیالات دل میں لائے۔ اور نہ زبان سے اظہار کرے۔ اس لئے کہ مقصد حصولِ دنیاوی مراتب نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی ہے۔ پس سالک کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنے قلب کو باطل دنیاوی مقاصد سے پاک و صاف رکھے۔ کیونکہ دنیاوی مقاصد حصولِ حق کیلئے مانع ہیں۔ اور فاسد خیالات سے قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

---

[1] (اثبات الاغراض والمقاصد السنیۃ، ص ۸۳)

☆ اگر پیر کامل مکمل سے مرید کو تعلیمِ طریقت و خلافت کی اجازت مل بھی گئی۔ تب بھی مرید کو چاہیئے کہ وہ یہ گمان نہ رکھے کہ وہ صاحبِ کمال کی منزل پر فائز ہوا ہے۔ اس لئے مشائخ خاندان نقشبند بعض اوقات کسی مقصد اور مصلحت کی بنا پر ناقص مرید کو (مقیّد اجازت) تعلیمِ طریقت دے دیتے ہیں۔[1]

☆ اگر مرید کو اپنے پیر و مرشد کامل سے خلافت کی اجازت مل جائے۔ اور اس کے مریدین میں سے جذبات۔ تاثیر عجیبہ اور کرامات غریبہ کا ظہور ہو جائے۔ تو اس کیلئے لازم ہے کہ وہ انہیں پیر کامل مکمل کے توجہ اور رابطے کے آثار محمول کرے اور ان عجائب و غرائب کی نسبت اپنے پیر و مرشد کامل و مکمل سے کرے۔ اور کافی محتاط رہے ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ آثار اپنی ذات سے منسوب کرے اور غارت ہو جائے۔

☆ اپنے پیر و مرشد کامل و مکمل کے مخالفین اور غنیم سے دوستی اور محبت نہ رکھے۔ کیونکہ ان کے ساتھ رفاقت اس کیلئے باعث محرومی بن سکتی ہے بلکہ ان کے ساتھ مخالفت اور دشمنی رکھے کیونکہ "الحب للہ و البغض للہ" ہر کام کیلئے رضائے الٰہی کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔[2]

☆ کبھی بھی اپنے پیر و مرشد کامل مکمل سے بغیر اجازت کے علیحدگی اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ خصوصًا طریقۂ نقشبندیہ میں جس کی بنیاد صحبت پر قائم ہے۔[3]

☆ مرید کو اپنے پیر و مرشد کامل مکمل سے سوال اس وقت پوچھنا چاہیئے جب وہ خوشی کی حالت میں ہوں اور باتیں کرنے والے ہوں۔[4]

☆ مرید کیلئے اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کی موجودگی میں فرائض اور سنت نمازوں کے علاوہ نفلی نمازوں، اوراد و اذکار اور دیگر عملیات میں اس وقت تک مشغول نہ ہو جب تک اسے اپنے پیر و مرشد سے ظاہراً، باطنًا، صراحةً یا اشارةً اجازت نہ ملے۔[5]

☆ مرید کو اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ اپنے پیر و مرشد کے حضور میں ادھر ادھر نہ دیکھے، جس طرح ایک مقتدی کو نماز میں اپنے امام کی متابعت کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح کا حکم طریقت کیلئے بھی ہے۔ پیر مبارک کی متابعت اور

---

1 (مکتوب امام ربانی مکتوب:۲۲۴:دفتر:۴:صفحہ:۲۱۱۲)

2 (آداب المریدین:صفحہ:۱۱)

3 (حجة السالکین ص:۲۵، اصل تصوف مولوی اشرف علی تھانوی:ص ۱۳)

4 (آداب المریدین:صفحہ:۵)

5 (حجة السالکین:صفحہ:۲۳)

اطاعت ضروری ہے کیونکہ اس متابعت اور اطاعت ہی سے معرفتِ الٰہی، فیوضات اور برکات کا فیضان حاصل ہوتا ہے۔ عدم اطاعت سے مقتدی کی نماز فاسد ہوتی ہے اسی طرح عدم اطاعت سے مرید فیوضات اور معرفتِ الٰہی سے محروم رہ جاتا ہے۔ [1]

☆ مرید کو چاہیئے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کے مصلہ یا جائے نماز پر کھڑے ہونے سے اجتناب کرے۔ کیونکہ یہ بے ادبی ہے۔ [2]

☆ سالک کو چاہیئے کہ وہ درج ذیل کتب کا مطالعہ کرتا رہے: ہدایۃ السالکین، تسہیل المقامات، حجۃ السالکین، آداب المریدین، مکتوبات امام ربانی، الحبل المتین، ارشاد الطالبین شرح تعرف در المعارف اور اثبات الاغراض، عقائد المسلمین۔ (فقیر سید احمد علی شاہ سیفی)

☆ مرید کو چاہیئے کہ پیر و مرشد کے حضور میں جانے سے پہلے مسواک کے استعمال کے ساتھ باوضو ہو جائے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر جائے۔ [3]

☆ مرید کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد مبارک کامل و مکمل کے اقوال کو غور سے سنے اور اپنی زندگی ان کے مطابق ڈھالے۔

☆ مرید کو چاہیئے کہ اپنے مرشد مبارک کامل و مکمل کے حضور میں کسی دوسرے کے قول کی مخالفت بیان نہ کرے۔ کیونکہ یہ قابلِ مذمت امر ہے۔

☆ اگر کوئی تمہارے پیر و مرشد کی ہجو بیان کرے تو اپنی قوت بساط کے مطابق ان کا مناسب دفاع کریں۔ ورنہ ایسی مجلس سے اٹھ جانا ہی افضل ہے۔

☆ مرید کو چاہیئے کہ جب بھی حلقے کے قریب ہو جائے۔ حلقہ مریدین پر عموماً اور پیر و مرشد مبارک پر خصوصًا سلام بھیجے۔ لیکن اگر وہ تقریر و تلقین یا ذکر میں مشغول ہوں تو سلام نہ کرے۔

☆ پیر و مرشد کے حضور میں ہنسنا یا کسی اور طرف متوجہ ہونا دیکھنا مرید کیلئے انتہائی قبیح امر ہے اور محرومی فیوضات کا باعث ہے۔

☆ کبھی کبھار مرید کو چاہیئے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کامل مکمل کو تحفے تحائف سے خوش رکھے۔

---

[1] (حجۃ السالکین)

[2] (حجۃ السالکین)

[3] (اصول التصوف ص ۱۰)

☆ مرید کو اس امر کا معتقد رہنا چاہئے کہ اس کی کامیابی اسی مرشد سے حاصل ہو گی اگر اس نے ہٹ کر کسی دوسری جانب توجہ رکھی یاد رکھنا چاہئے اس کا نتیجہ پیر و مرشد کے جملہ فیوضات اور برکات سے محرومی کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

☆ ہر شرعی کام مرشد کامل مکمل ہی کی اجازت سے کرنا چاہئے۔ اپنے پیر و مرشد سے کمالِ محبت رکھی جائے اور جو کچھ پیر فرمائے اسی وقت ہی انجام دے۔

☆ اپنے پیر و مرشد کو اپنی جان و مال، ماں باپ اور اولاد سے بھی عزیز جانے۔

☆ مرشد کامل و مکمل جن اذکار واوراد اور عملیات کرنے کی ہدایت کرے اسی پر عمل پیرا رہنا چاہئے ان کے علاوہ تمام عملیات کو چھوڑ دینا چاہئے۔

☆ کسی ایسے مقام پر نہیں کھڑا ہونا چاہئے جہاں پر سے تمہارا سایہ تمہارے پیر و مرشد پر پڑے اور نہ ہی ان کی اجازت کے بغیر ان کے آگے جائیں۔

☆ اپنے پیر و مرشد کے مصلّی پر پاؤں نہ رکھو یہاں تک کہ ان کے سایہ پر بھی پاؤں نہ رکھنا چاہئے۔

☆ مرشد کے سامنے پاؤں پھیلانا طریقت میں بے ادبی کے مترادف ہے۔

☆ جس جگہ پیر و مرشد وضو کرے اس جگہ وضو بنانا احسن امر نہیں ہے۔

☆ مرشد کامل مکمل کے سامنے بغیر ان کی اجازت کے کھانا کھالینا بری بات ہے۔

☆ مرشد کامل مکمل جو کچھ فرمائے یا کرے وہ تنقید سے مبرّا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کریں گے الہام کے توسط سے کریں گے اور اگر مرشد کی کسی بات پر سمجھ کام نہ کرے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعات کو ذہن میں دہرائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ علومِ ظاہری کے اساتذہ کیلئے اس قسم کے دقیق اور باریک آداب نہیں ہیں تو بھلا علوم باطنی کے اساتذہ (پیر و مرشد) کیلئے کیسے ہیں؟

جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے اپنی کتاب فیض شیخ ص ۲۱ تا ۲۴ میں تحریر فرمایا ہے کہ "ان آداب کا اہتمام ان بزرگوں اولیائے کرام اور علمائے دین رحمہم اللہ تعالیٰ نے زمانہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اب تک کیا ہے۔ جن کی علمیت اور ولایت پر پوری امت متفق ہے۔ اور پوری امت مسلمہ کا اجماع ان کی فضیلت اور ولایت پر ہوا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے ان کے آداب میں ضرور کوئی راز پوشیدہ ہے۔

۲۔ حضرت محبوب سبحانی امام ربّانی مجد د الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکتوبات شریف کے دفتر اول حصہ ۵ مکتوب نمبر ۲۹۲ ص ۱۱۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ آداب، ضروریات اور شرائط کے تین طریق ہیں۔ جس مرید نے مذکورہ آداب کی پابندی نہیں کی تو صحبت کا کوئی فائدہ اسے نہیں پہنچے گا۔

۳۔ یہ آداب اس لئے ضروری ہیں کہ طریقت یعنی بیعت کسی مرشد کامل مکمل کے ہاتھ پر سنت ہے۔ جیسا کہ پہلے جواز بیان کیا گیا ہے لیکن جو علم بہ سبب بیعت اور طریقت حاصل ہوتا ہے انہیں علم باطن، علم سلوک، علم تصوف، علم احسان، علم لدنی، اور علم تزکیہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا علم جو مختلف ناموں سے موسوم ہے یہ فرضِ عین ہے۔ اس لئے کہ تفسیر معارف القرآن مین مفتی محمد شفیع صاحب ص۴۸۹، ص۴۹۰ جلد ۱۴ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفسیر مظہری جلد ۴ ص ۳۲۴ پ۱۱ سورہ توبہ آیۃ ۹ {وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً} کے تحت لکھا ہے کہ مندرجہ آیت میں امت اجابت کو یہ حکم ہے کہ مسلمان کے لئے یہ نہیں چاہیئے کہ وہ سب کے سب جہاد کیلئے چلے جائیں اور دیگر اسلامی ضروریات معطل ہو جائیں بلکہ ایسا کرنا چاہیئے کہ ہر ایک بڑی جماعت سے ایک گروہ جہاد پر چلا جائے اور دیگر لوگ دوسرے کام کاج کے لئے وطن ہی میں رہ جائیں اور کام کاج کے علاوہ علم کے حصول میں لگے رہیں۔

مسلم شریف کی حدیث ہے کہ علم دین کا حصول ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے، خواہ دین کا حصول دور کیوں نہ ہو جس کیلئے سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس کے حصول میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ جن آیات اور احادیث میں حصول علم کا ارشاد ہوا اس سے مراد صرف ظاہری علوم نہیں بلکہ یہ کافی سارے علوم پر مشتمل ہے اور ایک جامع نظام ہے اور یہ ظاہری بات ہے کہ ہر مسلمان جن و انس، نر ہو یا مادہ، یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ان علوم کو پوری طور پر حاصل کریں۔ اسی وجہ سے مذکورہ حدیث میں ہر مسلمان مرد اور عورت پر دینی علوم کا حاصل کرنا فرضِ عین ہے۔ جس سے مراد علم کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر نہ انسان فرائض ادا کر سکتے ہیں اور نہ حرام چیزوں اور فسق و فجور سے اجتناب کر سکتے ہیں۔ اسی قدر علم کا حصول ایمان اور اسلام کی حفاظت کیلئے اہم اور ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ہر مسلمان پر صحیح اسلامی عقائد جاننا فرض عین ہے۔ انہیں طہارت اور نجاست کے احکامات جاننا از حد ضروری ہے۔ نماز، روزہ، اور وہ تمام عبادات جو شریعت کی رو سے فرض اور واجب مقرر ہوئی ہیں، ان علوم کو حاصل کیا جائے۔ جو اشیاء حرام یا مکروہ ہیں ان کا علم حاصل کریں۔ جن کے پاس بقدر نصاب زکوۃ مالیت ہو ان پر فرض ہے کہ مسائل زکوۃ معلوم کریں۔ جو مسلمان تجارتی لین دین، خرید و فروخت، یا مزدوری کریں انہیں لازم ہے کہ وہ ان چیزوں کے متعلق احکامات سے

واقفیت حاصل کرے اور جب نکاح کرنا چاہیں تو نکاح کے متعلق اور ازدواجی زندگی کے متعلق مسائل سے واقفیت حاصل کریں جو کہ عین فرض ہے۔

غرض یہ کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ کرنا ہے، شریعت نے اس کیلئے شرعی حدود مقرر کی ہیں جن سے واقفیت اشد ضروری ہے جو کہ فرضِ عین ہے، جس طرح شریعت میں جو کام فرض عین ہے اسی طرح ان کے مسائل جاننا بھی فرض عین ہے۔ اس لئے کہ ان احکامات سے واقفیت نہ حاصل کرنے سے انسان تاریکی میں رہتا ہے۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ یہ احکامات سیکھے جائیں۔ بصورت دیگر، ایسا گناہ ہے جس طرح کہ اس نے فرض عین ترک کیا ہو۔

ان کے علاوہ جو علوم ہیں ان کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت کیلئے فرض کفایہ ہے جو ان کی استطاعت سے بالاتر ہے۔ اگر کسی شہر، قصبہ، گاؤں، محلّہ میں ان علوم کا عالم موجود ہو تو ان کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ ذمہ داری سے بچ جاتے ہیں اور اگر نہ ہو تو سب کا حق بندھا ہوا ہے۔ پھر انہیں ضروری ہے کہ کسی عالمِ دین کا اہتمام کرے اس لئے کہ نماز، حج، روزہ، زکوۃ بظاہر توسب ہی لوگ جانتے ہیں لیکن ان کے احکامات اور مسائل ہر کوئی نہیں جانتا۔ جن کا جاننا فرض عین ہے۔

اسی طرح علم باطن جو علوم معارف مکاشفات اور ارادات کا مجموعہ ہے جو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض عین ہے اسی علم کو علم تصوف کہتے ہیں۔ انسان کا باطن بہت سے امراض باطنی سے معمور ہے جن کی پیداوار نفس سے ہوتی ہے جیسے اخلاق رزیلہ، عجب، کبر، غرور، حسد، محبت دنیا، حب مراتب و اقتدار، شہوت، ریاء، خود نمائی، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، عبادات الٰہی اور اطاعت نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں سستی کرنا وغیرہ۔

اسی طرح باطن کے بھی بہت سارے امراض ہیں جن کا علاج بغیر علم باطن (تصوف) کے ناممکن ہے۔ جملہ مذکورہ امراض باطنی ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا ان پڑھ، ہر ایک میں موجود ہیں۔ یہ بڑے مہلک امراض ہیں اور ان کی وجہ سے ہی انسان اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کے لائق بن جاتا ہے۔ اور ان قبیح امراض کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ سے دشمنی کر بیٹھتا ہے اور انسان کا ہر عضو ان امراض کے سبب گناہوں میں ڈوب جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جاتا ہے۔ ان امراض کا ختم کرنا اور علاج کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔

پس نفس کی صفائی، دل کی صفائی یعنی ماسوائے اللہ کے دل سے تمام کدورتیں دور کرنا اور اللہ کی یاد میں دل کو مشغول رکھنا جو کہ طریقہ تصوف ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، کہ بغیر ذاتِ الٰہی کے کسی دوسری چیز پر مشغول نہ ہو جائے اور اپنے آپ کو دائمی طور پر ذاتِ اقدس کی توجہ اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے موصوف بنانا ہے اور اپنے آپ میں اخلاقِ حمیدہ شریفہ کریمانہ پیدا کرنا ہے اور وہ اخلاق حمیدہ یعنی (۱) توبہ جو اپنے گناہ پر پچھتانا ہوتا ہے، (۲) اللہ تعالیٰ کے ہر ایک فیصلہ پر راضی ہونا ہوتا ہے۔ (۳) اللہ

تعالیٰ کے انعامات پر شاکر رہنا ہوتا ہے اور ہر مصیبت کے وقت (۴) صبر سے کام لینا ہوتا ہے اور ہر کام میں اللہ پر بھروسہ اور (۵) توکل ہوتا ہے۔ (۶) رجاء یعنی ہر وقت رحمتِ الٰہی کی امید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذابِ الٰہی کا (۷) خوف پیدا کرنا ہوتا ہے۔ (۸) زہد عبادت اور پرہیز گاری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ (۹) توحید اور اللہ تعالیٰ کی (۱۰) محبت، دیدار الٰہی کا (۱۱) شوق، (۱۲) انس نیت اور (۱۳) نیک ارادہ۔ ہر عبادت میں (۱۴) اخلاص، (۱۵) صدق، (۱۶) مراقبہ اور فکر ہوتا ہے۔

قرآن عظیم الشان اور احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ اپنے آپ میں یہ صفات پیدا کرنا فرض ہے اور یہی اخلاق حمیدہ جو مولا کریم کی طرف سے ودیعت فرمائے جاتے ہیں تو ان کے ملنے سے اخلاق رزیلہ مٹ جاتے ہیں۔

انسان میں یہ دونوں اخلاق نہیں سما سکتے۔ تفسیر مظہری اور معارف القرآن نے (وَغَيْرَ ذَالِکَ) کی تشریح میں اخلاق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اصول اربعین میں ان تمام اخلاق کی تفصیل تحریر فرمائی ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی نے تعلیم الدین کے صفحہ ۸۵ تا صفحہ ۹۳ پر اور شریعت وطریقت کی صفحہ ۵۲ پر وضاحت کی ہے۔

مشائخ اور علمائے حقانی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اعمالِ صالح کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کا تعلق اعضائے جسمانی سے ہے، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اور دوسری کا تعلق قلب اور نفس سے ہے، دونوں قسموں کی نیکی پر عمل کرنا ضروری اور مامور بہ ہے اور نصوص قرآنی سے ثابت ہے۔

جس طرح اعمال صالح کی دو اقسام ہیں اسی طرح اعمال سیئہ کی بھی دو اقسام ہیں جن میں ایک کا تعلق جسم سے ہے، مثلاً چوری، زنا، سود، جوابازی، شراب خوری وغیرہ اور دوسری قسم کا تعلق قلب اور نفس سے ہے جیسے عجب، حسد، حقد، حب دنیا، حب جاہ ورغبت شہوت، ریاء اور عبادات میں سستی اور اطاعت میں سستی۔ قرآنِ کریم اور احادیث نبوی ﷺ نے دونوں اقسام کے اعمال کی تشریح کی ہے جو حرام اور ناجائز ہیں جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ انسان سے ناراض ہو جاتا ہے اور رحمت الٰہی سے دور ہو جاتا ہے۔ اور ان اعمال کے ساتھ محبت الٰہی قرب الٰہی اور وصل الٰہی کا حصول ناممکن ہے۔

پس یہ مسئلہ واضح ہوا کہ وہ گناہ جو اعضائے جسمانی کے ذریعے کئے جاتے ہیں جیسے چوری، زنا، جوابازی وغیرہ اس قسم کے بُرے اعمال سے انسان ظاہری علوم کے طفیل سے بچ سکتا ہے لیکن وہ گناہ اور باطنی امراض جن کا تعلق قلب اور نفس سے ہوتا ہے، جیسے حسد، بخل، ریاء، عجب، کبر اور حب دنیا وغیرہ، اس قسم کے اعمال کے زائل ہونے کے لئے ظاہری علوم اور ان کے ماہرین مکتفی نہیں ہو سکتے اور ان امراض کے علاج نہیں جانتے۔ بلکہ ان امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

پس یہ لازم ہوا کہ ان امراض کو دور کرنے کے لئے کسی پیر و مرشد کامل مکمل سے مکمل آداب اور شرائط کے ساتھ بیعت کرنی چاہیئے۔ آداب اور شرائط بیعت کے بغیر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ دین سراسر ادب ہے۔ ان برے امراض کی شفاء کے لئے علم باطن کے استاد کامل پیر و مرشد کامل مکمل جو ان امراض کا طبیب اور حکیم ہوتا ہے۔ ان کے بغیر ان امراض کا کوئی طریقۂ علاج نہیں۔ جو انہیں دور کیا جاسکے۔ پس گناہ کی ان دو اقسام میں سے ایک جس کا تعلق اعضائے جسمانی سے ہے، اور دوسری جس کا تعلق دل اور نفس سے ہے، ان میں سے ہر ایک مرض ایسا مہلک مرض ہے جس کسی میں ان میں سے ایک بھی مرض ہو، خواہ عالم ہو، یا اُمّی، مرد ہو یا عورت، ان کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو سکتی ہیں۔

اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر رائی کے دانے کے برابر کسی میں کبر و غرور ہو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان کے لئے دل میں ذاتی عناد کی وجہ سے بغض اور حسد رکھے اور یہ تین دن سے متجاوز ہو جائے تو وہ جتنے بھی اعمال صالحہ کرے اللہ کے نزدیک قابل قبول نہ ہونگے۔ دوسری روایت میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان بھائی دوسرے مسلمان کے لئے ذاتی عناد کی وجہ سے تین دن سے زیادہ بغض اور حسد رکھے تو اس کی نیکیاں ایسی جلیں گی جیسے خشک لکڑی آگ سے جلتی ہے۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ جو گناہ قلب اور نفس کے ذریعے صادر ہوتا ہے وہ ایسا عظیم گناہ ہے اور اتنا خطرناک ہے کہ اسکی وجہ سے ایک نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں قابل قبول نہ ہوگی۔

جب تک کسی انسان میں یہ امراض باطنی موجود ہوں گے۔ اس وقت تک اس کا کوئی نیک عمل اللہ کے حضور میں شرف قبولیت سے قاصر رہے گا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر مظہری کے صفحہ ۴۴۳ جلد اول سورۃ بقرہ پ ۳ میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ امراضِ جسمانی، جیسے چوری، زنا وغیرہ اور اخلاق رزیلہ کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کے حضور میں قابل مواخذہ اور لائق سزا ہے۔ ازروئے شریعت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بوجھ اور تکلیف نہیں ڈالتا۔ جو بندے کی قوت اور برداشت سے بالاتر ہو۔

اگر انسان ان اخلاق رزیلہ کو اخلاق حمیدہ میں تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرے اور نفس کے ساتھ مقابلہ اور جہاد کرے اور اپنے آپ کو ایسی تکلیف میں ڈالے جیسا بوجھ اللہ تعالیٰ انسان پر نہیں ڈالتا، پھر بھی وہ قربِ الٰہی اور حصول معرفت میں ناکام رہے گا، جب تک کہ اسے امراض باطنی کے حکیم اور طبیبِ حاذق، یعنی کسی شیخ کامل مکمل (جو طریقت کے

رموز و اسرار کا ماہر ہو) کی رہنمائی حاصل نہ ہو اور جب تک وہ اپنے پیر و مرشدِ کامل کی خدمت میں اپنے آپ کو وقف نہ کر دے اور ان کی محبت میں تن من دھن کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرے۔

پس ثابت ہوا کہ اخلاق رزیلہ سے نجات کے لئے پیر و مرشد کامل مکمل کی صحبت میں بیٹھنا اور ان سے بیعت کرنا ضروری ہے اور طالبِ بیعت کے لئے نفس اور قلب کی صفائی فرض ہے خواہ طالبِ بیعت عالم ہو یا اُمی۔ پہلے تو اس کے امراضِ باطنی اللہ تعالیٰ کسی پیرِ کامل مکمل کے طفیل و وسیلے سے دور کرے گا اور اگر مکمل طور پر دور نہ بھی ہوں پھر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور روز قیامت اس بندے کی جس نے جد و جہد اور کوشش کی ہو، مواخذہ و گرفتاری نہیں ہو گی، اور اللہ تعالیٰ اسے مغفرت سے نوازے گا اس لئے کہ بندے نے اپنی توفیق اور بساط کے مطابق کافی کوشش کی ہے۔

تاکہ ان کے اخلاق رزیلہ دور ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بندے پر صرف اتنی ذمہ داری ڈالدی ہے جتنی اس میں قوتِ برداشت ہوتی ہے۔

اور اگر کسی نے اس قدر کوشش نہیں کی کہ وہ اپنی اصلاح نفس کے لئے کسی پیر و مرشد کامل مکمل سے بیعت کر لے اور اس پر اپنی طاقت صرف کر لے اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تو بہت جلد وہ اللہ کے حضور میں چیخیں مارے گا اور جہنم میں داخل ہو جائے گا۔

پس ثابت ہوا کہ صوفیائے کرام سے بیعت لینا اور پیر و مرشد کامل کے ہاتھ چومنا اور ان کے دامنوں کو مضبوطی سے پکڑنا اور ان پر اپنے آداب کو نثار کرنا ایسا فرض ہے جیسے تلاوتِ قرآن اور اس کے احکامات سے واقفیت حاصل کرنا فرض ہے۔ حضور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے آپ میں دو احکام اور نعمتیں چھوڑی ہیں، ایک کتاب الٰہی (قرآن) اور دوسری اپنی آل، پس کتاب سے مراد قرآن عظیم الشان ہے جس سے پند و نصیحت لینا فرض ہے اور اس پر قربِ الٰہی کا حصول ہے اور آل سے مراد مشائخ، اور پیران کامل مکمل ہیں اور ان کی اطاعت فرض ہے۔ ان سے نفس اور قلب کے تزکیۂ اور اخلاق حسنہ کی تہذیب کے لئے باطنی علوم کا حصول انتہائی ضروری ہے۔

تاکہ نفس اور قلب دونوں رضائے الٰہی کے تابع ہو جائیں اور قضائے الٰہی اور فیصلہ پر راضی ہو جائیں اور ہدایت الٰہی کے مطابق قلب اور نفس با عمل ہو۔ اسی سلسلے میں تفسیر معارف القرآن صفحہ ۳۴۲، ج ۴ اور تفسیر مظہری صفحہ ۱۵۳ ج ۴، سورۃ توبہ میں لکھا گیا ہے کہ کامل ایمان وہ ہے کہ کسی کی عادتیں اور اخلاق شریعتِ محمدی ﷺ کے تابع ہو جائیں۔

ابو داؤد شریف اور ترمذی شریف کی احادیث میں آیا ہے کہ کامل اور مکمل مؤمن کی محبت و دوستی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتی ہے اور بغض و دشمنی بھی خاص رضائے الٰہی کے لئے ہوتی ہے۔ اور بخاری شریف اور مسلم شریف کی حدیث ہے کہ

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں انہیں ان کے ماں باپ اور دیگر لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب نہ ہو جاؤں۔

بخاری شریف اور مسلم شریف کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اخلاق کی تین اقسام ہیں۔ جب یہ عادتیں انسان میں پیدا ہو جائیں تو ان خصلتوں اور عادتوں کی برکت سے وہ ایمان کی لذت چکھے گا۔ اول وہ لوگ جنہیں خدا اور رسول اللہ ﷺ ہر کسی سے اور ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرا وہ شخص جو کسی سے محبت رکھتا ہے اور وہ خاص رضائے الٰہی کے لئے رکھتا ہو۔ ان سے مراد ان لوگوں کی محبت ہے۔ جو نیک اور صالح ہوں، جن کی بدولت رضائے الٰہی حاصل ہو۔ تیسرا وہ جسے کفر آگ کی طرح اور کافر ہونا ایسا دکھائی جیسے کوئی اسے آگ میں ڈال رہا ہو۔ اس کے بعد اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے کفر سے بچایا ہے۔ ایسے موقع پر صاحبِ تفسیرِ مظہری نے تحریر فرمایا ہے کہ اس مٹھاس کے ذائقے سے مراد ایمان ہے۔ ایسا ذائقہ اور لذت اور مٹھاس جیسی چیزوں کی لذت انسان کو پینے اور چکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ عین اسی طرح ایمان کی مٹھاس سے مراد کامل ایمان ہے۔

بہترین حال یہ ہے کہ انسان کو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت ہر چیز پر مقدم ہو اور وہ آپ ﷺ کے ورثاء کی صحبت رکھنے یعنی صوفیائے کرام رحمہ اللہ تعالیٰ کی جن کے نفوس اور قلوب مولائے کریم نے اپنی تجلیات کے ذریعے دھو رکھے ہیں، اور جنہیں قربِ الٰہی حاصل ہے۔ یہ لوگ وہی پیرانِ مبارک ہیں جن کے قلب اور نفوس تزکیہ کامل سے مشرف ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے نفوس کے حکماء ہیں اور اس کے مکر و فریب اور خراب بیماریوں سے اور ان کے علاج سے بھی واقف ہیں، اور ان امراضِ رزیلہ کے علاج کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قسم کے بزرگانِ دین کی صحبت اور محبت نصیب فرمادے۔ آمین۔

پس ان آیات، قرآنی اور احادیثِ نبوی ﷺ سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ جو انسان خواہ وہ عالم ہو یا اُمی، مرد ہو یا عورت، اگر وہ بقدرِ ضرورت یہ علم نہیں حاصل کر سکا ہو، تو ان پر یہ علم فرضِ عین ہے۔ انہیں چاہیئے کہ مشائخِ عظام کی صحبت حاصل کرے، ان کی بیعت سے مشرف ہو اور تزکیہ باطن حاصل کرے۔

یہ مذکورہ آداب ہر قسم کے شیخ اور پیر کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس پیر مرشد کے لئے ہیں جو کامل اور مکمل ہو، اور ولایت پر فائز ہوا ہو۔ اور جو ولایت پر فائز نہیں ہوا ہو اور اس میں شیخ کامل مکمل کی علامات موجود نہ ہوں تو یہ مذکورہ آداب ان کے لئے ہرگز نہیں ہیں۔

اے اللہ کے طالب یہ بات جان لو کہ شیخ یا پیر و مرشد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شیخ کامل مکمل ۲۔ شیخ ناقص ۳۔ شیخ مقلد

شیخ کامل: شیخ کامل مکمل وہ مبارک ہستی ہے جس میں یہ دس شروط ضرور موجود ہونگی:

اول اعظم شرط یہ ہے کہ اس کا ظاہر متابعتِ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے مزین ہوگا اور اس کا باطن ماسوائے اللہ سے آزاد ہوگا۔ کمال علم ظاہر ولایت کے لئے شرط نہیں بلکہ شرطِ ارشاد ہے بقدر مفروض کے۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دوم شرط دوام ذکر (ہمیشہ ذکر) ہے اور شغل اللہ سبحانہ ہے اور اللہ سبحانہ سے صبر، توکل، قناعت، رضا اور تسلیم کے ساتھ امید رکھنا۔ اور لوگوں سے اعراض اور ناامیدی باطن میں رکھنا اور نہ ظاہر میں۔ اس لئے کہ غفلت ظاہری حضور باطن میں اثر نہیں رکھتا۔ اور ان کے ظاہر سے باطن کو دنیاوی کام سرائت نہیں کرتا جب ان کا باطن آگاہ ہو۔ اگر ان کا ظاہر غافل ہو جس طرح روغن بادام کو روغن کنجد (تیل) کے ساتھ ملایا جائے دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اور جب یہ روغن الگ الگ ہوں تو پھر ہر ایک کے احکام الگ الگ ہیں۔ ان میں فرق بھی ہے اور نام بھی الگ الگ لئے جاتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس شخص پر معرفتِ الٰہی کی خوشبو حرام ہے جس کے باطن میں رائی کے دانے کے برابر دنیا کی محبت موجود ہو۔ اس لئے کہ اس کا ظاہر اس کے باطن سے کئی مرحلوں میں الگ واقع ہوتا ہے۔ اور آخرت سے دنیا میں آیا ہے۔ اور لوگوں سے میل جول پیدا رکھا ہے۔ اور مناسبت کے حصول کے لئے جو مشروط ہے افادہ اور استفادہ میں اور اگر وہ دنیا کے متعلق باتیں کرتا ہو اور اس کی مناسبت اسباب دنیوی سے ہو تو گنجائش رکھتی ہے۔

اور یہ کوئی مذموم بات نہیں ہے بلکہ اچھی بات ہے اس لئے حقوق العباد معطل نہ ہو جائیں اور استفادے اور افادے کا طریقہ بند نہ ہو جائے۔ پس اس شخص کا باطن بہتر ہے اس کے ظاہر سے اور اس کا حکم جو نما گندم فروش کے مترادف ہے۔

اندروں شو آشنا واز برو بیگانہ باش این چنین زیبا روش کم تر بود اندر جہان

یعنی اپنے باطن سے آشنا ہو جاؤ اور ظاہر سے بیگانہ ہو جاؤ۔ ایسی راہ اختیار کرنے والے دنیا میں کم تر ہوتے ہیں۔

تیسری شرط شیخ کامل مکمل کی یہ ہے کہ سلسلہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اس تک پہنچ چکا ہو۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ اس کو کسی پیر کامل مکمل کی اجازت اور سند ارشاد حاصل ہو۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ فنائے نفس اور فنائے قلب کے مدارج حاصل ہوئے ہوں۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ علمِ سلوک میں ولایتِ کبریٰ تک مدارج طے کر چکا ہو اور اس وقت اسے ارشاد کرنے میں کامل مکمل مختار گردانا گیا ہو اور طریقت کے اعلیٰ مدارج ولایت علیا سے لاتعین تک کے مقامات سے اس پر فیض جاری و ساری ہو۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ جو کوئی کسی پیر کامل مکمل کی صحبت میں بیٹھ جاتا ہے، تو اس پر رقتِ قلب طاری ہو، کہ اس کا طبعی میلان اور رجحان حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف مائل ہو جاتا ہے بلکہ پیر کامل مکمل کی نظر سے بشرطِ عقیدت و مناسبت باطنی ماسویٰ اللہ تعالیٰ کے باقی تمام اشیاء معدوم ہو جاتے ہیں۔

اور ملاقاتی کے دل میں محبتِ الٰہی ٹھاٹھیں مارنا شروع کر دیتی ہے اور اگر اس کا عقیدہ نہ ہو اور مناسبتِ باطن نہ رکھتا ہو تو بندہ فیوضات و برکاتِ باطنی سے محض محرومِ مطلق ہی رہے گا۔

ہر کہ روی سبے بہود نداشت　　　　دیدن روی نبی سود نداشت

آٹھویں شرط یہ ہے: جان لو، کہا گیا ہے کہ شیخ کامل مکمل زندہ بھی کرا سکتا ہے اور یہ لازم ہے کہ شیخ یہ کام کرے۔ اس لئے کہ موت و حیات سے مراد جسمانی موت و حیات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد نفس کی موت و فنا ہے اور باطن کی بقا اور حیات ہے۔ جبکہ ولایت کے یہی مقامات اور کمالاتِ باطن شیخ کامل مکمل کی توجہ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، جس کے لئے شیخ مقتدیٰ اور کامل مکمل بہ اذنِ الٰہی ذمہ دار ہے۔ جسمانی فناء و بقاء کے ساتھ شیخ کا کوئی واسطہ نہیں۔

نویں شرط یہ ہے کہ شیخ جذب اور سلوک کی دولت سے مالا مال ہوا ہوتا ہے اور فناء اور بقاء کی سعادت سے مستعد کیا ہوا ہوتا ہے اور بطریقہ کمال سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، اور سیر عن اللہ باللہ اور سیر فی الاشیاء کے مدارج تک پہنچا ہوا ہوتا ہے اور اس کا جذبہ اس کے سلوک پر مقدم ہو اور اس کی تربیت ہوئی ہو تو اس کی مثال کبریت احمر کی ہے۔ اس کی باتیں دوا ہوتی ہیں اور اس کی نظریں شفاء ہوتی ہیں، ان کے لئے جن کے قلوب مر گئے ہوں اور یہ توجہ سے متعلق ہے، اور پریشان دلوں کو اس کے التفات سے تازگی ملتی ہے۔

دسویں شرط یہ ہے کہ شیخ کا اعتقاد اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کے ساتھ راسخ ہو اور گمراہ اعتقادات سے اپنے آپ کو بچانے والا ہو۔ جیسے شیعہ، روافض، معتزلہ، وہابیہ، اور پنج پیریہ وغیرہ اور ان کی بیان شدہ روایات پر بھی عمل نہ کرتا ہو۔

یہ جملہ بیان شدہ مسائل حجۃ السالکین صفحہ ۱۲۰ اور مکتوبات امام ربانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول حصہ دوم مکتوب نمبر ۶۱، صفحہ ۳۸ پر بیان کئے گئے ہیں۔

شیخ ناقص: شیخ ناقص وہ ہے جس نے سلوک اور جذبہ کے مراحل طے نہیں کئے ہوں اور اپنے پیر و مرشد کے مسند پر بیٹھا ہوا ہو۔ پس طریقت کے طالب کو اس قسم کے شیخ ناقص کی صحبت میں بیٹھنا زہر قاتل ہے اور اس کی تابعداری ایک ایسا مرض

ہے جو طالبِ طریقت (کی عاقبت) کے لئے موت کا باعث ہے۔ اگر کسی طالب میں کافی استعداد ہو تو اس قسم کے پیر ناقص سے اس کو بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ باطنی قوت کو کم کر دیتا ہے، بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مریض ناقص طبیب کے پاس بغرض علاج چلا جائے تو گویا اس مریض نے اپنی بیماری کو بڑھانے میں کوشش کی ہے۔ ناقص طبیب کی دوا جتنی مقدار میں بھی کھائی جائے، فوری طور پر مرض میں افاقہ ہو جائے گا لیکن در حقیقت اس کا مرض بڑھتا جائے گا یا مخالف دوا دے دیں تو ایک بیماری کی جگہ دوسری بیماری جنم لے گی۔

بس یہی مثال ناقص پیر کی ہے۔ مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ ناقص پیر سے ایسا بھاگو جس طرح چیتے سے اپنے آپ کو بچاتے ہو۔ اس لئے کہ وہ باطنی امراض میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ استعداد کم کر دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہلاکت تک پہنچا دے۔

شیخ مقلد: شیخ مقلد اس مرشد کو کہتے ہیں جب کوئی شیخ اس دنیا سے رحلت فرمادے اور وہ اپنی جگہ خلیفہ کامل مکمل مقرر نہ کرے اور اس کا کوئی وارث اپنے آپ سے خود اس کا خلیفہ بنائے اور ان کی گدی پر قبضہ کرے صرف اسلئے کہ اس کی عزت اور مرتبہ سمجھا جائے۔ یعنی اس کا مطلب صرف دنیا کا حصول ہے۔ مشائخ عظام رحمھم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شیخ مقلد کی صحبت سے ایسا بھاگو جیسے چیتے سے بھاگا جاتا ہے۔

تصورِ شیخ

شیخ، یا شیخ الشیخ یا رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ کو اپنے خیال میں جمانا اس کو رابطہ یا تصورِ شیخ کہتے ہیں۔

تصورِ شیخ کو صوفیاء بالخصوص بزرگان نقشبندیہ کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ بعضوں کے نزدیک اسی پر ارادت و سلوک کا دار و مدار ہے۔ اور مرید کی نفع رسانی میں یہ صحبت شیخ کے مثل نفع بخش ہے چنانچہ مولانا عبد الرحمن جامی قدس سرہ نے اپنے رسالہ سرشتہ دولت میں فرمایا کہ اگر وہ عزیز (شیخ) غائب ہو تو اس کی صورت کو خیال میں لے کر تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ قلبِ صنوبری کی طرف متوجہ ہو اور جو خطرہ آئے اس کو دور کرے یہاں تک کہ غیبت و بے خودی ظاہر ہو جائے اور ایسا بار بار کرنے سے اس کا ملکہ (مہارت) پیدا ہو جاتا ہے اور (خدا تک رسائی کے لئے) اس سے زیادہ نزدیک کا کوئی راستہ نہیں ہے۔[1]

---

[1] (معمولاتِ مظہریہ)

اسی طرح حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صدہا جگہ مکتوبات میں اس کی اہمیت ومنفعت کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی تحصیل پر تاکید جمیل اور اس کے حصول پر تبشیر جلیل فرمائی ہے۔ ذیل میں چند حوالے تحریر کئے جاتے ہیں جو طالب حق کے لئے ان شاءاللہ تعالیٰ ہادی سبیل ہونگے۔

مکتوبات جلد سوئم مکتوب ۱۸۷ میں تحریر فرمایا کہ "بلا تکلف تصور شیخ کا حاصل ہو جانا یہ پیر ومرید کے درمیان کامل مناسبت کی نشانی ہے جو فائدہ پہنچانے اور فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ و سبب ہے اور رسائی کا کوئی راستہ اس سے زیادہ نزدیک کا نہیں ہے جو بڑا ہی دولت مند (طریقت) ہو اسی کو اس سعادت کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔"

حضرت خواجہ احرار قدس سرہ نے فقرات میں ارشاد فرمایا کہ (پیر کا سایہ ذکر الٰہی سے بڑھ کر ہے) مکتوبات جلد سوم مکتوب ۱۹۰ میں ارقام فرمایا کہ "اگر ذکر کے وقت پیر کی صورت بے تکلف ظاہر ہو جائے تو اس کو بھی قلب کے اندر لے جانا چاہیئے اور دل میں محفوظ رکھ کر ذکر کرنا چاہیئے۔ کیا تو جانتا ہے کہ پیر کون ہے؟ پیر وہ ہے کہ تو جناب باری جل شانہ تک پہنچنے کا راستہ اس سے حاصل کرتا ہے اور اس راہ میں تو اس کی امداد و اعانت پاتا ہے۔"

مکتوبات جلد ششم مکتوب ۳۰ دفتر دوم مطبوعہ امر تسر میں ہے:"خواجہ محمد اشرف نے تصور شیخ کی مشق کے بارے میں لکھا تھا کہ اس حد تک غلبہ پاگئی ہے کہ نمازوں میں اس کو اپنا مسجود دیکھتا ہوں۔ اور اگر بالفرض اس کو دفع کرتا ہوں تو دفع نہیں ہوتا ہے۔ میرے دوست یہ دولت تو وہ ہے کہ طالبین اس کی تمنا کرتے ہیں اور ہزاروں میں سے کسی ایک کو شاید ہی عطا کی جاتی ہے جس کو یہ معاملہ پیش آئے وہ کامل مناسبت والا صاحب استعداد ہے ممکن ہے کہ شیخ مقتدا کے تمام کمالات کو حاصل کرلے گا۔ اور رابطہ (تصور شیخ) کو دفع کیوں کرتے ہو؟ وہ تو مسجود الیہ (جس سمت کو سجدہ کیا جائے) ہے۔ وہ مسجود لہ (جس کو سجدہ کیا جائے) نہیں ہے۔ اس قسم کی دولت سعادت مندوں کا حصہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمام حالتوں میں صاحب رابطہ (شیخ) کو اپنا وسیلہ جانتا ہے اور تمام اوقات میں اس کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے القول الجمیل میں ارشاد فرمایا ہے:

اذا غاب الشیخ عنہ یجعل صورتہ بین عینیہ بوصف المحبۃ والتعظیم فتفید صورتہ ما تفید صحبتہ۔

"جب پیر موجود نہ ہو تو اسکی صورت کا اپنی آنکھوں کے درمیان محبت و تعظیم کے ساتھ خیال جمائے تو اس کی صورت سے وہی فائدہ پہنچے گا جو اس کی صحبت سے پہنچتا ہے۔"

بزرگوں نے فرمایا کہ مرید ہر وقت اور ہر جگہ پیر کا حاجت مند رہے گا۔ اور ہر جگہ پیر کی تصویر و شکل کا تصور اور فکر ضرور کرے گا۔ چاہے وظیفہ (ورد) کا وقت ہو یا نہ ہو لیکن پیر کا تصور کرے گا۔ اور اس کا جسم و وجود اگر تصور کی نظر میں بھی دیکھے تو

پھر بھی نہایت مؤدب اور باحیا رہے گا۔ گویا کہ عین اس کے حضور میں ہے۔ یہاں تک کہ جب پیر کا تصور ہمیشہ رہے گا تو یہ رب العزت کے حق کا نور اس پیر کے باطن کے حقیقی آئینہ سے اپنے باطنی آئینہ پر دیکھ لے گا اور جب یہ مرید پیر کی طرف متوجہ ہو گا تو پیر کے حقیقی آئینے سے اللہ رب العزت کے نور کا عکس مرید کے باطن پر اس طرح پڑے گا جس طرح سورج ایک شیشے سے دوسرے میں نظر آتا ہے تو جب کوئی سورج دیکھنے کی خواہش کرے تو اس دوسرے شیشے میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ تو جب آپ کو اپنے شیخ کے تصور سے وہ حقیقی نور آپ کے آئینہ میں سامنے نظر آئے یعنی اللہ رب العزت کا نور حق۔ تو پھر آپ کا آئینہ حقیقی بھی دوسرے مؤمن کیلئے معرفت خداوندی کا آئینہ بن جائے گا۔

پیارے! اسی لئے تو پیر کی محبت، توجہ، اطاعت تمہارے لئے عین اللہ تعالیٰ کی محبت، اطاعت، توجہ قرار دی گئی ہے۔ اور پیر کی رضا کو اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے دیکھنے کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا۔ پیر کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور پیر کی بات کو اللہ تعالیٰ کی بات کہا گیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو مؤمن کامل کے دل میں دیکھو''۔

پیارے دوستو! شیخ یعنی اپنے پیر کے تصور کو انتہائی ادب و عاجزی کے ساتھ اپنے آپ پر ہر جگہ ہر وقت اور ہر حال میں لازم کرو۔ اور اپنے ظاہر و باطن پر اپنے پیر کا تصور اس طرح کرو کہ اپنا باطن و ظاہر تمہاری فکر سے ختم ہو جائے۔ اور اپنے ظاہر و باطن کی جگہ تمہیں اپنے پیر کا تصور نظر آئے۔ اور اس حقیقی نورانی آئینے میں تم اللہ رب العزت کا نور دیکھ سکو۔ (وما توفیقی الا باللہ)۔

یار رفت از چشم لیکن روز و شب در خاطر است
گر بصورت غائب است اما بمعنی حاضر است

سالکِ طریقت کو چاہیئے کہ اپنے مرشد کامل متّبع قرآن و سنت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور ہمیشہ حضورِ حق تعالیٰ کا طالب رہے اور قربِ خداوندی کے حصول اور مقامِ مشاہدہ پر فائز ہونے کے لئے پیرِ طریقت کی صحبت اور محبت کو ضروری سمجھے۔ سالک کو جس قدر اپنے پیر سے زیادہ محبت ہوگی اسی قدر اسے قربِ خداوندی زیادہ نصیب ہوگا۔ اولیاء اللہ اذا رؤ و ذکر اللہ الحدیث (اولیاء اللہ وہ ہیں جن کو دیکھا جائے تو اللہ یاد آجائے) اس پر قوی دلیل ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اولیاء اللہ کے تمام افعال و اعمال اور اقوال، احکامِ الٰہی کے عین مطابق ہوتے ہیں جس کی بدولت ان کو قرب و معیتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے لہٰذا جو ان سے محبت رکھے گا اور ان کے اخلاق و اطوار کو اپنائے گا وہ بھی ان کی طرح قرب الٰہی کے مراتب پر فائز ہوگا۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بقدر محبت ہی کسی کے طریقہ کو اپنایا جاتا ہے۔ اسی بناپر صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے سالک کے لئے مرشد کامل کی محبت کو لازمی اور ضروری قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر شیخ موجود ہو تو اس کے دونوں ابرو کے درمیان نظر رکھے، دوسری طرف توجہ نہ کرے اور اگر غائب ہو تو اس کی صورت کو پیش نظر تصور کرے۔ ایسا تصور پختہ ہونے کے بعد ہر معاملہ میں سالک اس طریقہ کو اختیار کرے گا جو پیر کے مذاق و مزاج کے موافق ہو گا۔

بقول حضرت شیخ عبد الرحیم، والد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہما اول تجلی ذات و صفات پیدا کرو تاکہ دونوں جہاں سے نجات پاؤ۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو ان شخصوں سے رابطہ پیدا کرو جو شہودِ ذات سے واصل ہو کر ماسوائے حق سے نجات پا گئے ہیں۔ ایسے شخصوں کی توجہ سے جلدی مقصود حاصل ہوتا ہے جو سالہا سال مجاہدوں اور ریاضتوں سے نہیں ہوتا۔[1]

الغرض وصول و قرب الٰہی کے حصول کے لئے ذریعہ و وسیلہ ہونے، نیز نفسانی و شیطانی وساوس و خطرات سے نجات اور اخلاق حمیدہ کے حاصل کرنے کے لئے صوفیا کرام کا رابطہ و تصور شیخ کا معمول، مفید و مجرب روحانی نسخہ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی شرعی قباحت لازم نہیں آتی گو مشہور محدثین، مفسرین اور مستند علماء ربانیین کے قول و عمل سے نہ فقط یہ کہ رابطہ و تصورِ شیخ کے عمل کی تائید ہوتی ہے بلکہ اس کی اہمیت و ضرورت مفہوم ہوتی ہے۔

اصول و فروع، فنون و علوم ظاہرہ کے ماہر اور امور باطن کے عارف حضرت مولینا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ ''سر رشتہ دولت'' میں تفصیل و تشریح کے ساتھ رابطہ شیخ کے فوائد اور ضرورت پر بحث فرمائی ہے۔

فرمایا: سیوم طریق ذکر رابطہ است باپیرے کہ بہ مشاہدہ رسیدہ باشد و بہ تجلیات ذاتیہ متحقق گشتہ و دیدار وے۔ بمقتضائے هم الذین اذا رؤو ذكر الله فائدہ ذکر دہد و صحبت وے، بمقتضائے هم جلساء الله نتیجہ صحبت مذکور دہد پس چوں دولت دیدار و صحبت چنیں عزیزے دست دہد و اثر آنرا در خود یابد چنداں کہ تواند آں اثر را باخود نگاہ دارد، و اگر دراں معنے فتورے واقع شود باز بہ صحبت آں عزیز مراجعت نماید تا بہ برکت صحبت شریف آن معنے پر تواند از وو ہم چنیں مرۃ بعد اخریٰ تاآں زمان کہ آں کیفیت ملکہ وے گردد و اگر چنانچہ آں عزیز غائب باشد صورت وے را در خیال گرفتہ بجمیع قویٰ ظاہری و باطنی متوجہ قلب صنوبری گردد، و ہر خواطرے کہ درآید نفی کند تاآں کیفیت غیبت بے خودی روئے نماید، و بتکرار ایں معاملہ ملکہ گردد و ہیچ طریق از ایں اقرب نیست۔ بسیار باشد کہ چوں مرید

[1] (هداية الانسان ص ۲۷ بحواله ارشاد رحیمیه)

را قابلیت آں باشد کہ پیر درو تصرف کند در اول صحبت وے را بر مرتبہ مشاہدہ رساند و چوں کہ وجودِ عزیز ایں چنیں عزیزے دریں روزگار اعز من الکبریت الاحمر است می باید کہ یکے ازاں دو طریق کہ پیشتر مذکور شد یعنی طریق مراقبہ و طریق نفی و اثبات اشغال دارد۔

”تیسرا طریقہ ذکر رابطہ ہے۔ ایسے پیر و مرشد کے ساتھ رابطہ جو مقام مشاہدہ (خداوندی) تک پہنچا ہوا ہو اور اسے ذاتی تجلیات حاصل ہوں اس کا دیکھنا حدیث (اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جن کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یاد آ جائے) کے مطابق ذکر الٰہی کا فائدہ دیتا ہے اور اس کی صحبت حدیث (یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہیں) کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھنے پر منتج ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ایسے پیارے کی صحبت و زیارت کی دولت ہاتھ آ جائے اور مرید صحبت کا اثر بھی اپنے اندر پائے تو چاہیئے کہ جس قدر ہو سکے اثر کو اپنے وجود میں باقی رکھے اور اگر (کسی وجہ سے) اس نعمت میں فرق محسوس کرے تو چاہیئے کہ پھر سے ان کی صحبت میں چلا جائے تاکہ ان کی صحبت کی برکت سے وہ حالت پھر سے لوٹ آئے اور بار بار ایسا کرتا رہے یہاں تک کہ یہ حالت اس کا ملکہ بن جائے (بلا تکلف حاصل رہے)۔ اگر ایسا پیارا غائب ہو تو اس کی صورت کا خیال کر کے ظاہری اور باطنی قوتوں سے قلب صنوبری (دل) کی طرف متوجہ ہو جائے اور جو خطرہ دل پر گزرے اس کو ہٹاتا رہے یہاں تک کہ غیر اختیاری غیبت کی وہ کیفیت حاصل ہو جائے اور اس کے بار بار دہرانے سے یہ معاملہ ملکہ بن جائے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ قربِ الٰہی کے طریقوں میں اس سے بڑھ کر کوئی بھی طریقہ قریب نہیں ہے۔ بارہا یہ بھی ہوا ہے کہ مرید میں تصرف قبول کرنے کی صلاحیت دیکھ کر شیخ کامل نے پہلی ہی صحبت میں اس کو مقام مشاہدہ تک پہنچا دیا لیکن چونکہ ایسے پیاروں کا پایا جانا آج کے زمانہ میں کبریت احمر (سرخ گندھک) سے بھی زیادہ نایاب ہے، لہٰذا چاہیئے کہ مذکورہ دو طریقوں یعنی طریقہ مراقبہ اور نفی اثبات میں سے ایک کا شغل اختیار کرے)۔[1]

گر نقش کنی بلوحِ دل صورتِ او	زاں نقش بہ نقشبند یابی راہے
سرِ غمِ عشق دردمنداں دانند	نے خود منشاں و خود پسنداں دانند
از نقش تواں بسوئے بے نقش شدن	وایں نقشِ غریب نقشبنداں دانند

---

[1] (ص ۴۸، ۴۷ رسالہ فنافی الشیخ بحوالہ معمولات حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہ)

ترجمہ: "اگر اس کی (پیر کی) صورت اپنے دل پر نقش کرے گا تو اس نقش سے نقش بنانے والے (اللہ تعالیٰ) کی راہ پائے گا۔ عشق کے غم کا راز دردمند ہی جانتے ہیں خود غرض اور خود پسند نہیں جانتے۔ نقش سے بے نقش کی طرف پہنچا جا سکتا ہے اور یہ عجیب نقش نقشبندی طریقے والے ہی جانتے ہیں۔"

رابطۂ شیخ عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم قدس سرہ کی نظر میں

آپ نے حضرت محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے نام رابطہ، اتباع سنت اور صحبت شیخ کے بارے میں ایک مفصل مکتوب تحریر فرمایا جس کے ابتدائیہ کلمات یہ ہیں:

"بسم اللہ حامداً للہ العظیم و مصلیاً علی رسولہ الکریم۔ سیادت و نقابت پناہا در طریقہء مامدار وصول درجۂ کمال مربوط برابطہ محبت است بشیخ مقتدیٰ طالب صادق از راہ محبتے کہ بشیخ دارد اخذ فیوض و برکات از باطن اومی نماید و بمناسبت معنویہ ساعۃً فساعۃً برنگ اومی برآید گفتہ اند فنافی الشیخ مقدمۂ فنائے حقیقی است ذکر تنہا بے رابطہ مسطورہ و بے فنا فی الشیخ موصل نیست ذکر ہرچند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط برابطہ محبت و فنا در شیخ است آرے ایں رابطہ تنہا با رعایت آداب صحبت و توجہ والتفات شیخ بے التزام طریق ذکر موصول است۔

ترجمہ: (خطبہ کے بعد) محترم بزرگو پیشواؤ ہمارے طریقہ میں کمال درجہ پر فائز ہونا شیخ مقتدیٰ سے رابطہ محبت قائم کرنے سے وابستہ ہے۔ مرید صادق مرشد کامل سے محبت کی بدولت فیوض و برکات ان (مرشد) کے باطن سے اخذ کرتا ہے۔ باطنی مناسبت کے ذریعے لحہ بہ لحہ اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس لئے تو بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ فنافی الشیخ حقیقی فنا کے لئے پیش خیمہ ہے۔ مطلوب کے رابطہ اور فنافی الشیخ کے بغیر محض ذکر منزل رساں نہیں ہے گو ذکر کتنا ہی اسباب وصولی میں سے اہم ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر رابطہ محبت اور فنافی الشیخ اس کے لئے شرط کے طور پر ضروری ثابت ہوئے ہیں۔ البتہ طریق ذکر کی پابندی کے بغیر بھی محض رابطہ جبکہ آداب صحبت اور توجہ والتفات شیخ سے وابستہ ہو مطلوب تک پہنچا سکتا ہے۔ (یہ اس لئے کہ ربط کے بعد تدریجاً تدریجاً ذکر کی پابندی بھی نصیب ہو جاتی ہے)۔[1]

مکتوب نمبر ۵۰ میں بھی اسی موضوع پر کافی عمدہ تحقیق فرمائی ہے:

---

[1] (مکتوب ۷۸، دفتر اول ص ۱۹۶)

رابطہ میں فتور، اعمال میں تکاسل پیدا کرتا ہے

سیدنا امام ربانی قدس سرہ نے خواجہ محمد اشرف صاحب کے نام تحریر فرمایا:

"پرسیدہ بودند کہ لم ایں چیست کہ چوں در نسبتِ رابطہ فتور میرود، در اتیانِ سائر طاعات التذاذ نمی یابد، بدانند کہ ہماں وجہے کہ سبب فتور رابطہ گشتہ است مانع التذاذ اواست گاہ ہست کہ سبب فتور قبض بود و گاہ کدورتے طاری می گردد، بواسطۂ ارتکاب زلات اگرچہ اندک بود، وجہ اول مذموم نیست بلکہ از لوازم سلوک طریقہ است و عروض وجہ دوم را تدارک بتوبہ واستغفار باید نمود تا بکرم اللہ سبحانہ اثرآن مرتفع گردد، وچوں تمیز میانِ قبض و کدورت دقت می طلبد بہر حال توبہ واستغفار نافع است حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ باستقامت دارد والسلام۔"

جناب نے دریافت کیا تھا کہ جب رابطہ میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو تمام عبادات میں پہلی سی لذت نہیں رہتی اس کی وجہ کیا ہے؟

جان لو کہ جو چیز نسبت رابطہ میں فتور کا باعث بنی ہے وہی چیز لذت عبادت سے مانع ہے۔ بعض اوقات قبض (طریقت میں فکر مندی کی سی کیفیت پیدا ہو جانے کو قبض اور اس کے ختم ہونے کو بسط سے تعبیر کرتے ہیں) کی وجہ سے اس قسم کا خلل واقع ہوتا ہے اور کبھی خطاؤں کے ارتکاب کی وجہ سے میل کچیل پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ وہ معمولی ہو پھر بھی رابطہ میں کمزوری اور عبادات میں دل نہ لگنے کا باعث بنتا ہے۔

پہلی قسم (قبض والی) بری نہیں بلکہ سلوک طریقت کے لوازمات میں سے ہے اور اگر دوسری صورت لاحق ہو جائے تو توبہ واستغفار سے اس کا تدارک کرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کا اثر زائل ہو جائے۔

لیکن چونکہ قبض وکدورت کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہے اس لئے ہر حال میں توبہ واستغفار مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے۔ والسلام۔[1]

بحوالہ "راہ حقیقت" مؤلفہ حضرت علامہ شیخ المشائخ مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

یہ گزشتہ اوراق میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ حضرات صوفیاء کرام کا کوئی بھی معمول بال برابر بھی شریعت کے خلاف نہیں لہٰذا ان بزرگوں کا تصور شیخ کے عمل پر اس اہتمام کے ساتھ عامل ہونا بھی ہرگز ہرگز خلاف شریعت نہیں ہو سکتا۔

---

[1] (ص ۸۸،۸۷ مکتوب ۱۰۷ دفتر سوم حصہ نہم)

بحمدہ تعالیٰ دلائل عقلیہ و نقلیہ نیز اقوال علماء وائمہ اس مسئلے میں اتنے کافی موجود ہیں کہ اگر ان کو نقل کر دیا جائے تو ایک مستقل رسالہ تیار ہو جائے گا لیکن ہم صرف چند دلیلیں ذکر کرتے ہیں۔ **واللہ الھادی الی الرشاد۔**

تصور شیخ قرآن کریم، عملِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ سے

خداوند قدوس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ارشاد فرمایا **وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ (یوسف ۲۴)** یعنی "اس (زلیخا) نے ان (یوسف علیہ السلام) کے ساتھ ارادہ کر لیا۔ اور وہ (یوسف علیہ السلام) بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے ربّ کی برہان کو نہ دیکھ لیتے۔" جب زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو خلوت میں دروازہ بند کر کے اپنے مقصد کی طالب ہوئی، اور قریب تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی اس طرف مائل ہو جائیں مگر ناگہاں عصمت نبوت ظاہر ہو گئی اور ان کو برہانِ رب کا دیدار ہو گیا۔ جس کے سبب وہ اس ارادے سے معصوم و محفوظ رہے۔ [1]

اب رہا یہ سوال کہ وہ برہان رب کیا چیز تھی جس نے ایسے آڑے وقت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دستگیری کی۔ اس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زبان سے سنئے۔

انہوں نے فرمایا:

مثل لہ یعقوب فضرب صدرہ فخرجت شھوتہ من انا ملہ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہوئی جس نے آپ کے سینے پر ایک ضرب لگائی تو ان کی شہوت انگلیوں کے پوروں سے نکل گئی۔ [2]

حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کا حضرت یوسف علیہ السلام کے روبرو موجود ہو کر ان کی دستگیری کرنا ہی رابطہ یا تصور شیخ ہے۔ آیت اور تفسیر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نسبت رابطہ کا ثبوت اور اس کا نافع ہونا دونوں باتیں روز روشن کی طرح ثابت ہو گئیں۔ اور انبیاء سابقین علیہم السلام کی شریعتوں اور سنتوں کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ: فبھدٰھم اقتدہ۔ یعنی اے محمد ﷺ آپ اگلے انبیاء کی سیرتوں کی پیروی کیجئے۔ اسی لئے اسلام کا یہ اصول ہے کہ اگلے انبیاء کی ہر وہ سنت جو شریعت محمدیہ ﷺ میں منسوخ نہ ہو وہ شریعت محمدیہ ﷺ کی طرح اس امت کے لئے قابل عمل ہے۔ اب اس قاعدے کی روشنی میں تصور شیخ جس کا سنت یوسف ں ہونا اس آیت سے معلوم ہوا۔ جب کہ اس کے منسوخ ہونے پر کسی آیت یا حدیث

---

[1] (عامہ تفاسیر)

[2] (تفسیر صاوی)

کی شہادت موجود نہیں ہے تو یہ تمام سنن نبویہ ﷺ کے مثل یقیناً امت کے لئے قابل عمل ہو گا۔ خصوصاً جبکہ احادیث و آثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس کی تائید بھی ہوتی ہو۔ پھر تو اس کا قابل عمل ہونا نورٌ علیٰ نور ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد ۲۴)

ترجمہ: تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں)۔

طریقِ استدلال:

اس آیت کریمہ میں مطلقاً قرآن مجید میں غور و فکر کرنے کا حکم ہے۔ تلاوت حالتِ نماز میں ہو یا بیرون نماز، بہر صورت تلاوت کرنے والا جب قرآنی آیات کے معانی و مطالب میں غور و خوض کرے گا تو لازمی طور پر اس کے ذہن میں ان افراد و اشیاء کا تصور بھی آئے گا جن کا ذکر ان آیات میں ہو گا۔ مثلاً جب آیہ مبارکہ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ ۷) (راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا) کی تلاوت کرے گا تو ضرور یہ سوچے گا کہ وہ کون افراد ہیں جو علی وجہ الاتم و لاکمل اللہ تعالیٰ سے انعامات یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ایک مومن کے دل میں انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام علیہم الرضوان اور دیگر اولیاء اللہ کی فہرست سامنے آجائے گی۔ بالخصوص اپنے شیخ کامل متبع قرآن و سنت کا تصور تو ضرور سامنے آئے گا۔ جس پر انوار و تجلیات الٰہی کے انعامات دیکھ چکا ہے اور اس سے فیض یاب بھی ہو چکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سورۃ فاتحہ ہی کی آیت غیر المغضوب علیهم و لا الضالین (الفاتحہ ۷) تلاوت کرتے وقت قاری کا ذہن یہود و نصاریٰ کی طرف بھی منتقل ہو گا جن کا اس میں ذکر ہے۔ ایک دو بار نہیں، نماز فرض، واجب، خواہ سنت و نفل کی ہر رکعت میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور فکر نہ کرنا دلوں پر تالے لگنے کی علامت ہے۔

لہٰذا اس قسم کے غور و فکر اور تصور کو خلاف شرع، شرک و بدعت اور بت پرستی کہنا تصوف سے ہی نہیں بلکہ قرآن و سنت سے جہالت و بے خبری یا عناد کی علامت ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف ۱۷۹)

ترجمہ: "ان کے دل ایسے ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ایسے ہیں کہ ان سے سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ زیادہ بے راہ ہیں، یہ غافل ہی ہیں۔"

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں غور کرنے سے انسان ہی نہیں عام حیوانات بلکہ جمادات تک کا تصور لازم آتا ہے۔ اور وہ جائز ہے مثلاً أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (الغاشیة ۱۷) وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۸) إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرة ۲۶) میں غور کرنے سے اونٹ، گھوڑے، خچر، گدھے، مچھر، مکھی، مچھلی وغیرہ کا تصور لازم آئے گا خواہ ان کا ذکر اظہار قدرت کے طور پر ہو یا انعامات الٰہی یا صفات غضب و قہر کی بنا پر ہو۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۸) اور فَمَا فَوْقَهَا (البقرة ۲۶) سے تو غیر معلوم اشیاء کا تصور تک ثابت ہوتا ہے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (الانعام ۷۹)

طریق استدلال:

آیات سابقہ کی طرح جب تلاوت کرنے والا تلاوت کے ساتھ اس آیت مبارکہ میں غور و فکر بھی کرے گا تو بقول حضرت مقیم الدین دامانی علیہ الرحمۃ:

تصور روئے ذات خود و خیال آسمان و زمین دریں آیت امر لازمی است بوجودیکہ وما انا من المشرکین ہم موجود است، ازیں معلوم شد کہ صرف تصور و خیال غیر اللہ شرک نیست تاوقتیکہ غیر را بخداوند جل و علی شریک فی الذات یا فی الصفات یا فی العبادات اعتقاد نہ کند۔

اس آیت میں اپنے چہرہ اور جسم کا تصور نیز زمین و آسمان کا خیال لازمی امر ہے باوجودیکہ کلمہ وما انا من المشرکین (کہ میں مشرکین میں سے نہیں) بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ صرف تصور و خیال غیر اللہ کا شرک نہیں تاوقتیکہ آدمی غیر اللہ کو ذات، صفات یا عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک اعتقاد نہ کرے (العیاذ باللہ)۔[1]

صحابی رضی اللہ عنہ کا رابطۂ رسول ﷺ

صحابی رسول حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بھی مخلصین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ اور آپ کو اپنے مرشد و مربی ﷺ سے وارفتگی کی حد تک محبت تھی۔ ہر وقت رابطہ قلبی سے موصوف رہتے تھے۔ چنانچہ مروی ہے کہ ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، ہمیشہ فکر مند نظر آتے تھے۔ ایک بار شیخ کامل نبی برحق ﷺ نے ان سے اس کیفیت کی وجہ دریافت فرمائی، جواباً عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کی ذات مجھے جسم و جان اور جہاں سے زیادہ عزیز ہے جب کبھی آپ کی مجلس کے بعد گھر جاتا

[1] (رسالہ فنافی الشیخ ص ۴۰، ۳۹)

ہوں اور آپ ﷺ کی محبت جوش مارتی ہے تو فوراً آپ ﷺ کے در دولت پر حاضر ہو کر زیارت سے مشرف ہوتا ہوں۔ لیکن مجھے فکر یہ ہے کہ کل آخرت میں آپ ﷺ جنت کے ارفع و اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔ میں آپ ﷺ کے ساتھ ہو نہیں سکتا۔ وہاں اگر آپ ﷺ کی محبت کا غلبہ ہو گیا تو کیسے آپ ﷺ کے دیدار مبارک سے قلب کو تسکین فراہم کرونگا بس اسی فکر فردا نے مجھے پتلا دبلا بنا دیا ہے۔ صحابی رسول رضی اللہ عنہ کا رابطہ رسول ﷺ، اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اسی موضوع پر ایک مستقل آیت نازل فرما کر ان کے لئے اور ان کے صدقہ دوسرے محبین صادقین کے لئے آخرت میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی معیت و رفاقت کا وعدہ فرمایا، رسول خدا ﷺ نے اس وقت ان کو بشارت سنادی کہ مخلص فرمانبردار اور محبت کے متوالوں کو جنت میں بھی درجات میں تفاوت کے باوجود انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کا قرب حاصل ہو گا۔

وہ آیت درج ذیل ہے:

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا (النساء ۶۹)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبة ۱۱۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچے بندوں کے ساتھ رہو۔"

اس آیت مبارکہ میں صادقین (سچے بندوں) کے ساتھ رہنے کا حکم ہے اور اس کے لئے کسی مخصوص عرصہ و زمان کا ذکر بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے معیت (ساتھ رہنا) دائمی مراد ہے، اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ جسمانی طور پر آدمی ہر لمحہ کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس صورت میں قلبی رابطہ اور باطنی معیت ہی کے ذریعہ صادقین کے ساتھ رہا جا سکتا ہے اور رابطہ ہو جانے کے بعد سالک ہر لمحہ اپنے آپ کو شیخ کے حضور میں سمجھتا ہے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار اور حضرت محبوب سبحانی سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہما نے اسی آیہ مبارکہ سے رابطہ ثابت کیا ہے۔

سورہ یوسف میں ارشاد خداوندی ہے: لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ (یوسف ۲۴) یعنی اگر حضرت یوسف علیہ السلام اللہ عزوجل کی برہان کو نہ دیکھتے تو سیدہ زلیخہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف متوجہ ہو جاتے، لفظ برہان کے متعلق مفسرین کرام کا ایک قول یہ بھی ہے کہ برہان حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں جن کی شکل مبارک اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو نظر آئی۔ فرما رہے تھے:

"یایوسف اتعمل عمل السفهاء وانت مکتوب من الانبیاء"۔[1]

---

[1] (ص ۱۵ تفسیر خازن جلد ۳)

سورہ یوسف کی اس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مقربان الٰہی آڑے وقت میں اپنے متعلقین کے یہاں پہنچ کر ان کو گناہ سے بچاسکتے ہیں۔ کم از کم اتنا تو صراحتہً ثابت ہوا کہ ایسے وقت میں مرید صادق، مرشد کامل کے تصور صورت کی بدولت لغزش سے بچ سکتا ہے۔

صحیح مسلم شریف میں ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے رسول خدا ﷺ کے لئے **کانی انظر** (گویا کہ میں آپ ﷺ کو دیکھ رہی ہوں) اور حلیۃ الاولیاء میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ **واللہ لکأنی اریٰ رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ تبوک** (خدا کی قسم گویا کہ میں غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں)۔ بس یہی تو تصور ہے کہ بظاہر جو غیر موجود ہو اس کو ذہن وخیال میں موجود تصور کیا جائے، **فبھٰذا الحدیث و امثالہ الواردۃ فی الصحاح استنبطوا جواز تصور الشیخ ولہ وجہ لاکن لایفھم المناظر** (اس حدیث اور اس کی مثل صحاح ستہ میں موجود دوسری حدیثوں سے صوفیا کرام نے تصور شیخ جائز ثابت کیا ہے لیکن جو بحث مباحثہ کرتا ہے (جس کو تنقید برائے مخالفت کی عادت ہے) وہ پھر بھی خاموش نہیں ہوتا۔[1]

حضرت ابو العباس مرسی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تصور رسول ﷺ

آپ حضرت ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کے قابل قدر شاگرد ہیں، آپ کے تصور رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ فقراء سے فرمایا اگر ایک لمحہ بھی رسول اللہ ﷺ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہ کروں۔

اس مقام پر احقر مؤلف یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ یہ صرف تفسیری یا تاریخی نہیں بلکہ اس قسم کے واقعات اولیاء کرام قدس سرہم العزیز کے اہل ذکر مریدین سے پیش آتے ہیں مثلاً ان کو ضرورت کے وقت اپنے مرشد کی صورت نظر آجاتی ہے، یا ان کے لہجے میں زبانی تنبیہی آواز سننے میں آتی ہے جس کے صدقے وہ کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے خود گواہ ہیں۔

خدا نخواستہ اگر رابطہ اور تصور شیخ ناجائز اور شرک ہوتا تو وہ گناہ سے بچنے کا ذریعہ کب بنتا؟ شرک وکفر گناہ کے باعث تو ہیں ہدایت کے ذرائع ہر گز نہیں ہوسکتے، لہٰذا تجربہ ومشاہدہ سے تصور شیخ کا باعث ہدایت ہونا اس کے جواز کے لئے کافی گواہ ہے۔

چوں خلیل آمد خیال یار من ۔۔۔ صورتش بت معنی او بت شکن

[1] (ہدایت الانسان بحوالہ مولانا عبد الحی ص ۱۰۲)

قُلۡ إِنۡ كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡ (آل عمران ۳۱)

ترجمہ: اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو اللہ تعالیٰ تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

نیز ارشاد فرمایا:

وَٱتَّبِعۡ سَبِيلَ مَنۡ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمان ۱۵)

ترجمہ: اور اسی کی تابعداری کرو جو میری طرف رجوع کئے ہوئے ہیں۔

اول الذکر آیۂ مبارکہ میں اتباع رسول ﷺ کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں اہل اللہ کے اتباع کا حکم ہے۔ لفظ اتباع کے معنی ہیں کسی کی پیروی کرنا یا کسی کے نقش قدم پر چلنا۔

اور یہ بھی مسئلہ حقیقت ہے کہ کمال اتباع کمال محبت کے بغیر ثابت و محقق نہیں ہو سکتا اور کمال محبت کے لئے کمال یادداشتِ محبوب ضروری ہے۔ کمال یادداشت کے ساتھ محبوب کی سیرت و صورت کا دل میں آجانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے نقش قدم پر چلنے کے لئے مقتدیٰ کے طور طریقہ کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صلّوا کما رأیتمونی اصلّی (اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو) اور بعینہ اسی کیفیت و صورت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ صحابہ کرام نے اس کیفیت کو یاد رکھا ہو۔ چنانچہ معتدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو نماز پڑھ کر دکھائی اور فرمایا بعینہ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔

فتاویٰ کی مشہور و معروف کتاب فتاویٰ شامی میں علامہ ابن عابدین شامی قدس سرہ نے تحریر فرمایا کہ تشہّد میں السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ اور السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین۔ کہتے وقت ان الفاظ کے معنی کا ارادہ کرکے پڑھے، محض نقل اور حکایت کی بنا پر نہ پڑھے یعنی اس وقت یہ ارادہ کرلے کہ میں بارگاہ رسول ﷺ میں خود ہدیہ سلام پیش کر رہا ہوں۔ اسی طرح اپنے نفس اور اولیاء اللہ پر بالمشافہ سلام کہے۔ اسی طرح التحیات للہ پڑھتے وقت بھی خود نذرانہ تحیۃ پیش کرنے کی نیت کرے۔ مزید تائیداً فرمایا کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ "انّی رسول اللہ" (میں خدا کا رسول ہوں) پڑھتے تھے۔ اگر حکایۃ حال ماضی مقصد ہوتا تو اس قسم کی تخصیص نہ فرماتے۔

بالفاظہ: ویقصد بالفاظ التشھد معانیھا مرادۃ لہ علی وجہ الانشاء کانہ یحیی اللہ تعالیٰ ویسلم علی نبیہ وعلی نفسہ و اولیائہ لا الاخبار عن ذالک ذکرہ فی المجتبیٰ و ظاھرہ ان ضمیر علینا للحاضرین لا حکایۃ سلام اللہ تعالیٰ و کان علیہ الصلوۃ والسلام یقول فیہ انی رسول اللہ۔ [1]

مولانا محمد مقیم الدین دامانی قدس سرہ رسالہ فنا فی الشیخ ص ۳۸ پر فرماتے ہیں:

خواندن بطریق انشاء در السلام علیک ایھا النبی تصور نبی خصوصاً برائے اصحاب کبار کہ بچشم ظاہر از دیدار مبارک مشرف شدہ بودند بوقت قرأت السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین خیال ذات خود وعباد صالحین خصوصاً رہبر کامل خود کہ کمال آن دررگ وپوست قاری پیوستہ امر لازمی است۔

یعنی بطور انشاء (اپنی طرف سے نیت و ارادہ سے کچھ کہنا جس میں نقل کی نیت نہ ہو) السلام علیک ایھا النبی پڑھتے وقت نبی اکرم ﷺ کا تصور خاص کر، حضرات صحابہ کرام کے لئے جو ظاہری آنکھوں سے رسول اللہ ﷺ کی زیارت مبارکہ سے مشرف شدہ ہیں، امر لازمی ہے۔ اسی طرح السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین پڑھتے وقت اپنے وجود کا خیال اور دوسرے نیک بندگان خدا کا خیال، خاص کر اپنے مرشد کامل کا تصور لازمی ہے، جس کا کمال نماز پڑھنے والے (مرید کے) رگ و پوست میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

فتاویٰ عالم و حافظ ابو الحسنات عبد الحئی لکھنوی: "حضرت لکھنوی علیہ الرحمہ کے مجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص ۳۳۰ اور سوم میں ۱۳۲ پر تصور شیخ کے متعلق استفتا اور آپ کی جانب سے اثبات میں جوابات مذکور ہیں۔

چنانچہ جلد سوم ص ۱۳۲ کے استفتاء کے الفاظ یہ ہیں:

تصور مرشد کہ عند الصوفیاء معمول است درست است یانہ۔

(یعنی مرشد کا تصور جو کہ صوفیاء کے معمولات میں سے ہے، جائز ہے یا نہیں)

اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

جائز است اکابر بہ نیت پاک این عمل کردہ اند شاہ ولی اللہ دہلوی در قول جمیل مینویسند قالوا والرکن الاعظم ربط القلب بالشیخ علی وجہ المحبۃ والتعظیم ویلاحظ صورتہ الخ۔

مشائخ چشتیہ نے فرمایا ہے کہ مرشد سے محبت اور تعظیم کے ساتھ دل لگانا (باطنی ترقی کے لئے) رکن اعظم ہے۔

---

[1] (ص ۳۴۲ فتاویٰ شامی جزء اول)

جلد دوم کے استفتاء میں سائل نے تصور شیخ کے عدم جواز پر مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب صراط مستقیم کے حوالہ جات اور جواز تصوف پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی کتاب القول الجمیل کے حوالہ جات ذکر کر کے تشفی اور دفع تردد کے لئے آپ کی طرف رجوع کیا ہے۔

جواباً حضرت لکھنوی قدس سرہ نے تحریر فرمایا قول حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے رسالے قول الجمیل میں مفصل و مدلل مرقوم ہے مقرون بصدق و صواب ہے اور اقوال دیگر علماء صوفیاء کثر ھم اللہ تعالیٰ بھی اس قول کے موید ہیں اور تعامل علماءِ صوفیاء شغل مذکور کے نسبت ثابت ہے اور کوئی محذور شرعی بھی شغل مذکور میں نہیں پایا جاتا ہے۔ پس ربط قلب وکسب سعادت وجلب فیض علی وصف المحبۃ والتعظیم واز یاد موانست و مجانست کے واسطہ شغل مذکور بالیقین جائز ہے کیونکہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک علم ظاہر جس کا طریقہ تعلیم بھی بطور ظاہر معین ہے۔ دوسرا علم باطن کہ اس کی تعلیم بطور مخفی مقرر ہے اور ثانی اول سے انفع و اقوی و افضل ہے۔[1]

حضرت لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے مفصل فتویٰ پر جن علماء نے تائیدی نوٹ تحریر فرمائے ہیں ان میں ایک حضرت عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نوٹ ہے۔ آپ فرماتے ہیں واقعی اس شغل میں کچھ حرج شرعی نہیں ہے جیسا کہ مولانا شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اس کو قول الجمیل میں مدلل بیان کیا ہے۔ بلکہ یہ شغل ان حضرات کرام اولیاء اللہ العظام سے ماثور و منقول ہے کہ جن کی ولایت پر اجماع ہو گیا ہے پس انکار کرنا اس سے اور حرام جاننا اس کو نعوذ باللہ کہاں سے کہاں تک کس جگہ پہنچاتا ہے؟ اور اس تصور کو بت پرستی پر محمول کرنا اور ان آیات کو جو بت پرستی کی حرمت پر دال ہیں دلیل میں لانا اور اس فعل کو بت پرستی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، باقی رہا یہ امر کہ جب ایسے ثقات میں اختلاف ہو تو ہم کس کے قول پر عمل کریں۔ صورت اس کی یہ ہے کہ متقدمین کے قول پر عامی کو عمل کرنا چاہئے کیونکہ جس قدر علمائے متقدمین ہوں گے، وہ زمانہ آنحضرت ﷺ سے قریب تر ہوں گے، جو کہ خیر الازمنہ ہے اور جس قدر بعد اس زمانہ سے ہو گا، اسی قدر فتن کا زمانہ ہو گا جیسا کہ حدیث شریف "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے اشارہ النص سے ثابت ہوتا ہے۔[2]

---

[1] (مجموعہ فتاویٰ حصہ دوم ص ۳۳۵)

[2] (مجموعہ فتاویٰ ص ۳۳۷ ج ۲)

پیر طریقت مرشدنا حضرت شاہ ابو سعید دہلوی قدس سرہ نے شغل اولیٰ ذکر اسم ذات کی بحث میں ارشاد فرمایا:

برائے دفع خواطر، التجا و تضرع بجناب حضرت حق سبحانہ نماید و تصور صورت بزرگے کہ از و تلقین ذکر یافتہ مقابل دل یا درون دل نگاہ داشتن برائے دفع خواطر اثرے دارد و ہمین تصور صورت شیخ را ذکر رابطہ می گویند۔

"اور خیالات دور کرنے کے لئے بارگاہ الٰہی میں عاجزی وزاری کرے اور جس بزرگ سے ذکر کی تلقین حاصل کی ہے دل کے اندر یا دل کے مقابل اسی کی صورت کا تصور و خیال کرنا وساوس اور خیالات کے ختم کرنے میں پورا پورا اثر رکھتا ہے اور اسی تصور شیخ کو ذکر رابطہ کہا جاتا ہے۔"[1]

اسی کتاب کے ص ۱۵، ۱۴ پر فرمایا:

شغل سوم ذکر رابطہ است و آن عبارت از نگاہ داشتن صورت شیخ است در مدرکہ خود یا درون دل خود یا صورت خود را صورت شیخ تصور می نماید و چوں رابطہ غالب می آید در ہر چیزے صورت شیخ بنظری در آید این را فنافی الشیخ میگویند، و این احوال بریں تباہ حال نیز در ابتداء ورود یافتہ بود، کہ از عرش تا ثریٰ صورت حضرت شیخ خود محیط می یافتم، و جمیع حرکات و سکنات خود را حرکات و سکنات آنحضرت می دیدم، بیت ور و دیوار چوں آئینہ شد از کثرت شوق ہر کجا می نگرم روئے ترا می بینم دانست کہ طریقہ رابطہ اقرب طرق است و منشاء ظہور عجائب و غرائب است، حضرت ایشان عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمودہ اند کہ ذکر تنہا بے رابطہ و بے فنافی الشیخ موصل نیست و رابطہ تنہا برعایت آداب صحبت کافی است۔

"تیسرا شغل ذکر رابطہ ہے اور اس کی چند صورتیں ہیں۔ (۱) اپنے شیخ کی شکل و صورت کو اپنے ذہن میں رکھنا۔ (۲) ان کی صورت کو اپنے دل کے اندر محفوظ کرنا، (۳) اپنی صورت کو شیخ کی صورت خیال کرنا، شیخ کا رابطہ جب مرید پر غالب آجاتا ہے تو اس کو ہر چیز میں اپنے شیخ کی صورت نظر آتی ہے اور اسی کو فنافی الشیخ کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام حالات اس تباہ حال (حضرت مئولف قدس سرہ) پر بھی ابتداء میں وارد ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ عرش سے لے کر فرش تک اپنے پیر کی صورت کو محیط (گھیراؤ کرتے ہوئے) پایا اور اپنی جملہ حرکات و سکنات کو اپنے شیخ کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔

---

[1] (هداية الطالبين ص ۹)

تمام در و دیوار شوق کے مارے آئینہ کی مانند معلوم ہونے لگے اب جدھر دیکھتا ہوں آپ کے چہرہ انور کو دیکھتا ہوں جاننا چاہئے کہ طریقت میں رابطہ کا راستہ دوسرے تمام راستوں کی نسبت زیادہ قریب راستہ ہے۔ اس کے علاوہ عجیب و غریب امور کے ظہور کا ذریعہ بھی ہے۔ عروۃ الوثقی حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ رابطہ اور فنافی الشیخ کے بغیر خالی ذکر منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا، جبکہ آداب کی صحبت کی رعایت کے ساتھ خالی رابطہ بھی کافی ہو جاتا ہے۔"

گو وصول الی اللہ کے لئے کثرت نوافل، کثرت صوم و صلوۃ، ریاضت و مجاہدات، شب بیداری وغیرہ بھی عمدہ وسائل و ذرائع ہیں مگر ان سب سے زیادہ سہل، آسان اور زود اثر طریقہ رابطہ شیخ ہے۔

مکتوبات حضرت خواجہ محمد عثمان دامانی قدس سرہ میں ہے۔ رابطہ موصل تر برائے آن ست کہ بر بزرگ نالہ فیض جاری است ہر گاہ بأو رابطہ حاصل شود ضرور از ان نالہ فیض بہرہ مند می شود (یعنی رابطہ دوسری چیزوں سے زیادہ وصول الی اللہ میں کار آمد اسلئے ہے کہ بزرگ (مرشد کامل) پر بارگاہ الٰہی سے فیض کا پرنالہ جاری رہتا ہے اس لئے اس کے ساتھ رابطہ حاصل ہوتے ہی ضرور مرید بھی اس پرنالہ سے فیض یاب ہو گا۔

مشہور محدث وولی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قالوا والرکن الاعظم ربط القلب بالشیخ علی وصف المحبۃ و التعظیم و الملاحظۃ صورتہ۔[1]

یعنی مشائخ چشت قدس اللہ اسرارھم العلیہ نے فرمایا ہے کہ (سلوک کا) بڑا رکن محبت اور تعظیم کے ساتھ اپنے مرشد سے دل لگانا اور اس کی صورت کا ملاحظہ کرنا ہے۔

چوں خلیل آمد خیال یار من ۔۔۔ صورتش بت معنی او بت شکن

شیخ محقق حضرت قبلہ محمد عبد اللہ الخافی الخالدی نقشبندی قدس سرہ نے طریق وصول الی اللہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

الثانیۃ الرابطۃ و ھی طریقۃ مستقلۃ للوصول وعبارۃ عن ربط القلب با لشیخ الواصل الی مقام المشاھدۃ المتحقق بالصفات الذاتیۃ و حفظ صورتہ فی الخیال و لو بغیبتہ فرؤیتہ بمقتضیٰ الذین اذا رؤوا ذکر اللہ تحصل بھا الفائدۃ کما تحصل من الذکر بموجب ھم جلساء اللہ۔

"وصول الی اللہ کا دوسرا طریقہ رابطہ ہے۔ وصول الی اللہ کے لئے یہ مستقل طریقہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کامل سے دل کا رابطہ پیدا کیا جائے جو مقام مشاہدہ پر فائز اور صفات ذاتیہ سے متصف ہے اس کی صورت کو خیال میں محفوظ رکھے اگرچہ وہ غائب ہو اس لئے کہ حدیث شریف "اولیاء اللہ وہ ہیں جن کے دیکھنے سے اللہ یاد آجائے" کے مطابق ان کے دیکھنے سے بھی

---

[1] (القول الجمیل مترجم ص ۶۸)

فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہمنشین ہوتے ہیں۔"[1]

قدوۃ السالکین حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی مجددی دہلوی قدس سرہ نے سبع اسرار میں ذکر نفی اثبات کے شرائط تحریر کرتے ہوئے فرمایا: "چھٹی شرط رابطہ ہے یعنی تصور صورت پیر و مرشد کا دل میں یا مقابل دل کے یا اپنی ذات کو پیر و مرشد تصور کرنا۔"[2]

حضرت علامہ مولانا مقیم الدین دامانی قدس سرہ تحفۃ العلماء کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

الثالث الرابطة وهی تصور صورة الشیخ فی العقل او القلب و اذا الرابطة یتصور للسالک صورة الشیخ فی کل شیء و هی المعبر بالفناء فی الشیخ و اعلم ان افضل الاسباب و الارفق و الاوفق هی الرابطة و الملازمة و لذا صار طریقة النقشبندیة افضل لانها ینتهی الی الصدیق رضی الله عنه و هو ملازم مع علیه السلام و قوی فی الرابطة و کان رفیقه فی کل حال و جهه اتم من سائر الناس و لذا قال علیه السلام ما فضل ابو بکر بکثرة الصیام و الصلواة و لکن بسر و قر فی قلبه فلهذا صار بدایة النقشبندیة نهایة غیرها من الطرق لان السالکین فی طرق غیرها اذا تحملوا المشقات و الریاضات و المجاهدات حصل لهم الذکر فی القلب و الجذب و الانوار فکان هذا الحال عندهم عزیزاً و هذا الحال یحصل بتوفیق الله تعالیٰ فی اول التوجه و اخذ الذکر فکان بدایتهم نهایة الاخرین۔

ترجمہ: "تیسری قسم رابطہ ہے اور رابطہ دل یا عقل میں شیخ کی صورت کے تصور و خیال کو کہتے ہیں اور رابطہ کی بدولت سالک کو ہر چیز میں شیخ کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اسی کو فنا فی الشیخ کہتے ہیں اور جان لو کہ (وصول الی اللہ کے) اسباب میں سے بہتر اور آسان اور سالک کے مزاج کے زیادہ موافق طریقہ شیخ کا رابطہ اور پابندی صحبت ہے، یہی وجہ ہے کہ طریقہ عالیہ نقشبندیہ دوسرے تمام طریقوں سے افضل ہے (کہ اسی میں تصور شیخ کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے) کہ یہ سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے جو کہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے اور نسبت رابطہ میں بہت قوی تھے۔ ہر حال میں رسول اللہ ﷺ کے رفیق تھے اور محبت رسول ﷺ کے معاملہ میں دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زیادہ کامل تھے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابو بکر کی فضیلت زیادہ روزہ رکھنے اور زیادہ نماز پڑھنے کی وجہ سے نہیں ہے لیکن ایک بھید کی وجہ سے ہے جو ان کے دل میں قرار پکڑے ہوئے ہے۔"

---

1 (البهجة السنیة ص ۴۲ مطبوعه استنبول)

2 (سبع اسرار، ص ۱۷)

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ نقشبندیہ کی ابتداوہاں سے ہوتی ہے جہاں دوسروں کی انتہاء ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دوسرے طریقوں کے سالکین جب محنتیں مشقتیں برداشت کرتے ہیں تب ان کے دل میں ذکر، جذبہ اور انوار الٰہی حاصل ہوتے ہیں جن کی بناپر وہ حالت ان کو عزیز ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے نقشبندی حضرات کو پہلی توجہ اور ذکر حاصل کرتے ہی یہ حالت حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان کی ابتداء دوسروں کی انتہا سے ہوتی ہے۔[1]

ربط وعقیدت

مشہور ومعروف عارف باللہ حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ المنیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مرید را باید کہ ربط قلب باپیر بود و معنی ربط قلب این است کہ بداند کہ مرا بخدائے تعالیٰ نرساند مگر پیر من "الشیخ فی قومه کالنبی فی امته" اشارہ در حق ایشاں ست و ہر چہ پیر بفرماید ازاں تجاوز نہ کند اگرچہ ہزاراں ہم عصر بہ آں جا باشند و دراں وقت دیگراں ہم پیراں و مرشداں باشند گویند گر مرید بداند کہ بہتر از پیر من دیگرے ہست در کار مریدی درست نیاید و غرض او حاصل نہ شود۔

"مرید کو چاہئے کہ اپنے پیر سے ربط قلب قائم کرے، ربط قلب کا مطلب یہ ہے کہ مرید یہ سمجھے کہ مجھے اپنا پیر ہی خدا تعالیٰ سے ملائے گا کوئی دوسرا نہیں۔" پیر اپنے متعلقین کو اس طرح فیض وفائدہ پہنچاتا ہے جس طرح نبی اپنی امت کو فائدہ پہنچاتا ہے" کہنے میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مرید کو چاہئے کہ جو کچھ پیر حکم کرے اسی پر عمل پیرا رہے اس سے آگے نہ بڑھے اگرچہ ان کے ہم عصر اور بھی موجود ہوں اور اس وقت میں دوسرے پیر ومرشد بھی ہوں۔ لیکن اگر (خدانخواستہ) مرید یہ سمجھے کہ میرے پیر سے بڑھ کر کامل کوئی اور ہے تو ابھی یہ مریدی کی راہ میں کچا ہے اور اس کو (یہ عقیدہ رکھتے ہوئے) کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا۔[2]

نماز میں تصور ورابطہ شیخ:

نماز میں رابطہ شیخ کے جواز وعدم جواز کے بارے میں مولانا نور الدین تاشقندی رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ خلیفہ تھے حضرت عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے) اور مولانا زادہ فرکتی رحمۃ اللہ علیہ کا باہمی اختلاف تھا۔ مولانا نور الدین تاشقندی رابطہ شیخ میں مستغرق اور مغلوب الحال رہا کرتے تھے جبکہ مولانا زادہ فرکتی اس قسم کے رابطہ کے مخالف تھے اور معلوم ہونے پر حضرت

---

[1] (رسالہ فنافی الشیخ ص ۵۷،۵۸)
[2] (لطائف المعانی ص ۴ ملفوظات حضرت منیری قدس سرہ)

تاشقندی قدس سرہ کو سختی سے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر نماز میں اس طریقہ پر مشغول رہو گے تو کافر ہو جاؤ گے (العیاذ باللہ) لہٰذا آئندہ ہرگز ہرگز نماز میں اس طریقہ کی مشغولی اختیار نہ کرنا وغیرہ۔

الغرض جب مذکورہ ماجرا حضرت احرار نقشبندی نور اللہ مرقدہ کو معلوم ہوا تو مولانازادہ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا،

"شخصے را در نماز دل بہ املاک و اسباب وعبید و زبل و مواشی وانبار و سائر اشیاء خسیسہ می رود کافر نیست، اگر مؤمنے را دل بمؤمنے مرتبط باشد چرا مؤدی بکفری شود؟

یعنی نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں مال اسباب غلاموں جانوروں بلکہ ان کے گوبریادوسری چیزوں کا خیال آجاتا ہے پھر بھی کافر نہیں ہوتا۔ تو اگر کسی مؤمن کے دل کا تعلق دوسرے مومن سے ہو جائے تو وہ کیونکر کافر ہو سکتا ہے۔[1]

مرءۃ العاشقین ملفوظات حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد عظیم صاحب ساکنہ کنگال نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر نماز میں تصور شیخ حاصل ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ سن کر ارشاد فرمایا جائزاست کہ پیش امام تصور دہ سجدہ کند۔

یعنی اس کو چاہیئے کہ شیخ کو پیش امام تصور کر کے سجدہ کرلے (پیش امام کی قید اسلیئے بڑھائی کہ سجدہ کی حقیقت واضح ہو کہ شیخ کتناہی باکمال کیوں نہ ہو لیکن وہ سجدہ کے قابل نہیں، سجدہ اسی واحد، احد ذات کو لائق وروا ہے اور بس)۔[2]

حدیث عشق ز حافظ شنو نہ از واعظ　　　اگرچہ صنعت بسیار در عبادت کرد

سند الاولیاء والاصفیاء حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نقشبندی سرہندی نور اللہ مرقدہ نے حضرت خواجہ محمد اشرف صاحب اور حاجی محمد فرکتی رحمۃ اللہ علیہما کے ایک خط کے جواب میں رابطہ شیخ کے موضوع پر مفصل وعمدہ جواب تحریر فرمایا۔ تبرکاً بلفظہ ذکر کیا جاتا ہے:

"خواجہ محمد اشرف ورزش نسبتہ رابطہ رانوشتہ بودند کہ بحدے استیلا یافتہ است کہ در صلوٰۃ آنرا مسجود خود میدانند ومی بینند واگر فرضاً نفی میکنند منتفی نمی گردد۔ محبت اطوار ایں دولت متمنائے طلاب است از ہزاراں یکے را مگر بدہند صاحب ایں معاملہ مستعد تام المناسبت است یتحمل کہ باندک صحبت شیخ مقتدیٰ جمیع کمالات اور اجذب نماید رابطہ راچرا نفی کنند کہ او مسجود الیہ است نہ مسجود لہ چرا محاریب ومساجد را نفی نہ کنند، ظہور ایں قسم دولت سعادتمنداں را میسر است

[1] (فنافی الشیخ ص ۶۵)
[2] (فنافی الشیخ ص ۶۳)

تادر جمیع احوال صاحب رابطہ را متوسط خود دانند و در جمیع اوقات متوجہ او باشند، نہ در رنگ جماعۃ بیدولت کہ خود را مستغنی دانند و قبلۂ توجہ را از شیخ خود منحرف سازند و معاملہ خود را برہم زنند۔

ترجمہ: ''خواجہ محمد اشرف نے رابطہ کی ورزش کے متعلق لکھا تھا کہ رابطہ کا اس قدر غلبہ ہے کہ نماز میں اس کو (مرشد کو) مسجود سمجھتا اور دیکھتا ہوں اگر بالفرض اس (تصور کو) ہٹانا چاہوں تو بھی نہیں ہٹتا۔ اے محبت کے متوالے یہ دولت تو سلوک کے طالبوں کی تمنا کی ہوئی چیز ہے (اسے وہ بہت محبوب رکھتے ہیں) ہزاروں میں سے کسی ایک کو سہی مگر دیتے ضرور ہیں۔ جس کو یہ کیفیت حاصل ہو وہ صاحب استعداد اور مرشد سے کامل مناسبت والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیخ کامل کی مختصر سی صحبت سے ہی ان کے جملہ کمالات حاصل کر لے رابطہ کی نفی کیوں کرتے ہو؟ وہ (مرشد) مسجود الیہ یعنی جہت سجدہ ہیں، مسجود لہ (جسے سجدہ کیا جائے) نہیں ہیں (اور اگر کسی چیز کی طرف منہ کرنا ہی شرک ہے تو) محرابوں اور مسجدوں کو آگے سے کیوں نہیں ہٹاتے؟ اس قسم کی دولت نیک بختوں کو نصیب ہوتی ہے تا کہ وہ ہر حال میں صاحب رابطہ یعنی شیخ مقتدیٰ کو واسطہ (قرب الٰہی کا) سمجھ کر ہر وقت اس کی طرف متوجہ رہیں۔ ان بد نصیبوں کی جماعت کے رنگ میں نہ ہونا چاہیئے جو اپنے آپ کو (شیخ کی نسبت سے) بے پرواہ سمجھتے ہیں اور قبلہ توجہ کو شیخ کی جانب سے پھیر لیتے ہیں اور نتیجتاً اپنا معاملہ برباد کر بیٹھتے ہیں۔''[1]

نیز اسی مکتوب میں مولانا حاجی محمد صاحب کے اوراد و وظائف میں کوتاہی ہونے کے جواب میں تحریر فرمایا:

مولانا حاجی محمد اظہار نمودہ بودند کہ قریب دو ماہ است کہ فتورے در مشغولی رفتہ است و آں ذوق و حلاوت کہ سابقا داشت نماندہ۔ مودت اطوار اغم نیست اگر در دو چیز فتورے نرفتہ باشد یکے ازاں دو چیز متابعت صاحب شریعت است علیہ و علی الہ الصلوات والتسلیمات والتحیات دویم محبت و اخلاص است بشیخ خود۔ با ثبوت ایں دو چیز اگر ہزاراں ظلمات و کدورات طاری شود باک ندارد آخر او را ضائع نخواہند گزاشت، اگر عیاذا باللہ سبحانہ یکے ازیں دو چیز نقصان پیدا کرد خرابی در خرابی است اگرچہ بحضور و جمعیت باشد کہ آں استدراج ست کہ عاقبت خرابی دارد واز حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ بتضرع و زاری ثبات ایں دو امر خواہند و استقامت بریں دو مسألت نمایند فانہما ملاک الامر و مدار النجاۃ والسلام علیکم۔

[1] (از مکتوبات حضرت امام ربانی قدس سرہ، مکتوب نمبر ۳۰، دفتر دوم حصہ ششم ص ۶۸،۶۷)

ترجمہ: مولانا حاجی محمد صاحب نے دوماہ سے مشغولی میں سستی اور سابقہ لذت و سرور نہ ہونے کا اظہار کیا ہے۔ اے محبت کے متوالے کوئی فکر نہ کر اگر دو چیزوں میں خلل واقعہ نہیں ہوا، ایک صاحب شریعت یعنی رسول اللہ ﷺ کی تابعداری دوم اپنے شیخ سے محبت اور اخلاص۔ ان دو چیزوں کے مضبوط ہوتے ہوئے اگر ہزاروں تاریکیاں اور اندھیریاں در پیش ہوں تو بھی پرواہ نہ کر بالآخر اسے ضائع ہونے نہیں دیں گے۔ لیکن اگر، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے، ان دو میں سے کسی ایک میں فتور واقع ہو جائے تو تباہی در تباہی ہے خواہ بظاہر قلبی تسکین اور حضور حاصل ہو۔ اس لئے کہ یہ استدراج ہے جس کا نتیجہ نقصان ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا بار گاہ خداوندی میں عجز وزاری کے ساتھ ان دو چیزوں کی مضبوطی طلب کرو اور ان ہی دو چیزوں کی مضبوطی طلب کرو اور ان ہی دو چیزوں پر استقامت کا سوال کرو۔ اس لئے کہ امر طریقت کا مدار نیز نجات کا مدار ان دو چیزوں پر ہے۔

عن الحسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال سئلت خالی ھند بن ابی ھالۃ و کان و صافًا من حلیۃ النبی ﷺ و انا اشتھی ان یصف لی منھا شیئًا اتعلّق بہ۔

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابوہالہ سے سوال کیا۔ اور وہ نبی ﷺ کا حلیہ بیان کرتے تھے اور میں مشتاق تھا کہ وہ میرے لئے اس میں سے کچھ بیان کریں تا کہ میں اس کو اپنے خیال میں محفوظ کر لوں۔

ملا علی قاری نے **جمع الوسائل فی شرح الشمائل** میں حدیث مذکور کے تحت فرمایا:

ای اتثبت بذالک الوصف و اجعلہ محفوظا فی خزانۃ خیالی و انما قال الحسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذالک لان النبی ﷺ توفی و ھو فی سن لا یقتضی التامل فی الاشیاء و تحفظ الاشکال و الاعضاء۔

یعنی میں اس وصف کو مضبوطی کے ساتھ ذہن نشین کر کے اپنے خزانہ خیال میں محفوظ کر لوں اور حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اس لئے فرمایا کہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت وہ اتنی (چھوٹی) عمر کے تھے کہ اشیاء میں غور کرنے اور شکلوں اور اعضاء کو یاد رکھنے کے قابل نہیں تھے۔[1]

حدیث مذکورہ کی تصریح ملا علی قاری سے اظہر من الشمس واضح ہو گیا کہ تصور شیخ یعنی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی صورت مبارکہ کو خزانہ خیال میں محفوظ رکھنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا معمول تھا جو اس وقت سے آج تک حضرات صوفیاء کرام کا معمول ہے۔

---

[1] (مخزن المعارف)

اس حدیث پاک کے بارے میں شیخ الدلائل حضرت مولانا عبد الحق مہاجر مدنی علیہ الرحمۃ کا بیان سنئے وہ راوی ہیں:

ایک دن مولانا شاہ عبد الغنی نقشبندی قدس سرہ کے درس حدیث میں مسجد نبوی میں حاضر تھا۔ جس وقت قاری نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت مولانا موصوف نے فرمایا یہ حدیث تصور شیخ کی دلیل ہے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ تعلق یہی تصور ہے۔[1]

اس کے علاوہ اور بھی بکثرت احادیث اس مضمون کی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نبی کریم ﷺ کی صورت مقدسہ کا خیال جماتے تھے۔

چنانچہ سینکڑوں حدیثوں میں موجود ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم روایت کے وقت یہ فرمایا کرتے تھے کہ **کانی انظر الی رسول اللہ** ﷺ یعنی گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں رسول اللہ ﷺ کو۔ یہ سب تصور شیخ نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر افسوس صد افسوس ان کج فہم ملاؤں پر جو بلا دلیل صوفیاء کرام پر کفر و شرک اور بدعت کے فتوے لگاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ روزانہ طوطے کی طرح وہ ان احادیث کی تلاوت بھی کرتے رہتے ہیں مگر پھر بھی انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

بالکل سچ فرمایا قرآن کریم نے کہ:

لاتعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

یعنی ان (منکروں) کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں، لیکن ان کے سینوں میں دل اندھے ہو گئے ہیں۔

علامہ شہاب الدین خفاجی علیہ الرحمہ نے نسیم الریاض میں فرمایا:

یفرض ذالک ویتمثلہ فکانہ عندہ۔

ترجمہ: "روضہ منورہ کے حاضری کے وقت یہ فرض و ملاحظہ کرے کہ یہ میں حضوری میں ہوں اور صورت مقدسہ کا ایسا تصور جمائے کہ گویا حضور ﷺ اس کے پاس جلوہ فرما ہیں۔"

عالمگیری میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ تحریر ہے کہ:

یقف کما یقف فی الصلوۃ ویمثل صورتہ الکریمۃ البھیۃ کانہ نائم فی لحدہ عالم بہ یسمع کلامہ۔

(روضہ مبارکہ کے سامنے) اس طرح کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی پُر نور صورت کریمہ کا تصور باندھے کہ گویا آپ قبر میں آرام فرما ہیں۔ اور اس کو جانتے اور اس کا کلام سنتے ہیں۔

---

[1] (مخزن المعارف)

اسی طرح علامہ احمد بن محمد مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

ویمثل الزائر وجهه الکریم علیهم الصلوٰة والسلام فی ذهنه ویحضر قلبه جلال رتبته وعلو منزلتهٖ وعظیم حرمته۔

زیارت کرنے والا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے چہرہ مبارک کا تصور کرے اور دل میں آپ کے مرتبہ کی بزرگی اور قدر کی بلندی اور احترام عظیم کا خیال جمائے۔

یہ وہ چند دلائل و شواہد ہیں جن سے تصور شیخ کا ثبوت آفتاب عالمتاب کی طرح جگمگارہا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ:

گر نبیند بروز شپرہ چشم　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ[1]

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بیعت ہونا سنت ہے اور اس میں تحقیق شاہ عبد الرحیم صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی ہے اور رسالہ ارشاد الطالبین میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم باطن فرض ہے اور طلب طریقت واجب ہے اور بیعت ہونا سنت ہے۔ اور اکثر ہزارہا علماء و صلحاء نے سلسلہ طریقت میں بیعت کی ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی، جو کہ ہندوستان میں علم حدیث کے مرکز ہیں، علم طریقت میں بیعت ہیں اور علم طریقت میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور جس طرح علم شریعت کی سند یکے بعد دیگرے رسول اللہ ﷺ تک پہنچائی ہے اسی طریقہ سے علم طریقت کی سند بھی عن فلاں عن فلاں تا آنجناب نبی کریم ﷺ پہنچاتے ہیں۔

[1] (بحوالہ اثبات البیعت مصنفہ غوث الزمان و قطب دوران شیخ المشائخ حضرت سراج الحق صاحب المعروف بہ باباجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ والد محترم شیخ المشائخ حضرت مولانا عبد الاکبر صاحب عرف لالاجی صاحب مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)